انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) کا ماہانہ معاشی رسالہ

اڈیٹر

طفیل احمد خاں، ایم اے

"ہماری زبان"

انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی کا پندرہ روزہ اخبار

ہر ماہ کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہی

سالانہ چندہ دو رُپے۔ قیمت فی پرچہ دو آنے

ہندستان بھر میں اُردو سے متعلق تمام واقعات اور خبریں، اُردو کے دوستوں کی کارروائیاں اور اُردو کے دُشمنوں کی ریشہ دوانیاں سب بہ یک وقت اس اخبار میں مل جاتی ہیں۔ ہر اس شخص کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہی جسے اُردو کی ترقّی اور ترویج سے دلچسپی ہی۔

ملنے کا پتا:۔

دفتر "ہماری زبان"۔ نمبرا دریاگنج دہلی

جلد ۲ جنوری سنہ ۱۹۴۷ء نمبر ۱

فہرستِ مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱ -	حقِ خود ارادیت	اداریہ	۲
۲ -	روپے کی بیرونی قیمت	[illegible]	۶
۳ -	ہندستان میں زراعت کی خامیاں	[illegible]	۱۵
۴ -	سوویٹ نظام میں موثر [illegible]	ادارہ	۲۱
۵ -	زرعی سرمایہ داری	چودھری [illegible] جنگ	۲۶
۶ -	کپڑے کی قلت	[illegible] چودھری	۳۵
۷ -	معاشی صورتِ حال	ادارہ	۴۰
۸ -	تبصرے	"	۴۵
۹ -	اشتہارات		۴۷، ۴۸

اداریہ

حقِ خود ارادیت

از:— — — اڈیٹر

۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو دہلی یونی ورسٹی ہال میں کُل ہند پولیٹیکل سائنس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے ڈھاکہ یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈی۔ این۔ بینرجی نے حقِ خود ارادیت کے موضوع پر چند اہم خیالات کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں ہندستان کی سیاست پر بھی کچھ روشنی ڈالی۔ یہ بالکل لازمی اور فطری بات تھی کہ فاضل مقرر کے ذہن پر ہندستان اور خاص کر بنگال کی موجودہ سیاسی فضا کے اثرات چھائے ہوئے تھے اس لیے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ایسے علمی موضوع پر ایک عالِم کی تقریر میں بھی سیاسی اختلاف، جماعت بندی اور پروپگنڈے کے کچھ نہ کچھ عناصر ضرور موجود ہیں۔ لیکن ان عناصر سے قطع نظر پروفیسر صاحب نے سیاسی نظریے اور سیاسی عمل کے بارے میں چند ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو ہماری توجہ کے مستحق ہیں اور جن سے اختلافِ رائے کی گنجایش پیدا ہوتی ہے۔

پروفیسر صاحب کی پوری تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ ہنگامے نتیجہ ہیں مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کا۔ اور یہ مطالبہ بجائے خود صدر ولسن کے حقِ خود ارادیت کے نظریے کی غلط سوجھ بوجھ سے پیدا ہوا ہے۔ اس دوسری بات پر پروفیسر صاحب اس قدر دور چلے جاتے ہیں کہ آخر میں تقریباً وہ حقِ خود ارادیت ہی کے صحیح اور منصفانہ ہونے سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور کنیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مثالیں پیش کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ نظریہ محض ہوائی ہے اور اس کا تسلیم کیا جانا ہی اچھا ہے۔ پھر اس کے خلاف دو باتیں پیش کرتے ہیں (۱) یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ کس علاقے کو یا کتنے

علاقے کو حقِ خود ارادیت عطا کیا جائے۔ (۲) دوسرے اگر عطا کر بھی دیا جائے تو پھر عوام کی جہالت اور دیگر اسباب اور مشکلات کے باعث عام رائے دہندگی سے جو فیصلہ ہوگا وہ غلط ہوگا۔ پھر وہ سوویت وفاق کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہاں یاستوں کو جو حقِ علاحدگی حاصل ہو وہ محض برائے نام اور کاغذی ہو عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ آخر میں وہ کہتے ہیں کہ ہاں سوویت وفاق میں علاقائی اور تہذیبی خود مختاری ضرور حاصل ہو اور اگر حقِ خود ارادیت کا یہی مطلب ہو تو ہم بھی اُسے تسلیم کرتے ہیں اور ہندستان میں بھی اُس کے قیام کے حامی ہیں۔

ہمارا خیال ہو کہ موجودہ فسادات اور فرقہ وارانہ کشیدگی صرف مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کا نتیجہ نہیں ہو بلکہ اس بات کا بھی کہ کانگرس علاقائی اور تہذیبی بنیاد پر حقِ خود ارادیت اور علاحدگی کے جائز حق کو ماننے سے انکار کر رہی ہو۔ لیکن فسادات کی سب سے بڑی وجہ برطانوی وفد کا پیش کردہ دستوری منصوبہ ہو جس کو دیکھے بغیر امن و سکون کی طرف ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے سے بھی انکار ہو کہ مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کا صدر ولسن کے نظریۂ حقِ خود ارادیت سے کوئی تعلق ہو۔ صدر ولسن کے نظریے کی بنیاد علاقے پر تھی اور پاکستان کے مطالبے کی بنیاد مذہبی فرقہ داریت پر ہو، اوّل الذکر بنیاد بالکل صحیح اور منصفانہ ہو، موخر الذکر بنیاد محض سیاسی پروپگنڈا اور اپنی کیس کو مضبوط اور طاقت ور بنانے کے لیے کھڑی کی گئی ہو۔

پروفیسر موصوف کے ذہن میں "علاقہ" اور "مذہبی فرقہ" سے متعلق اُلجھاؤ ٹھہرا ہوا ہو اسی لیے وہ پاکستان کی فرقہ وارانہ بنیاد کی مذمت کرتے کرتے بے چارے ولسن کے نظریۂ حقِ خود ارادیت کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑ جاتے ہیں۔ حال آں کہ اگر پروفیسر صاحب ذرا صفائی اور وضاحت سے کام لے کر سمجھنے کی کوشش کرتے تو صدر ولسن کے حقِ خود ارادیت کو بنیاد بنا کر پاکستان کی وہ زیادہ اچھی اور زیادہ مخالفت کر سکتے تھے۔ مگر بات اصل تو یہ ہو کہ وہ تمام کانگرسی لیڈروں کی طرح ایک کل ہند ریاست اور کل ہند حکومت کے چکر میں گرفتار ہیں چاہے وہ زبردستی ہی کیوں نہ قائم کی جائے۔ انھیں سیاسی علاحدگی کسی صورت سے بھی پسند نہیں، چاہے وہ نامنصفانہ بنیاد پر ہو یا منصفانہ بنیاد پر، چاہے وہ مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد پہ ہو یا تہذیبی اور قومی علاقے کی بنیاد پر۔ اسی وجہ سے انھوں نے مسلم لیگ کے پاکستان کی مخالفت کا موقع مناسب دیکھ کر صدر ولسن کے نظریۂ خود ارادیت کی بھی حجامت کر ڈالی ہو۔ ایک ہی ہاتھ میں دونوں کا صفایا کیا ہو تاکہ علاحدگی بالکل ہی مہمل اور بے کار نظر آنے لگے۔ یہ دلیل انھیں سوائے اس کے اور کس نتیجے پر پہنچا سکتی تھی کہ حقِ خود ارادیت کا نہ تسلیم کیا جانا ہی اچھا ہو؟ جب سیاسی نظریوں کو توڑ مروڑ کر نامنصفانہ سیاسی مقاصد کا پابند کر دیا جاتا ہو تو انسان کے دماغ کی یہی گت بنتی ہو۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں نے سیاست کے ایک عالم کو صاف اور کھلے طور پر "قومی حقِ خود ارادیت" کی مخالفت کرتے ہوئے پایا۔ کیا ہندستان فاشزم سے قریب آگیا ہو؟

پروفیسر صاحب نے اس بات کا بہت ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کی ہے کہ صدر ولسن کا حقِ خود ارادیت کا اصول ناکام یاب رہا، ہمیں یہ تسلیم ہے لیکن کاش وہ یہ بھی بتانے کی کوشش کرتے کہ کیوں ناکام یاب رہا؟ اور اس کی ذمّے داری خود اصول پر عائد ہوتی ہے یا برطانیہ اور فرانس کے سامراجی مقاصد پر جو بہ جائے خود اُن ملکوں کے سرمایے دارانہ اور سامراجی نظام کی پیداوار ہیں؟ کیا سامراج اور سرمایے داری کا خاتمہ کیے بغیر ایک قوم پر دوسری قوم کے مظالم اور جبر، قومی تصادم اور قومی جدوجہد کو ختم کیا جا سکتا ہے اور قومی حقِ خود ارادیت پر عمل ہو سکتا ہے؟ کیا حقِ خود ارادیت پر روسی وفاق میں عمل نہیں ہوا ہے؟ لیکن یہاں پر تو پروفیسر صاحب کو اس بات سے صاف انکار ہے کہ سوویت وفاق میں حقِ خود ارادیت سیاسی معنوں میں موجود ہے۔ انھوں نے ایک چالاک پروپگنڈے باز کی طرح بس اتنا بتانے پر اکتفا کیا ہے کہ وہاں اس وقت کوئی ریاست سیاسی طور پر علاحدہ نہیں ہے اور ریاستوں کو صرف تہذیبی خود مختاری حاصل ہے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ ایسا کیوں ہے اور کس سیاسی راستے پر چل کر سوویت وفاق موجودہ اتحاد اور ہم آہنگی حاصل کر سکا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ انقلاب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں ہی اس بات کا صاف صاف اعلان کر دیا گیا تھا کہ ہر قومی علاقہ قطعی خود مختار اور آزاد ہے اور اگر وہ چاہے تو وفاق میں شامل ہو چاہے نہ ہو؟ کیا ان قومی علاقوں کے مزدوروں اور کسانوں نے اپنی جماعت اور سیاسی تحریک کے ذریعے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ایک اشتراکی سماج کی تعمیر کے لیے اور دُنیا کی سرمایہ دار اور سامراجی طاقتوں کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے ہم وفاق میں شامل ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس وقت سفید روس اور یوکرین کے امورِ خارجی کے اپنے علاحدہ اور آزاد دفاتر ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس وقت سوویت وفاق کی جو ریاست بھی چاہے علاحدگی اختیار کر سکتی ہے اور اُسے دنیا کی کوئی طاقت بھی زبردستی شامل رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی؟

علاقائی بنیاد پر قومی خود ارادیت اور علاحدگی کی مخالفت کرتے ہوئے پروفیسر موصوف یہ کہتے ہیں کہ یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ کس یا کتنے علاقے کو یہ حق عطا کیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے اگر پروفیسر صاحب (جیسا کہ خود انھوں نے اعلان کیا ہے) تہذیبی علاقوں کا تعین کر سکتے ہیں اور انھیں تہذیبی خود مختاری بھی دے سکتے ہیں تو انھیں تہذیبی علاقوں کو سیاسی علاحدگی کا حق دینے سے کون سا امر مانع ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بنگال کے تمام ہندو اور مسلمان ایک قومی اور تہذیبی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں علاقائی بنیاد پر علاحدگی کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے؟ اسی طرح سندھ یا بلوچستان، یا سرحد یا پنجاب کے مختلف حصے (پورا پنجاب نہیں) قومی اور تہذیبی علاقوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں تہذیبی خود مختاری کے ساتھ مکمل سیاسی علاحدگی مانگنے کا بھی حق حاصل ہے۔ اسی طرح پورے ہندستان کو ہم برطانوی سامراج کی کھینچی ہوئی موجودہ مصنوعی قسم کی صوبائی سرحدوں کو توڑ کر مختلف تہذیبی اور لسانی علاقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اور ہر علاقے کو مکمل خود مختاری کا حق عطا کر سکتے ہیں چاہے وہاں ہندو بستے ہوں یا مسلمان یہ تو

علاحدگی کے اصول کو تسلیم کرنے کا مسئلہ ہوا جہاں تک واقعی اور عملی علاحدگی کا سوال ہے اس کے لیے یقیناً عام بالغ رائے دہندگی کا اصول ہی واحد منصفانہ اصول ہے لیکن اس کی مخالفت کرتے ہوئے پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ عوام جاہل اور ان پڑھ ہیں اس لیے یہ طریقہ فضول ہوگا۔ یہ ایک خالص فاشستانہ قسم کی دلیل ہے۔ یقیناً سیاسی علاحدگی کا حق منوانے کے لیے ہر کسی کے لیے سیاسیات کا پروفیسر ہونا ضروری نہیں ہے۔ جاہل اور ان پڑھ عوام کے اندر یقیناً اس بات کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے مفاد کے پیشِ نظر علاحدگی کے حق میں یا اس کے خلاف فیصلہ کریں۔ اگر برطانوی دولتِ مشترکہ سے نکلنے کے مطالبے پر برطانوی سامراج یہ کہے کہ ہندستان کے عوام جاہل اور ان پڑھ ہیں اس لیے اُن کی عام، و بالغ رائے دہندگی نہیں تسلیم کی جاسکتی تو پروفیسر موصوف کے پاس کیا جواب ہوگا؟ سیاسیات کے عالم سے اتنی لنگڑی دلیل سُن کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔

مسائل حاضرہ (ہندستان)

رُپے کی بیرونی قیمت

از: ——— ابوسالم، ایم۔ اے (علیگ)

ہندستان کے نظامِ زر کی تاریخ رُپے کی بیرونی قیمت کے ردّ و بدل اور ان کے متعلق طول طویل اور بیش تر اوقات تلخ بحثوں کی داستان ہی۔ ایک بار پھر یہ مسئلہ ملک کے سامنے ہے۔ اس مرتبہ اس کا فوری سبب ملک سے متعلق کوئی معاشی تغیّر و تبدّل نہیں بلکہ ایک فرض کی انجام دہی ہی جو ہندستان نے بین اقوامی مالی فنڈ میں شرکت کا فیصلہ کرکے اپنے ذمّے لے لیا ہی۔ یہ فنڈ دُنیا کے مختلف مُلکوں کی باہمی شرحِ مبادلہ کو مستحکم رکھنے کے لیے قائم ہوا ہی تاکہ بین اقوامی تجارت میں اس کے عدمِ استحکام کے بُرے نتائج سے ہماری حفاظت ہو سکے۔ یہ فنڈ اب اپنا کام شروع کرنے والا ہی اور اس کے دستور کے مطابق ہر ممبر ملک کے لیے ضروری ہی کہ اپنے سکّے کی بیرونی قیمت کی (سونے یا ڈالر کی شکل میں) بین اقوامی فنڈ کو اطّلاع کر دے۔ اس قانون کے مطابق ہندستان کو اپنے رُپے کی بیرونی قیمت کے متعلق فنڈ کو ۱۸ دسمبر ۱۹۴۶ء تک یہ اطّلاع بھیج دینا چاہیے کہ ہمارے رُپے کی قیمت اتنے سونے یا اتنے ڈالر کے برابر ہوگی۔ فنڈ کی اس دفعہ پر عمل کرنے سے پہلے حکومتِ ہند نے اس اہم مسئلے پر زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول عمل اختیار کرنے کی خاطر ملک کے مختلف بینکوں، ایوانِ تجارت، اور اس قسم کے دوسرے اداروں جو اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں مشورے مانگے ہیں۔ اس طرح آج کل یہ مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہی۔

لیکن اصل سوال پر بحث کرنے سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ لوگ اب بھی اس مسئلے پر بحث کرتے وقت یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہندستانی رُپے کا تعلق اسٹرلنگ کے ساتھ اسی طرح برقرار رہے گا جیسے اب تک تھا۔ چناں چہ حکومت کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ رُپے کی بیرونی قیمت کیا ہوگی ہمارے بعض صنعتی رہنماؤں نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ رُپے کو اسٹرلنگ کی گرفت سے آزاد کرا لیا جائے۔ اس غیر فطری تعلق کے خلاف جو تعصب ہے اس کے بہت اہم تاریخی اسباب ہیں۔ بارہا رُپے کی قیمت میں محض اس لیے ردّ و بدل کرنا پڑا ہے کہ اسٹرلنگ اور انگلستان کے مفاد نے اسٹرلنگ کی قیمت میں ردّ و بدل کو ضروری بنا دیا تھا۔ انگلستان کی معاشی زندگی ہندستان کی معاشی زندگی سے قطعی مختلف ہے۔ اور اس لیے یہ ضروری نہیں کہ جو طرزِ عمل اوّل الذکر کے لیے مناسب اور صحیح ہو وہی ہمارے لیے بھی ہو۔ بلکہ اکثر ہمارا مفاد ایک دوسرے سے بالکل متضاد رہا ہے اس لیے رُپے کو اسٹرلنگ کی گرفت سے آزاد کرنے کا مطالبہ صحیح ہے۔ لیکن اس وقت تو یہ سوال اُٹھانا بے محل اور غیر ضروری ہے۔ یہ محض پُرانی عادت کا نتیجہ ہے کہ ہم رُپے کی بیرونی قیمت کا ذکر اسٹرلنگ ہی کی شکل میں کرتے ہیں۔ رُپے کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس ہوگی یا ایک شلنگ چار پنس؟ ورنہ حقیقتاً تو بین اقوامی مالی فنڈ میں شرکت منظور کر کے ہم نے اس رشتے سے بڑی حد تک چھٹکارا حاصل کر لیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ہمیں رُپے کی شرحِ مبادلہ سونے یا ڈالر کی شکل میں متعین کرنی ہوگی اسی طرح انگلستان اسٹرلنگ کی قیمت ڈالر یا سونے کی شکل میں متعین کر کے فنڈ کو اطلاع دے گا۔ گویا اب رُپے کا تعلق ڈالر یا سونے کی کسی متعین مقدار سے براہِ راست ہوگا۔ اور چوں کہ انھی دونوں شکلوں میں آیندہ ہر سکے کی جن میں اسٹرلنگ بھی شامل ہے بیرونی قیمت کا اظہار ہوا کرے گا اس لیے اسٹرلنگ سے ہمارا رشتہ اب بالواسطہ اور ثانوی ہوگا۔ مالی فنڈ میں شرکت اور رُپے کی بیرونی قیمت ڈالر یا سونے کی شکل میں متعین کر دینے کے بعد ہمیں رزرو بینک کے قانون میں کچھ ترمیم کرنی پڑے گی۔ موجودہ قانون کی رُو سے بینک کا فرض ہے کہ اسٹرلنگ متعینہ قیمتوں پر خریدنے اور بیچنے کے لیے تیار رہے۔ برٹن ووڈز اسکیم کے ماتحت ایک ملک کے سکّے کو ہر دوسرے ملک کے سکّے کی شکل میں تبدیلی ضروری مانی گئی ہے۔ ایسی صورت میں رزرو بینک کو محض اسٹرلنگ ہی نہیں بلکہ متعینہ حدود کے اندر دوسرے ممالک کے سکّے اور سونا خریدنے اور بیچنے کے لئے بھی تیار رہنا پڑے گا۔

اب تک ہماری تمام بین اقوامی لین دین اسٹرلنگ کی شکل میں ہوتی تھی۔ اب اس کے برخلاف ہم ایک بین اقوامی فنڈ کے ذریعے یہ سب لین دین کریں گے۔ انگلستان نے بلاشبہ اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اس اسکیم میں شرکت کے بعد بھی اسے اسٹرلنگ حلقہ قائم رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن اگر اس اسکیم پر عمل درآمد بھی کیا گیا تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسٹرلنگ حلقہ اس کے تحت کیسے قائم رہ سکے گا۔ اور اگر رہا بھی تو اس کو وہ اہمیت کیوں کر حاصل ہو سکے گی جو اب تک تھی۔ یہ محض بے وقت کی راگنی ہوگی۔ ہمارے سامنے سرِ دست صرف یہ سوال ہے کہ ہم رُپے کو کس قیمت پر ڈالر یا سونے سے وابستہ کریں۔

اس نئے رشتے کا قیام خود اس بات کا متقاضی ہے کہ اسٹرلنگ کے ساتھ جو تعلق اب تک قائم تھا وہ توڑ دیا جائے تاکہ اس حیثیت سے روپیہ اب کسی اور ملک کی معاشی زندگی کے اُلٹ پھیر سے متاثر نہ ہو۔ ہمیں اب یہ موقع حاصل ہے کہ ہم روپے کی بیرونی قیمت کا تعین اور اس میں ردوبدل اپنے ملک کی معاشی ضرورتوں کی روشنی میں کر سکیں۔ لیکن ابھی کئی سال تک اسٹرلنگ کو ہمارے نظامِ زر میں خاصی اہمیت حاصل رہے گی۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انگلستان ہمارا مقروض ہے۔ اور ہمارا بہت بڑا اثاثہ اسٹرلنگ کی شکل میں محفوظ ہے۔

کسی سکے کی بیرونی قیمت کے سوال کی اہمیت زیادہ تر خارجی تجارت کے سلسلے میں ہی ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیرونی قیمت کا ردوبدل ملک کی اندرونی معاشی زندگی پر پڑتا ہی نہیں مطلب محض یہ ہے کہ بیرونی قیمت کی ابتدائی اہمیت بین اقوامی تجارت اور لین دین کی رہینِ منت ہے اس حیثیت سے ہمیں روپے کی بیرونی قیمت کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہوگا کہ وہ ممالک جن سے ہمارے بیش تر تجارتی تعلقات قائم ہیں اپنے اپنے سکوں کی بیرونی قیمت کے متعلق کیا پالیسی اختیار کرنے والے ہیں۔ کیوں کہ ہم اس طرح اپنی معاشی زندگی پر بُرے اثرات سے بچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اور بیرونی معاشی تبدیلیوں سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں ہندستان کی بیش تر خارجی تجارت انگلستان اور امریکہ سے ہے۔ اور ابھی عرصے تک ان تعلقات کی اہمیت میں کسی نمایاں تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ہمارے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ یہ دونوں ممالک ڈالر اور اسٹرلنگ کی بیرونی قیمت کے متعلق کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اب روپے کی بیرونی قیمت کے تعین میں ایک دشواری راستے سے ہٹ چکی ہے۔ اسٹرلنگ اور ڈالر کی باہمی شرحِ مبادلہ کا تعین ہو چکا ہے۔ سونے اور ڈالر کی باہمی قیمت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ امریکہ کی ٹریزری کے سکریٹری نے فنڈ کو اطلاع دی ہے کہ ڈالر کی قیمت ۱۵ ۵/۲۱ گرین سونے کے برابر ہوگی جس کا ۹/۱۰ حصہ خالص ہوگا۔ یہ وزن سنہ ۱۹۳۴ء کے اعلان کے مطابق مقرر ہوا تھا۔ برطانوی اکسچکر کے چانسلر نے بھی اعلان کیا ہے کہ اسٹرلنگ کی موجودہ شرحِ مبادلہ جس کے مطابق ایک پونڈ کی قیمت ۴.۰۳ ڈالر کے برابر ہے قائم رکھی جائے گی۔

کسی سکے کی بیرونی قیمت کا دارومدار کن باتوں پر ہوتا ہے؟ قوتِ خرید کی مساوات کے نظریے کے مطابق دو سکوں کی جو معیارِ طلا پر نہ ہوں باہمی شرحِ مبادلہ ان کی اضافی قوتِ خرید پر مبنی ہوتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق سکے کی بیرونی قیمت اس طرح پر متعین ہونی چاہیے کہ ایک ملک کے سکے کو اگر اس شرح پر دوسرے ملک کے سکے کی شکل میں تبدیل کریں تو اس سے اتنی ہی قیمت کی چیزیں خریدی جا سکیں جتنی اول الذکر ملک میں اس کے عوض مل سکتی تھیں۔ مثلاً اگر ہندستان میں ایک روپے کی قوتِ خرید وہی ہو جو انگلستان میں ایک شلنگ چھ پنس کی ہے تو روپے کی صحیح بیرونی شرح ایک روپیہ = ایک شلنگ چھ پنس ہوگی۔ بیرونی شرحِ مبادلہ کے تعین میں

جو پیچیدہ مالی اور معاشی اثرات دراصل کارفرما ہوتے ہیں یہ توضیح ان کو بہت آسان بنا دینے کی کوشش ہی۔ مثلاً قوتِ خرید کی مساوات کا تصور صرف ان اشیا کے متعلق صادق آتا ہی جو بین اقوامی تجارت میں حصہ پاتی ہوں۔ بین اقوامی مالی لین دین اور بیرونی مبادلے میں سٹہ بازی وہ دوسرے اثرات ہیں جو شرحِ مبادلہ کے تعین میں حصہ لیتے ہیں لیکن ان کمزوریوں کے باوجود بیرونی تجارت کے معمولی حالات میں یہ نظریۂ شرحِ مبادلہ کے تعین کی بہترین توضیح کرتا ہی۔

اس لحاظ سے شرحِ مبادلہ کے تعین کے لیے بہترین نقطۂ آغاز اندرونی اور بیرونی قیمتوں کی موجودہ شرح ہی خصوصاً ان ممالک کی مروجہ قیمتیں جن سے ہندستان کے تجارتی تعلقات ہیں۔ اس حیثیت سے ہمیں انگلستان اور امریکہ کی موجودہ شرحِ قیمت اور ان کے مستقبل کے رجحان کا اندازہ لگانا چاہیے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہی کہ ہندستان میں قیمتوں میں جنگ کے دوران میں جو اضافے ہوئے ہیں وہ ان دونوں ممالک کے مقابلے میں بہت نمایاں ہیں ۱۹۳۹ء کی قیمتوں کے اشاریے کو اگر ۱۰۰ تسلیم کرلیا جائے تو مارچ ۱۹۴۶ء میں امریکہ کی قیمتوں کا اشاریہ ۱۴۳ تک پہنچ چکا تھا۔ انگلستان میں ۱۷۷ تک اور ہندستان میں ۲۵۴ تک۔ اگر یہ صحیح تسلیم کرلیا جائے کہ روپے اور اسٹرلنگ کی باہمی شرحِ مبادلہ ۱۹۳۹ء میں ٹھیک تھی تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ آج روپے کی بیرونی قیمت میں کمی ضروری ہی تاکہ دونوں ملکوں کے سکوں کی بیرونی قیمت ان سکوں کی اندرونی قوتِ خرید سے ہم آہنگ ہوجائے۔ جن لوگوں کا یہ مطالبہ ہی کہ روپے کی بیرونی قیمت میں کمی ضروری ہی ان کی دلیل اسی پر مبنی ہی۔ یہ صحیح ہی کہ جنگ کے دوران میں روپے کی اندرونی قوتِ خرید میں بیرونی قوتِ خرید کے مقابلے میں بہت کمی ہوگئی ہی اور موجودہ حالات میں ایک روپے کی مدد سے انگلستان اور امریکہ میں جتنی چیزیں خریدی جاسکتی ہیں اتنی ہندستان میں شاید دست یاب نہیں ہوسکتیں۔ لیکن قیمتوں کی موجودہ شرحیں کہیں بھی دائمی یا مستقل نہیں ہیں۔ اور بیرونی قیمت میں کسی ردّ و بدل سے پہلے یہ ضروری ہی کہ مستقبل میں قیمتوں کے رجحانات کا کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے۔ سب سے پہلے ہندستان کی قیمتوں کی شرحوں کا مسئلہ لے لیجیے۔ ہندستان میں قیمتوں میں جو اضافے جنگ کے دوران میں ہوئے ہیں ان کا سب سے اہم سبب افراطِ زر کے حالات ہیں۔ ایسا نہیں کہ جنگ کے حالات سے مصارفِ پیداوار میں اتنا زبردست اضافہ ہوگیا ہو کہ موجودہ قیمتوں کا باقی رکھنا ملک کے مفاد کے لیے ناگزیر ہو۔ جیسا کہ ایک صاحب نے لکھا ہی ۱۹۴۲ء میں ایک پارلیمنٹری سلکٹ کمیٹی کی رائے کے مطابق ہندستان کی قیمتیں انگریزی قیمتوں سے کچھ بہت زیادہ نہ تھیں۔ اور قیاس چوں کہ یہ ہی کہ ہندستانی مل مالک انگریزی حکومت یا اس کی متعین کی ہوئی وزارتوں کے ہاتھ اپنا سامان گھاٹے سے نہیں بیچتے ہوں گے (گو یہ یقینی ہی کہ ان "قوم پرستوں" نے برطانوی حکومت کو خود ہندستانیوں سے کم قیمت پر اشیا فروخت کی ہیں) اس لیے یہ کہا جاسکتا ہی کہ ہندستان میں مصارفِ پیداوار میں انگلستان کے مقابلے میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہی۔ گویا ہم ناگزیر طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اپنی موجودہ قیمتوں میں تخفیف کا مطالبہ کرنا اور اس کی بجا طور پر توقع رکھیں بہت

ذمہ دار لوگوں کی رائے ہو کہ بہ تدریج ہندستانی قیمتوں کو جنگ کے مقابلے میں ۱۸۰ یا ۱۹۰ کی سطح پر لایا جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک خصوصاً انگلستان اور امریکہ میں قیمتوں کے رجحان پر نظر ڈالیے تو خیال ہوتا ہو کہ ان ممالک کو جنگ کے دوران میں قیمتوں کے مستحکم رکھنے میں کتنی ہی کامیابی ہوئی ہو لیکن مستقبل میں قیمتوں میں اضافہ ناگزیر ہو۔ دونوں ہی ملکوں میں افراطِ زر کے رجحانات بہت قوی ہیں۔ ملک میں قومی بچت کی شکل میں ایک بڑی رقم پس انداز ہوئی ہو جس میں کچھ جبری ہو کچھ اختیاری۔ لوگوں نے جنگ کے دوران میں اپنی بہت سی مانگیں ملتوی کر دی ہیں اور اب وہ انھیں پورا کرنا چاہیں گے۔ پھر ٹریڈ یونین تحریکیں اجرتوں میں اضافے کی خواہش مند ہیں۔ ان تمام اثرات کو ذہن میں رکھیے تو امید یہی ہوتی ہو کہ ان دونوں ممالک میں قیمتوں میں اضافے کی توقع غلط نہیں ثابت ہوگی۔ امریکہ کی قیمتوں کے رجحان کے متعلق کچھ پیشین گوئی کرنا نسبتاً آسان ہو۔ کیوں کہ وہاں پچھلے چند مہینوں میں اضافے ہوئے ہیں۔ مزدوروں کے اضافۂ اجرت اور قیمتوں پر سے قابو اٹھا لینے کے مطالبات نے مل کر قیمتوں پر حکومت کی گرفت کم زور کر دی ہو۔ اور اگر وہاں افراطِ زر کی انتہائی حالت پیدا نہ بھی ہوئی جیسا کہ بہت سے لوگوں کو اندیشہ ہو تو بھی قیمتوں میں بہت نمایاں اضافہ نا تو ایک اٹل سی بات معلوم ہوتی ہو۔ انگلستان میں بھی اسی قسم کے اسباب کی بہ دولت قیمتوں میں اضافے کا امکان بہت زیادہ معلوم ہوتا ہو۔ لیکن مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کا معاملہ بڑے جوکھم کی بات ہو۔ مستقبل میں کسی بھی صورتِ حال کی پیدائش ان گنت اثرات کا نتیجہ ہوگی اور ایسی صورت میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات کہنا محض حماقت ہوگی لیکن اس گفتگو سے ایک بات تو واضح ہو ہی جاتی ہو اور وہ یہ کہ قیمتوں کی موجودہ سطح کو رُپے کی بیرونی قیمت میں ردّ و بدل کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ کیوں کہ یہ کہنا مشکل ہو کہ قوتِ خرید مختلف ممالک میں کس طرح بدلے گی۔ ان غیر یقینی اور ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات میں کوئی بڑی تبدیلی کرنا بڑی ناعقلی کی بات ہوگی۔

پھر رُپے کی بیرونی قیمت تخفیف سے جن فائدوں کی امید کی جا سکتی ہو وہ موجودہ حالات میں حاصل بھی ہو سکیں گے؟ بیرونی قیمت میں تخفیف عموماً ادائیگی میں بنیادی عدم توازن کو رفع کرنے کے لیے کی جاتی ہو۔ ہوتا یہ ہو کہ اس تخفیف کی وجہ سے برآمدی تجارت میں اضافہ ہوتا ہو کیوں کہ ان سکّوں والے ممالک کو جن کے مقابلے میں سکّے کی قیمت گھٹائی جاتی ہو۔ اس ملک سے اشیا کے برآمد کرنے میں قیمت کے طور پر اب نسبتاً کم رقم ادا کرنی پڑتی ہو۔ مثلاً اگر رُپے کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس کی جائے ایک شلنگ چار پنس کر دی جائے تو ہر رُپے پر ہماری اشیا کے بیرونی خریداروں کو دو پنس کی بچت ہوگی۔ لیکن کیا موجودہ حالات میں ہم اپنی برآمدی تجارت میں اس قسم کی کوئی توسیع چاہتے بھی ہیں۔ دنیا کے اور ممالک کی طرح ہم اپنی بیش تر پیداوار ملک کی اندرونی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بچا کر رکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ ملک کے اندر ہمارے اپنے عوام کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہو اور مختلف اسباب کی بنا پر ہم اس مانگ کو ہی بڑی مشکل سے پورا کر پاتے ہیں۔

فی الحال ہمارا مفاد یہ نہیں کہ اپنی میش تو پیداوار کی برآمد میں توسیع کی کوشش کریں۔ اس کے برخلاف ہماری برآمدی تجارت کی بعض اہم ترین اشیا کو لے لیجیے تو پتا چلتا ہے کہ ہم انھی کی برآمد پر پابندیاں لگا کر اس برآمدی تجارت کی مقدار میں کمی کرنے پر مجبور ہیں۔ مثال کے طور پر خام روئی اور سوتی اشیا کا نام لیا جاسکتا ہے اور جب برآمدی تجارت کے اہم ترین اجزا کا یہ حال ہو تو پھر ـــــ تا بدیگراں چہ رسد فی الحال تجارت میں ہماری تمام تر دلچسپی بس اتنی ہے کہ ہم اپنے پرانے تجارتی تعلقات برقرار رکھیں تاکہ جنگ کے پیدا کردہ حالات جب بدلیں تو ہم اپنی برآمدی تجارت کو پھر پرانی سطحوں تک پہنچا سکیں۔

برآمدی تجارت میں توسیع کا تو ذکر بھی فضول ہے۔ فی الحال ہماری اہم ترین ضرورت مزید درآمد ہے۔ ہم کو اپنے ملک کے باشندوں کے لیے غذا، کپڑے اور مختلف اور عام استعمال کی اشیا کی ضرورت ہے۔ ملک کے اندر مختلف اشیا کی پیداوار میں اضافے کے لیے مشینوں اور دوسرے ضروری سامان، فنی امداد کی ضرورت، نئی صنعتوں کے قیام یا دوسرے الفاظ میں ملک کی معاشی توسیع کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے بھی ہمیں اشیائے اصل کی ضرورت ہے۔ روپے کی بیرونی قیمت میں تخفیف اشیائے درآمد کی قیمتوں کو اور بڑھا دے گی۔ مختلف ممالک میں آج مشینوں کی بے حد قلت ہے۔ اس قلت کا کچھ اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ہندستان کے صنعتی وفد نے جس نے پچھلے سال امریکہ اور انگلستان کا سفر کیا تھا اپنی واپسی پر کہا تھا کہ سوتی کپڑے کی صنعت کے لیے مشینوں کا حصول دو سال سے پہلے ممکن نہیں ہوگا۔ آج تک یہی حال اب بھی ہے۔ ہماری ضرورت کی تکمیل آسانی سے ہوتی نظر نہیں آتی۔ برطانیہ عظمیٰ میں خود اس قسم کی مشینوں کی بڑی کمی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے ہمیں کوئی بھی ملک بہت زیادہ چیزیں برآمد کرنے کو تیار نہیں۔ ایسی صورت میں تخفیف کے ذریعے درآمدی تجارت میں کمی کرنے کا تو سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر ہمارا مفاد تو جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں یہ ہے کہ سستے داموں پر اشیائے اصل حاصل کرسکیں تاکہ ہماری معاشی ترقی کا پروگرام تیزی سے عمل میں آسکے۔ اشیائے اصل کی قلت کے ساتھ ساتھ ہمارے سامنے ایک اور مشکل بھی ہے۔ ان چیزوں کی قیمت میں جنگ سے پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اگر ہم ان مہنگی مشینوں کو درآمد کریں گے تو کچھ عرصے بعد جب قلت کے موجودہ حالات کی جگہ آزاد بین اقوامی تجارت لے لے گی تو ہماری صنعتوں کے لیے اس طرح بہت زیادہ قیمت کی مشینیں کارخانوں میں لگانے کی وجہ سے دوسرے ممالک سے مقابلہ کرنے میں بڑی دقتیں پیدا ہوں گی۔ اس لیے ملک کے ارباب حل و عقد کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس دقت کو کسی طرح حل کیا جائے نہ یہ کہ ہم الٹے روپے کی قیمت گھٹا کر جس سے ہم موجودہ حالات میں کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکیں گے اپنی دقتوں میں اضافہ کرلیں۔

اس سلسلے میں ہمیں برطانیہ عظمیٰ کی مثال سے سبق لینا چاہیے۔ برطانیہ عظمیٰ میں قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے بیرونی قرضوں کی مقدار بہت کافی ہے۔ اسے برآمدی تجارت میں اضافے کی سب سے زیادہ اور سب سے جلد ضرورت ہے۔ اور اسے

اندیشہ ہے کہ اس تبدیلی سے پانچ سال کے عرصے میں اپنے خارجی لین دین میں گھاٹے کا سامنا کرنا پڑے گا ہم اب بجائے مقروض ہونے کے قرض دار ہیں اور بیرونی تجارت میں برآمد سے زیادہ فی الحال درآمد پر زور دینا ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ اگلے چند سال میں ہمارے تجارتی توازن کا کیا رخ ہوگا، مخالف یا موافق۔ اسی طرح امریکہ نے بھی ڈالر کی بیرونی قیمت کے ساتھ کوئی مداخلت ضروری نہیں سمجھی ہے۔ حالانکہ امریکی ڈالر کی قیمت میں اندرونی قیمتوں کے اضافے کی وجہ سے کمی ہو رہی ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈالر کی قیمت گھٹ کر ۱۹۲۹ء کی سطح سے ۶۵ فی صدی تک آجائے گی۔ اور پھر بھی امریکہ نے ڈالر کی بیرونی قیمت میں تخفیف کا کوئی خیال نہیں کیا۔ انگلستان اور واشنگٹن کے باخبر حلقوں میں یہ رائے مسلم ہے کہ موجودہ حالات کسی سکے کی بیرونی قیمت میں تبدیلی کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ ہاں اگر مروجہ شرح مبادلہ کھلے طور پر نقصان پہنچا رہی ہو تو ظاہر ہے کوئی نہ کوئی ترکیب اس نقصان سے بچنے کے لیے اختیار کرنا ضروری ہے۔ اور جہاں کہیں بھی یہ سمجھنے کی گنجائش ہو کہ موجودہ شرحیں توازن کے قریب بھی ہیں تو ان سے کھیلنا فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث ہوگا۔ ہمارے سامنے "ایسٹرن اکونومسٹ" کے الفاظ میں اہم سوال یہ نہیں کہ آج ہی روپے کی صحیح بیرونی قیمت کے تعین کا فیصلہ کر لیں کیوں کہ موجودہ غیر یقینی حالات میں کوئی ایسی شرح چن لینا جو کچھ عرصے تک کام دے سکے ناممکن نہیں تو بہت دشوار سی بات ہے۔ اور اگر یہ بات امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کے لیے اس قدر مشکل ہے جہاں کی معاشی زندگی کے ہر شعبے کے متعلق صحیح اور مفصل معلومات موجود ہوتی ہیں تو پھر ہندستان کا کیا ذکر جہاں ہم اپنی زراعت کے متعلق بھی اعداد و شمار کے لحاظ سے مکمل تاریکی میں زندگی گزارتے ہیں۔ ہمیں فی الحال صرف یہ طے کرنا ہے کہ کیا موجودہ شرح مبادلہ اندرون اور بیرون ملک کے حالات سے اس درجہ بے تعلق ہے کہ اگر ہم نے اسے تسلیم کر لیا تو کیا مستقبل میں ہمیں ناقابل حل دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا؟ اور اس سوال کے بعد یہ طے کرنا ہے مالی فنڈ کے قوانین کے مطابق شرح مبادلہ میں ۱۰ فی صدی تک تبدیلی کا جو حق ہمیں دوسرے ممالک کی طرح حاصل ہوگا وہ کافی ہوگا یا نہیں۔ لیکن مستقبل کے حالات کے غیر یقینی ہونے کے پیش نظر ہم ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ حق کافی ہوگا یا نہیں۔ یوں سمجھیے کہ جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے ہم اس مسئلے میں کسی قسم کی بھی کوئی رائے قطعیت کے ساتھ نہیں قائم کر سکتے۔ اس لیے فی الحال ہمیں صرف یہ طے کرنا ہے کہ ملک کے موجودہ اور مستقبل قریب کے تقاضوں کے پیش نظر ہمارے سکے کی بیرونی قیمت میں کسی قسم کی تبدیلی ضروری ہے یا نہیں۔ اوپر کی گفتگو سے ہم اس مسئلے کے ایک پہلو یعنی شرح مبادلہ میں تخفیف کے متعلق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ غیر ضروری ہے اور ممکن ہے اس سے فائدے کی بجائے الٹا نقصان پہنچے۔ سکے کی بیرونی قیمت میں تخفیف روز بہ روز نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ اس سے ملک کے نظام زر میں غیر ممالک اعتماد کھو بیٹھتے ہیں۔ اور اس کے فوائد کا تعین اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب یہ اقدام صحیح وقت پر ہو۔ موجودہ حالات میں قیمت میں تخفیف سے ایک بہت نقصان دہ نتیجہ یہ مترتب ہو سکتا ہے کہ ملک کی موجودہ قیمتوں میں مزید اضافہ ہو جائے یا کم سے کم یہی مروج قیمتیں مستحکم ہو جائیں۔ اور ملک کے عوام

نے افراط زر کے طفیل میں جو مصیبتیں جنگ کے سات سال میں برداشت کی ہیں وہ خود بہت زیادہ ہو چکی ہیں۔ ان مصیبتوں کو مزید طول دینا کوئی صحیح طریقہ کار نہیں ہوگا

ملک میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو روپے کی بیرونی قیمت میں تخفیف کی بجائے اضافے کے حامی ہیں۔ اس طرز عمل کی حمایت میں ان کی تین دلیلیں ہیں۔ روپے کی بیرونی قیمت میں اضافہ اشیائے درآمد کو سستا کر دے گا، برآمد کو کم کر دے گا اور اس طرح ہم اسٹرلنگ واجبات کو بہت جلد استعمال کر لیں گے۔ اس رائے کے حامیوں کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے روپے کی بیرونی قیمت میں اضافہ نہ کیا تو بیرونی اسٹرلنگ اثاثے کے سلسلے میں ہماری حالت وہی ہوگی جو جنگ عظیم کے بعد امریکہ کی ہوئی تھی۔ ہمیں اس بیرونی قرض کی ادائیگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہوگا۔ پچھلی جنگ عظیم کے بعد امریکہ ہی ایک قرض خواہ ملک بن گیا۔ لیکن اپنی بڑھتی ہوئی صنعتوں کی حفاظت کی خاطر اس نے درآمدی تجارت پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں لگا دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کے مقروض ممالک کے لیے قرض کی ادائیگی میں دقتیں پیش آئیں۔ بین الاقوامی قرضوں کی ادائیگی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مقروض ملک اپنے قرض دار کو زیادہ اشیا برآمد کرے اور درآمد کو کم کرے اور اس طرح تجارت کے موافق رقم سے قرض کی ادائیگی کا کام لے۔ درآمد پر پابندیاں لگانے اور ڈالر کی بیرونی قیمت میں تخفیف کی بدولت امریکہ کے مقروض ممالک کے لیے قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کو ان سے محروم ہونا پڑا۔ اس مثال سے روپے کی قیمت میں اضافے کے حامیوں کے خیال کے مطابق ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ پھر روپے کی بیرونی قیمت میں اضافے سے درآمد سستی ہو جائے گی۔ مثلاً اگر روپے کی بیرونی قیمت ایک شلنگ چھ پنس کے بدلے میں دو شلنگ قرار پائے تو ایک ہی روپے میں ہم انگلستان سے وہ چیزیں حاصل کر سکیں گے جن کی قیمت انگلستان میں دو شلنگ ہو بجائے اس کے کہ ایک شلنگ چھ پنس کے ہی بدلے میں ہم کو ایک روپیہ دینا پڑے۔ اور درآمد میں معقول اضافہ [illegible] لہٰذا ہم عام استعمال کی اشیا ملک میں درآمد کر سکیں گے اور اس طرح موجودہ افراط زر کے حالات کا مقابلہ کر سکیں گے۔ ساتھ ہی اشیائے اصل کو سستے داموں میں منگا لینے کی بدولت ہم اپنی صنعتی پیداوار میں معتد بہ اضافہ کر سکیں گے اور اس طرح ہم موجودہ قلت اشیا اور غربت دونوں سے ہی چھٹکارا حاصل کر سکیں گے۔ روپے کی بیرونی قیمت میں اضافے کی یہ دلیلیں کافی وزنی ہیں۔ آئیے ذرا ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں۔

سب سے پہلے روپے کی بیرونی قیمت میں اضافے کی بدولت درآمد اشیا میں جو سہولتیں بتائی جاتی ہیں انہی کو سامنے رکھیے۔ اوپر ہم نے اشیائے اصل کی بین الاقوامی قلت کا ذکر کیا ہے۔ ان حالات میں جب چیزیں سرے سے موجود ہی نہیں مصنوعی ذرائع سے درآمد میں اضافہ کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس حیثیت سے یہ طریق کار غیر ضروری ہے۔ ایک اونچی شرح مبادلہ کو قائم رکھنے کے لیے اندرون ملک کی قیمتوں کو کم کرنا پڑے گا۔ قیمتوں میں کمی ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ تخفیف بتدریج ہونی چاہیے اور ایسے ذرائع

سے کہ ملک میں بے روزگاری اور افلاس بڑھنے نہ پائیں۔ اونچی شرح مبادلہ سے ممکن ہے ہمیں تفریطِ زر کا سہارا لینا پڑے۔ زر کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ تفریطِ زر کے نتائج بھی اسی طرح مضرت رساں ہوتے ہیں جیسے افراطِ زر کے۔ برآمدی تجارت پر اس طرح کی پابندیاں لگانا غیر ضروری ہے۔ کیوں کہ برآمد روکنے کے لیے دوسرے اور ذرائع موجود ہیں جن کے استعمال سے کسی اور نقصان کا اندیشہ نہیں۔ اسٹرلنگ قرضے کی ادائیگی میں بے شک اس طرح سہولت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اور اس طریقِ کار کی حمایت سرجیمز منی دیش مکھ تک نے کی ہے جن کی واقفیت کے متعلق دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن ابھی اسٹرلنگ قرضے کی ادائیگی کا مسئلہ دونوں حکومتوں کے درمیان کا موضوع ہے جب تک یہ تفصیلی گفت و شنید نہ ہو جائے اس طرح کا اقدام جلد بازی ہے خصوصاً ایسے حالات میں جب اس سے خطرناک نتائج کی توقع ہے۔

اوپر کی گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موجودہ حالات میں زر کی بیرونی قیمت میں کسی طرح کی تبدیلی مفید نہیں ہوگی۔ اور اس لیے موجودہ شرح کو جوں کی توں قائم رہنے دینا چاہیے۔ فنڈ کے قوانین کی رو سے بھی ہمیں ۲۰ فی صدی تبدیلی کا حق ہوگا۔ کم سے کم اس حد تک ترمیم ہم اپنے موجودہ فیصلے میں آیندہ بغیر کسی غل غش کے کرسکتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اس سلسلے میں بڑی مایوسی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فنڈ کو اس تبدیلی پر آمادہ کرنا آسان نہ ہوگا۔ تبدیلیوں کی شرط یہ رکھی گئی ہے کہ کسی ملک کے خارجی لین دین میں اگر "بنیادی عدمِ توازن" ہو تو اسے یہ اقدام کرنے کی اجازت مل جائے گی اگر ہماری مروجہ قیمتیں دوسرے ممالک کی قیمتوں سے ہم آہنگ نہ ہوسکیں تو ظاہر ہے کہ کسی سمجھ دار آدمی کو اسے "بنیادی عدمِ توازن" قرار دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور ہمیں یہ ترمیم کرنے کا حق آسانی سے مل سکے گا۔ ہاں اگر اتنی ترمیم ہمارے مقاصد کے لیے کافی نہ ہوئی تو پھر ہمیں دوسری راہیں نکالنی پڑیں گی۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

ہندستان میں زراعت کی خامیاں

از : ——— سید اقبال حسین ایم۔ اے

ہندستان میں زراعت سب سے اہم پیشہ ہے۔ تقریباً ۷۰ فی صدی آبادی کا گزارا اسی پر ہے لیکن بدقسمتی سے یہ نہایت ہی غیر ترقی یافتہ اور پست حالت میں ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں انگلستان۔ ڈنمارک۔ روس۔ فرانس اور امریکہ وغیرہ میں کاشتکاری کے طریقوں میں ایک انقلابِ عظیم ہوگیا ہے۔ پرانے اور دقیانوسی ہلوں کی جگہ ٹریکٹر۔ بیج بونے، فصلیں کاٹنے، اناج کو صاف کرنے اور دوسرے جملہ کاموں کے لیے نئی نئی مشینیں استعمال کی جاتی ہیں۔ جو مہینوں کا کام دنوں اور گھنٹوں میں ختم کردیتی ہیں۔ زمین کی زرخیزی نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ بڑھانے کے لیے عمدہ قسم کے مصنوعی کھاد کام میں لائے جاتے ہیں بہترین قسم کا بیج استعمال کیا جاتا ہے اور فصلوں کو ایک خاص نظام کے ساتھ اُگایا جاتا ہے۔ ان اسباب کی بنا پر ان تمام ممالک میں زراعت نے بے حد ترقی کی ہے اس کے برعکس ہمارے ملک میں زراعت نے بہت کم ترقی کی ہے۔ اور جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہے ہندستان کی پیداوار اور ممالک کے مقابلے میں سب سے کم ہے۔

ممالک ۔ فی ایکڑ پیداوار (پاؤنڈ میں)

	چاول	گیہوں	روئی
امریکہ	۱۷۵۵	۷۷۵	۱۵۱

انگلستان	—	۱۸۶۱	—
جاپان	۳۲۳۲	۱۲۱۸	۳۴۷
مصر	۲۶۱۰	۱۴۹۶	۲۹۴
ہندستان	۱۳۳۶	۶۷۷	۸۹

تقریباً ہر چیز کی پیداوار دوسرے ملکوں کی نسبت ہندستان میں بہت کم ہے اس کے مندرجہ ذیل چند بڑے بڑے اسباب ہیں۔

۱۔ کھیت۔ ہندستان میں کسانوں کے پاس کھیت بہت ہی چھوٹے ہیں۔ بعض اوقات اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کو کاشت کاری کے قابل ہی نہیں کہا جا سکتا۔ کھیتوں کی چھوٹائی کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے جو ۱۹۲۱ء کی مردم شماری سے لیے گئے ہیں۔

اوسطاً فی کس رقبہ زمین		اوسطاً فی کس رقبہ زمین	
ممالک	ایکڑوں میں	ممالک	ایکڑوں میں
امریکہ	۱۴۵	پنجاب	۶
ڈنمارک	۴۰	مدراس	۵
سوئڈن	۲۵	بنگال، بہار، اڑیسہ	۳
جرمنی	۱۴½	آسام	〃
بمبئی	۱۲	یوپی	۲½
سی پی	۸½		

یہ اعداد و شمار ۱۹۲۱ء کے ہیں اور جب سے اب تک ہندستان کی آبادی میں بہت کافی اضافہ ہو چکا ہے اور کسانوں کی تعداد پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے اس کے برعکس کھیتی باڑی کے لیے زمین بہت کم بڑھی ہے اس لیے لازمی طور پر اوسط پہلے سے بھی کم ہو گئی ہوگی [illegible] کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا کیوں کہ بہت زیادہ تعداد کسانوں کی ایسی ہے جن کے پاس زمین [illegible] کھیت ہی چھوٹے چھوٹے ہیں بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے [illegible] فی صدی کھیت رقبے میں ایک ایکڑ سے بھی [illegible] زمین کی اس ناکارہ تقسیم کی وجہ سے [illegible]

کسانوں کو بڑی دقتیں پیش آتی ہیں اور ان کی کافی محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کام کرنے میں وقت بھی بہت ضائع ہوتا ہے۔ فصلوں کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ کھیت منتشر اور دور دور ہوتے ہیں اور ان کے گرد باڑ بھی نہیں لگائی جا سکتی ہے اور لگائی بھی جائے تو زمین کا کافی حصہ اس میں صرف ہو جائے گا۔ اور بڑی لاگت آئے گی۔ اس قسم کے کھیتوں پر کام کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیداوار پر لاگت زیادہ آتی ہے۔ اور بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ پورے سال کی محنت کے بعد بھی کسان کو نقصان ہی رہتا ہے۔

۲۔ کھاد ــــــ ہر فصل اگانے کے بعد زمین کی زرخیزی میں کمی واقع ہو جاتی ہے لہٰذا زرخیزی کو قائم رکھنے کے لیے کھاد استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اگر کھاد استعمال نہ کیا جائے تو زمین کی زرخیزی گھٹتے گھٹتے زمین بالکل بنجر ہو جاتی ہے۔ ہندستان میں کیمیاوی کھاد کا استعمال مہنگا ہونے کی وجہ سے مشکل ہے، اس لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ کھلی بھی اس کام میں لائی جا سکتی ہے اور ہمارے ملک میں تیل نکالنے والے بیج بھی بہ کثرت پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ دونوں ہی چیزیں زیادہ تر باہر بھیج دی جاتی ہیں اور اگر کھلی یہاں رہتی بھی ہے تو وہ زیادہ تر جانوروں کے کھلانے کے کام آتی ہے۔ صرف گوبر ہی ایک ایسی چیز باقی رہ جاتی ہے جس کو کھاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر ملک میں ایندھن کی کمی اور کسانوں کی مفلسی ان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ گوبر کو سکھا کر جلانے کے کام میں لائیں۔ اس طرح ہندستان کا کاشت کار اس سستے اور مفید کھاد سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اور اس کا اثر لازمی طور پر کھیتوں کی پیداوار اور زرخیزی پر پڑتا ہے۔

۳۔ آلات ــــــ ہندستانی کاشت کار پرانے آلات ہی سے کھیتی باڑی کا کام چلاتا ہے۔ حال آں کہ سائنس کی ایجادات نے دنیا کو بہتر قسم کے زراعتی آلات مہیا کر دیے ہیں۔ ہندستانی کاشت کار اپنی مفلسی اور جہالت کی بنا پر ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

۴۔ بیج ــــــ یہ ایک مشہور بات ہے کہ عمدہ بیج بونے سے پیداوار عمدہ اور زیادہ ہوتی ہے لیکن ہندستان میں عمدہ قسم کا بیج بہت ہی کم ملتا ہے۔ دس فی صدی کھیتوں میں عمدہ بیج استعمال کیا جاتا ہے۔

۵۔ کاشت کا طریقہ ــــــ ہندستان میں کاشت کا وہی دقیانوسی طریقہ رائج ہے جو اب سے صدیوں پہلے رائج تھا۔ یہاں سائنس کی ایجادات اور زراعتی سائنس کی موجودہ معلومات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بے چارے کسان غریب ہیں اور ان کے پاس اس قدر چھوٹے چھوٹے کھیت ہیں کہ مشینوں کا استعمال ناممکن ہے۔ دوسرے کسان بالکل ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ وہ فصلوں کے چکر وغیرہ مفید معلومات سے ناواقف ہیں۔

۶۔ آب پاشی کے ذرائع ــــــ کام یابی کے ساتھ کاشت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وقت پر کھیتوں کو پانی

دیا جاسکے۔ ہندستان میں کھیتوں کی آب پاشی کا زیادہ تر دار و مدار بارش پر ہے۔ لیکن یہاں بارش بے حد بے قاعدہ اور غیر یقینی ہے۔ اگرچہ یہ کمی بڑی حد تک مصنوعی آب پاشی سے پوری کی جاسکتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ہندستان میں آب پاشی کے ذرائع بالکل ناقص اور غیر ترقی یافتہ ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر کھیتیاں پانی وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اور کسانوں کی ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ یہاں تمام مزروعہ علاقے میں سے صرف ۲۳ فی صدی ایسا ہے جس میں مصنوعی آب پاشی کی جاتی ہے باقی ۷۷ فی صدی کا انحصار بارش پر ہے۔

۷۔ کسان ـــــ ہندستانی کسان عموماً جاہل اور ان پڑھ ہیں۔ ان کی مثال کنویں کے مینڈک کی سی ہے وہ دُنیا کے دوسرے ممالک کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ حد سے زیادہ غریب ہیں ان کے خیالات دقیانوسی اور توہمات سے پُر ہیں۔ وہ جوکھوں لیتے گھبراتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ ان کی صحیح رہ نمائی بھی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے وہ چھوٹے چھوٹے بکھرے ہوئے کھیتوں کی وجہ سے سارے سال محنت و مشقت سے کام کرنے کے باوجود نقصان اُٹھاتے ہیں۔ کچھ تو لگان کی ادائیگی کے باعث اور کچھ رسم و رواج میں جکڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے قرض میں پھنس جاتے ہیں جس سے نہ صرف ان کو عمر بھر چھٹکارا نہیں ملتا بلکہ ان کی آنے والی نسلوں کے لیے بھی یہ قرضہ عذاب جان بن جاتا ہے۔ پے در پے کھیتی میں نقصان اور قرض کی زیادتی ان کو لاپروا بنادیتی ہے۔ جس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ کھیتی باڑی کے کام میں ان کی دل چسپی کم ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے گرد باڑ نہ لگ سکنے کی وجہ سے ان میں آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اور اکثر مقدمے بازی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

۸۔ پیداوار کی فروخت ـــــ ہندستان میں پیداوار کی فروخت کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے کسانوں کو اپنی فصل مقامی بنیوں اور ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کرنی پڑتی ہے۔ اور عموماً ایسے وقت فروخت کرنی پڑتی ہے جب کہ منڈی میں اناج کی بہتات ہوتی ہے اس لیے ساہوکار بہت ہی گرے ہوئے نرخ پر خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ بار برداری کے خراب ذرائع، بنی ناواقفیت اور ضرورت اور ساہوکار کے دباؤ کی بنا پر کسان ساہوکار کے ہاتھ میں فروخت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور بیرونی منڈیوں کے اچھے نرخوں سے فائدہ نہیں اٹھاسکتے۔

۹۔ زمین کی ملکیت کا نظام ـــــ ہندستان میں تین بڑے نظام ہیں (۱) زمیں داری (۲) محل داری (۳) رعیت داری

(۱) زمیں داری۔ اس نظام کے مطابق ایک یا چند زمیں دار ایک گانو کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ نظام بنگال، بہار، اڑیسہ، یوپی اور شمالی مدراس میں رائج ہے۔

(۲) محل داری۔ اس میں گانو کی تمام (آبادی) برادری مشترکہ طور پر زمین کی مالک سمجھی جاتی ہے اور مشترکہ طور پر ہی سرکار کو

لگان ادا کرتی ہے۔ یہ نظام پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سی پی میں رائج ہے۔

(۳) رعیت داری۔ اس میں کاشت کار کو زمین براہِ راست حکومت سے ملتی ہے اور وہ خود ہی سرکار کو زمین کا مالیہ ادا کرتا ہے۔ اس کے اور سرکار کے درمیان کوئی تیسرا شخص نہیں ہوتا۔ یہ نظام بمبئی اور مدراس میں رائج ہے۔

لیکن عملی طور پر زمین کی ملکیت کے دو ہی نظام ہیں۔ یا تو کسان اس کا مالک ہوتا ہے اور خود ہی اس کا مالیہ ادا کرتا ہے یا کسی زمیندار کی زمین کاشت کرتا ہے اور اس کے عوض زمیندار کو لگان ادا کرنا پڑتا ہے۔ ہندستان میں دوسرے طریقے کا رواج زیادہ ہے اور تقریباً ۷۰ فی صدی زمین زمینداروں کے قبضے میں ہے اور صرف ۳۰ فی صدی کسانوں کے پاس ہے۔ لیکن کسانوں کا حصہ بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے اور زمین کاشت کاروں کے قبضے سے نکل کر ان غیر کاشت کاروں کے پاس جا رہی ہے جو عموماً شہروں میں رہتے ہیں اور جن کو زمین کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اور ایسی حالت میں کسان خود کو محفوظ نہیں سمجھتا کیوں کہ اس کو زمین سے کسی وقت بھی بے دخل کیا جا سکتا ہے لہٰذا زمین کی زرخیزی بڑھانے یا کم سے کم قائم ہی رکھنے کی تدابیر ایک بھی نہیں سوچتا اور اس کا اثر بالآخر پیداوار پر پڑتا ہے۔

اب ہم ذیل میں چند ایسی تدابیر بتاتے ہیں جن سے زراعتی پیداوار کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

زراعتی پیداوار کو دو طریقوں سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ (۱) زراعتی زمین کی مقدار میں اضافہ کر دینے سے (۲) پیداوار فی ایکڑ زیادہ کرنے سے۔

اب ہم دونوں پر روشنی ڈالتے ہیں:۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پورے ہندستان میں ۳ر۳۴ کروڑ ایکڑ قابلِ کاشت زمین ہے جس میں سے صرف ۹ر۲۷ کروڑ ایکڑ زمین پر آج کل کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ باقی ۴ر۵ کروڑ ایکڑ زمین خالی پڑی ہے جس کو قابلِ کاشت بنجر زمین کہا جاتا ہے۔ اس بات کی تحقیق ہونی چاہیے کہ اس میں سے کتنی زمین پر کاشت کی جا سکتی ہے۔ اگر اس میں سے آدھے رقبے پر بھی کھیتی باڑی کی جا سکتی ہو تو پیداوار تقریباً ۲۵ فی صدی بڑھ جائے گی اس کے علاوہ ۹ر۲۷ کروڑ ایکڑ میں سے تقریباً ۱ر۵ کروڑ آراضی غیر مزروعہ ہے اور اس لیے اس پر پیداوار نہیں ہوتی۔ آراضی غیر مزروعہ ایسی زمین کو کہتے ہیں جس کو ہل چلانے کے بعد ایک سال تک بغیر جوتے چھوڑ دیا جائے۔ زمین کی زرخیزی کو قائم رکھنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ لیکن عمدہ کھاد کے استعمال اور فصلوں کے چکر سے بھی نہ صرف زمین کی زرخیزی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے بلکہ کافی حد تک بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ اور اس طرح غیر مزروعہ زمین کا رقبہ کم ہونے سے پیداوار یقینی طور پر بڑھ جائے گی۔

اگرچہ مندرجہ بالا طریقوں سے کچھ زمین زیر کاشت لائی جاسکتی ہے اور کچھ غیر مزروعہ زمین کو کھاد وغیرہ کے استعمال سے قابلِ کاشت بنایا جاسکتا ہے لیکن اس کا اصل علاج پیداوار فی ایکڑ بڑھانے میں ہے۔ یہ پیداوار سائنسی اور عمیق کاشت کے طریقوں سے بڑھائی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں ضروری ہیں:-

(۱) عمدہ کھاد (۲) عمدہ بیج (۳) عمدہ آلات (۴) آب پاشی کی سہولتیں (۵) فصلوں کا چکر (۶) پودوں کی بیماریوں کی روک تھام (۷) کسانوں کو کم شرح سود پر قرض دینے کا انتظام (۸) پیداوار کے فروخت کرنے کا انتظام۔ (۹) بکھرے ہوئے کھیتوں کو ملا کر مناسب رقبے کے کھیت بنانے کی سہولتیں۔ (۱۰) انجمنِ امدادِ باہمی کا قیام۔

مسائلِ حاضرہ (غیر ممالک)

سویت نظام میں سوشل انشورنس

از : ——— اداره

سویت نظام میں سب سے زیادہ جس چیز کی خبر گیری اور دیکھ بھال کی جاتی ہو وہ "انسان" ہو۔ پورے نظام کا مقصد اگر کچھ ہو تو صرف یہ کہ ہر انسان کام یاب، خوش حال اور خوش گوار زندگی بسر کر سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے سلسلے میں سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہو وہ انشورنس ہو۔ ذیل میں ہم سویت ریاست میں انشورنس کا جو نظام ہو اُس کی خصوصیات واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۹۲۷ء کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہو کہ اُس سال حکومت نے انشورنس پر ۸۰ کروڑ روبل خرچ کیے تھے حالاں کہ اُس زمانے میں سویت ریاست کے معاشی نظام کی تعمیر حال ہی میں شروع ہوئی تھی۔ اُس وقت ہر صنعتی مزدور کو تنخواہ کے علاوہ تنخواہ کی رقم کا ایک تہائی حصہ مزید طور پر دیا جا رہا تھا۔ یہ رقم اسے مختلف شکلوں میں ملتی تھی مثلاً مفت تعلیم کا انتظام، خوش حالی کو بڑھانے والی امداد، انشورنس کا نفع وغیرہ۔ مزدوروں کے لیے مکانات، اسکول، پارک، کلب، اسپتال، آرام گھر، سینی ٹوریم، کنڈر گارٹن، زچہ خانے، غذائیت آمیز کھانے مہیا کرنے والے ہوٹل وغیرہ بہت سے مقامات پر بن چکے تھے اور بن رہے تھے۔ حکومت جتنی رقم اس مد میں خرچ کرتی تھی اُس میں سال بہ سال اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں حکومت کے بجٹ میں سوشل انشورنس کی مد میں ۱۰ ارب روبل کا خرچ رکھا گیا تھا جو ۱۹۲۷ء کے مقابلے میں کوئی بارہ گنی

زیادہ رقم تھی۔ ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک کوئی ۱۳۰ ارب روبل خرچ ہوئے تھے۔

سوویت حکومت کے بنیادی دستور کے دفعہ ۱۲۰ میں یہ درج ہو کہ سوویت ریاست کے ہر باشندے کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ بڑھاپے میں ریاست سے اپنے اخراجات کا مطالبہ کرے، اگر وہ بیمار ہو یا کام کرنے کی صلاحیت اور قوت کھو بیٹھا ہو تو بھی اُسے ریاست سے ایک آرام دہ زندگی کے اخراجات کا مطالبہ کرنے کا اتنا ہی حق ہو۔ یہ حق محض کاغذی چیز نہیں ہو بلکہ واقعی ایسی حالتوں میں ریاست ہر باشندے کی عملی طور پر اعانت اور کفالت کرتی ہو۔ انسانی تمدن کی تاریخ میں یہ چیز اپنی مثال آپ ہو "پالنے سے لے کر قبر تک" یہ ہو سوویت نظام کے سوشل انشورنس کا بنیادی اصول۔ یعنی سوویت ریاست ہر فرد کی خوش حالی اور معاشی حالت کی ذمّے دار ہو، اس ذمّے داری کا سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہو جب انسان پیدا ہوتا ہو اور اُس وقت ختم ہوتا ہو جب وہ مرجاتا ہو۔

اس سوشل انشورنس کی متعدد شکلیں ہیں۔ مثلاً مُفت طبّی امداد، صحت پرور مقامات میں مُفت رہایش کا انتظام، زچہ خانے، اسپتال اور کلینک، مُفت تعطیلات، بچّے کی پرورش و پرداخت کے لیے علاحدہ رقم، نوزائیدہ بچّوں کی دیکھ بھال کے لیے نرسری، بچّوں کے لیے کنڈرگارٹن اور کھیلنے کے میدان، مُفت اسکول، فنی اسکول اور یونی ورسٹیاں جہاں مُفت تعلیم دی جاتی ہو یا اسکالرشپ کے ذریعے طالب علم کی تمام ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ صلاحیت اور رجحان کے مطابق ہر فرد کو روزگار فراہم کرنا، ہر فرد کو کام کرنے اور اس کے ساتھ آرام کرنے کا حق عطا کرنا، مُفت آرام گاہیں، مُفت کلب اور مُفت تہذیبی ادارے وغیرہ وغیرہ۔

زچے اور بچّے کی دیکھ بھال سوشل انشورنس کی اس خاص مد پر سوویت ریاست اور وہاں کی مزدوروں کی انجمنوں نے خاص طور پر توجہ صرف کی ہو۔ یہاں تک کہ گزشتہ جنگ کے دوران میں بھی جو ضلعے کہ جرمن حملوں سے بچے رہے وہاں کے دیہاتوں کی نرسریوں کی تعداد میں ۲۷ فی صدی کا اضافہ ہوا اور قصبات کی نرسری کی تعداد میں ۷۴ فی صدی کا اور طفل خانوں کی تعداد دوگنی ہوگئی۔ ۱۹۴۴ء میں سوویت ریاست نے ایک قانون پاس کیا جس کے تحت پُرانے طفل خانوں کو اور زیادہ وسیع کیا گیا اور نئے طفل خانوں کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

سوویت نظام کے تحت عورت کو سیاسی، معاشی اور سماجی لحاظ سے مرد کے مساوی حقوق حاصل ہیں اور یہ حقوق سوشل انشورنس ہی کے ذریعے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ حاملہ اور بچّے والی عورتوں کی خاص طور سے ریاست اور مزدوروں کی انجمنوں کی طرف سے امداد و اعانت کی جاتی ہو۔ بچّوں کی پرورش و پرداخت اور دیکھ بھال کے لیے مختلف قسموں کے ادارے موجود ہیں۔ ماؤں کو بچّے کی خوراک اور کپڑے کے لیے علاحدہ رقم دی جاتی ہو۔ حاملہ عورتوں اور زچہ کو بچّے کی پیدایش سے

بہت پہلے اور بعد تک پوری تنخواہ کے ساتھ لمبی لمبی فرصت دی جاتی ہے۔ سوویٹ ریاست میں کسی حاملہ عورت کی تنخواہ کاٹنا یا اُسے روزگار فراہم کرنے سے انکار کرنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ حاملہ اور بچے والی عورتوں کو قانوناً کچھ خاص رعایتیں حاصل ہیں، مثلاً حاملہ عورتوں سے چوتھے مہینے سے فاضل کام نہیں لیا جا سکتا اور پانچویں مہینے سے اُسے کاروباری سلسلے میں دوسرے شہروں میں نہیں بھیجا جا سکتا تاوقتیکہ وہ خود رضامند نہ ہو۔ بچے والی عورتوں کے لیے کھانے کی معمولی چھٹیوں کے علاوہ مزید فرصت کے اوقات مقرر ہیں تاکہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلا سکیں۔ حاملہ عورتوں سے بھاری کام چھڑا کر اُن کو ہلکا کام دیا جاتا ہے مگر تنخواہ بھاری کام ہی کی ملتی ہے۔

جنگ سے پہلے ہر عورت کو بچہ پیدا ہونے سے چار ہفتے پہلے اور بچہ پیدا ہونے کے پانچ ہفتے بعد تک پوری تنخواہ کے ساتھ اسپیشل چھٹی دی جاتی ہے۔ اب اس فرصت کے عرصے میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے یعنی اب بالترتیب ۵ ہفتے اور ۶ ہفتے کی چھٹی دی جاتی ہے۔ اگر جڑواں بچے پیدا ہوں تو پیدائش کے بعد ۸ ہفتے کی چھٹی دی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی قاعدہ ہے کہ سالانہ چھٹی جو ہر مزدور عورت یا مرد کو ملتی ہے وہ زچہ کو بچہ پیدا ہونے کے بعد ہی دے دی جاتی ہے جس سے اُس کی فرصت اور آرام کے عرصے میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اُسے بڑی مدد پہنچتی ہے۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد زچہ کو ریاست کی طرف سے دو خاص عطیے دیے جاتے ہیں ایک بچے کی خوراک کے لیے اور دوسرا بچے کے کپڑے کے لیے۔ یہ رقمیں اُس رقم کے علاوہ ہوتی ہیں جو خاص طور پر زچہ کو دی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء تک تو ۷۷ روبل ملتے تھے مگر اب ۱۳۵ روبل ملتے ہیں۔ اگر جڑواں بچے ہیں تو ۲۷۰ روبل اور اگر تین بچے ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں تو ۴۰۵ روبل ہیں۔ حمل قرار پانے کے چھ ماہ بعد سے عورت کا دودھ، شکر، مکھن اور غلے کا راشن بڑھا دیا جاتا ہے۔ دودھ پلانے والی عورتوں کے راشن میں بھی اضافہ کیا جاتا ہے یہ اضافہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک بچہ ۹ ماہ کا نہ ہو جائے۔

بچوں کے کیمپ، سینی ٹوریم، کھیل کے میدان وغیرہ کے لیے خاص خاص رقمیں دی جاتی ہیں۔ جس خاندان میں کافی بچے ہوں اُن کو یک مشت بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں۔ مزدوروں کی انجمنوں کی نگرانی اور انتظام میں بچوں اور عورتوں کے متعدد ادارے قائم ہیں۔ مثلاً دودھ گھر جہاں سے دودھ پیتے بچے کو دودھ، پھل کا رس اور خاص خاص قسم کی غذائیں دی جاتی ہیں۔ حاملہ عورتوں اور زچہ کو اچھی اور قوت بخش غذائیں مہیا کرنے کے لیے کارخانوں میں خاص خاص ریستوران کھلے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی طبی امداد اور مشوروں کے بھی مرکز قائم ہیں۔ یہ طبی ادارے دو فرائض انجام دیتے ہیں، ایک تو علاج معالجہ کرنا اور دوسرے سوشل انشورنس اور مزدوروں کے تحفظ سے متعلق جو قوانین ہیں اُن کی تشریح کرنا اور لوگوں کے اندر اُن قوانین سے واقفیت پیدا کرنا۔ کئی طبی مرکزوں میں تو قانونی شعبے بھی قائم ہیں جو مزدوروں کو اُن کے حقوق کے مسئلے پر قانونی

مشورے دیتے ہیں۔

جنگ سے پہلے نرسریوں اور کنڈرگارٹن کی تعمیر میں کئی کروڑ روبل خرچ کیے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں اس مد میں ۸۰ کروڑ روبل خرچ ہوئے تھے۔ جنگ کے زمانے میں صنعتوں میں عورتوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی ہے چناں چہ بچوں کے اداروں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا جا رہا ہے۔ صنعتی ترقی کے ہر پلان میں نرسریوں، کنڈرگارٹنوں اور طفل گاہوں کی تعمیر کا پروگرام رکھا گیا ہے۔

گرمی کی چھٹیوں میں مزدوروں کی انجمنیں اور صحتِ عامّہ کے افسران اور حکام اسکول کے بچوں کے لیے دیہاتوں میں کیمپ اور قیام گاہیں کھلواتے ہیں۔ یتیم بچوں اور ایسے بچوں کی پرورش و پرداخت میں جن کی مائیں غیر شادی شدہ ہیں ریاست کی طرف سے پوری مدد کی جاتی ہے۔ "سوپریم سوویت" کے پری زی ڈیم کے احکام مورخہ ۸ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء کے مطابق تیسرے بچے کی پیدائش پر زچہ کو خاص طور پر بھتہ دیا جاتا ہے جس میں کافی بھاری رقم ہوتی ہے۔ اس کے بعد عورت کے جتنے بچے پیدا ہوں گے ہر بار اسے بھتہ ملے گا۔ غیر شادی شدہ ماؤں کو ماہانہ سو سے لے کر دو سو روبل تک دیے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے بچے کی پرورش کرسکیں۔

آرام کرنے کا حق

سوویت نظام میں سوشل انشورنس سسٹم کے ذریعے مزدوروں کو آرام اور تفریح کے سامان مہیا کیے جاتے ہیں۔ آرام گاہوں، سینی ٹوریم، تعطیل گاہوں، کلب، پارکوں وغیرہ کی تعمیر میں اور کھیل کے سامان خریدنے میں اور پہاڑ پر چڑھنے اور تفریحی سفر کا انتظام کرنے میں لاکھوں روبل سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء میں کم سے کم ۸۰ لاکھ آدمیوں کو طویل عرصے کی آرام گاہوں میں، ۱۲ لاکھ کو سینی ٹوریم میں اور ۷۰ لاکھ کو ایک دن والی آرام گاہوں میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ سوشل انشورنس کے تحت ایک کروڑ ۶۰ لاکھ مزدوروں نے آرام گاہوں سے فائدہ اُٹھایا اور اس سے بھی کئی لاکھ زیادہ مزدوروں نے کلب، تہذیبی اداروں، پارکوں اور دیگر اداروں سے فائدہ اُٹھایا۔ یہ تمام ادارے مزدوروں کی انجمنوں کی طرف سے چلائے جاتے ہیں۔ عام استعمال کی آرام گاہوں اور سینی ٹوریم کے علاوہ نوجوانوں، بچوں، بوڑھوں اور زچہ اور حاملہ عورتوں کے لیے الگ الگ آرام گاہیں اور سینی ٹوریم بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ کھیل کود اور ورزش کے ادارے بھی بے شمار ہیں جو سوشل انشورنس کے فنڈ سے چلتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۹-۳۴ء میں آرام گاہوں اور سینی ٹوریم کی تعمیر پر ۲۲ کروڑ ۶۰ لاکھ روبل خرچ کیے گئے تھے اور سنہ ۱۹۳۴-۳۹ء میں کوئی ۵۳ کروڑ ۲۰ لاکھ روبل۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں صرف مزدوروں کی انجمنوں کی نگرانی میں ۳۰۵ آرام گاہیں اور ۹۴ سینی ٹوریم چل رہے تھے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں اُن کی تعداد بڑھ کر بالترتیب ۶۲۱ اور ۲۱۶ ہوگئی۔ اُس کے بعد سے کریمیا، سائبریا، مرکزی ایشیا اور قفقاز میں نئے سینی ٹوریم بنائے گئے ہیں۔

تمام مزدوروں کو پوری تنخواہ کے ساتھ سال میں ۱۵ دن سے لے کر ایک ماہ تک کی فرصت دی جاتی ہے۔ فرصت کے عرصے

کا انحصار عمر پر، کام کے سخت یا آسان ہونے پر اور گزشتہ سروس کے طویل یا مختصر ہونے پر ہی۔ نوعمر مزدوروں کو یا ایسے مزدوروں کو جو محنت اور صحت کو نقصان پہنچانے والے کام کرتے ہیں زیادہ طویل فرصت دی جاتی ہی۔

سوشل انشورنس اور صحت

سودیت ریاست کے سوشل انشورنس کے بجٹ کو "صحت کا بجٹ" کہا جاتا ہی اور یہ صحیح بھی ہی اس لیے کہ اگر اُس کی تشریح کی جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعی سوشل انشورنس کے بجٹ کا مقصد مزدوروں کی صحت کو برقرار رکھنا ہی۔ سوشل انشورنس کے فنڈ کا بڑا حصہ بیمار مزدوروں کے لیے خرچ کیا جاتا ہی تاکہ وہ جب تک کام کرنے کے قابل نہ ہوجائیں اپنا خرچ چلا سکیں۔ کام کرنے والے تمام مردوں اور عورتوں کو علالت کے دوران میں اعلا درجے کی طبی امداد فراہم کی جاتی ہی اور بالکل مفت اور ہزار ہا طبی ادارے لوگوں کی صحت کی دیکھ بھال اور حفاظت کرتے ہیں۔ ہر مزدور کو طبی امداد راست طور پر اُس کارخانے میں مل جاتی ہی جہاں وہ کام کرتا ہی۔ اس کے علاوہ علاقائی بنیاد پر ہر ضلع میں علاحدہ متعدد طبی ادارے موجود ہیں جو عام لوگوں کے لیے طبی امداد فراہم کرتے ہیں۔ مختلف امراض کے لیے بھی الگ الگ علاج اور طبی مشورے کا انتظام کیا گیا ہی۔ عورتوں کے لیے علاحدہ طبی مشورہ کاری کے مرکز قائم ہیں۔ ان تمام امور کی دیکھ بھال کے لیے اور اس بات کی نگرانی کے لیے کہ ان اداروں سے مزدوروں کو فائدہ پہنچتا ہی یا نہیں اور کہیں پر اُن کے حقوق پامال تو نہیں کیے جاتے سوشل انشورنس کونسل قائم ہیں جن کے کارکن ہمیشہ ان باتوں پر نظر رکھتے ہیں اور معمولی سے معمولی غلط روی یا غیر قانونی فعل کی بھی گرفت کر لیتے ہیں۔ امراض کے علاج کے علاوہ سوویت طبی ادارے اپنا زیادہ وقت امراض کی روک تھام کی کوششوں میں صرف کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مقوی غذا فراہم کرنے والے ریستوراں کی بڑی اہمیت ہی جو بڑی تعداد میں قائم ہیں اور جو ضرورت مند لوگوں کو سائنسی اصولوں پر تیار کی ہوئی امراض کو روکنے والی اور قوت بخش غذائیں مہیا کرتے ہیں۔

مریضوں کی دیکھ بھال

سوشل انشورنس کونسلوں کے ارکان مریضوں کی قیام گاہوں پر جاتے ہیں انھیں تحفے پیش کرتے ہیں اور ان کو تسلی دیتے ہیں۔ علالت کے دوران میں مریضوں کو بھتہ دیا جاتا ہی۔ اُن مزدوروں کو بھی یہ بھتہ دیا جاتا ہی جو اپنے کسی بیمار رشتے دار کی تیمارداری میں مصروف رہتے ہیں اور کام پر حاضر نہیں ہوسکتے۔ مریض کو اُسی وقت سے بھتہ ملنا شروع ہوجاتا ہی جس روز سے وہ بیمار پڑتا ہی اور اُس وقت تک ملتا رہتا ہی جب تک وہ پورے طور سے صحت یاب نہ ہوجائے یا اُسے لاچاروں کی فہرست میں نہ ڈال دیا جائے جس کے بعد سے اُسے سوشل انشورنس فنڈ سے پنشن ملنا شروع ہوجاتی ہی۔

علالت کے بھتے کے سلسلے میں یہ قاعدہ ہی کہ جو مزدور ایک ہی ملازمت پر ۶ سال سے قائم ہیں اور وہ مزدوروں کی انجمن کے ممبر بھی ہیں انھیں تنخواہ کی سو فی صدی رقم دی جاتی ہی۔ اور اگر کسی مزدور نے ایک ہی ملازمت پر تین سے چھ سال

تک گزارے ہیں تو وہ ۸۰ فی صدی کا حق دار ہوگا۔ دو سے تین سال تک کی سروس پر ۶۰ فی صدی کا اور دو سال سے کم کی مسلسل سروس پر ۵۰ فی صدی کا۔ علالت کے بھتّے کے سلسلے میں نوعمر کام کرنے والوں کو کچھ خاص رعایتیں حاصل ہیں۔

سوشل انشورنس اور بڑھاپا

بدن ہاتھ سے جو لوگ ناچار ہوجاتے ہیں اُن کے لیے اور بوڑھوں کے لیے سوویت نظام میں تمام آسانیاں اور امداد و اعانت مہیا کی جاتی ہیں۔ اچھی غذا اور اچھے علاج اور دیگر باتوں کی وجہ سے سوویت باشندوں میں قبل از وقت جسمانی لحاظ سے لاچار ہونے یا قبل از وقت بوڑھے ہونے کا سلسلہ اب ختم ہوگیا ہے۔ وقت پر بوڑھے ہونے کے بعد ریاست اُن کی کفیل بن جاتی ہے۔ اور وہ معاشی بدحالی سے بالکل دوچار نہیں ہوتے۔ اس طرح سوویت نظام کے تحت بوڑھوں کی حالت تمام دیگر ملکوں کے بوڑھوں کی حالت سے مختلف ہے۔

سوویت ریاست میں انقلاب کے بعد سے لوگوں کی اوسطِ عمر میں اضافہ ہوگیا ہے۔ لاچاروں کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے اور صنعتوں میں کام کرنے والوں کے ساتھ حادثے اب بہت کم ہوتے ہیں، ساتھ ہی بعض کاموں سے جو امراض لاحق ہوجاتے تھے اُن کی بیخ کنی کردی گئی ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں ہر ایک ہزار بیمہ شدہ افراد میں ۵ ء۱۵ فی صدی کو پنشن دے کر کام سے برخواست کر دیا گیا۔ لیکن لاچاروں اور قبل از وقت بوڑھے ہوجانے والوں کی تعداد اتنی تیزی سے گھٹنے لگی کہ سنہ ۱۹۱ء میں صرف ۲ء ۵ فی صدی کو پنشن دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس طرح لاچاروں اور مجبوروں کی تعداد میں دو تہائی کی کمی ہوئی ہے۔ اب کارخانوں میں کام کرنا پہلے کے مقابلے میں اس قدر آسان اور خوش گوار بنا دیا گیا ہے اور مزدوروں کی صحت کی اتنی دیکھ بھال کی جاتی ہے کہ عمر کے زیادہ ہوجانے کے بعد بھی جب کہ جسمانی طاقت بہت حد تک زائل ہوجاتی ہے لوگوں پر کام بار نہیں گزرتا

سوویت نظام میں لاچاروں کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے :-

۱- وہ لوگ جن کے اندر کام کرنے کی صلاحیت اور طاقت بالکل نہیں رہی اور دوسروں کی نگرانی اور دیکھ بھال کے محتاج ہیں۔

۲- وہ لوگ جن کے اندر کام کرنے کی صلاحیت نہیں رہی لیکن اپنی دیکھ بھال خود کرسکتے ہیں۔

۳- جن کی قوتِ جسمانی زائل ضرور ہوئی ہے لیکن زیادہ نہیں۔

موخر الذکر دونوں جماعتوں کے افراد کی تعداد بہت گھٹ گئی ہے۔

ان لاچاروں اور بوڑھوں کو ریاستی پنشن کے علاوہ سوشل انشورنس فنڈ سے بھی پنشن ملتی ہے۔ موخر الذکر پنشن پورے نظام کا ایک حصّہ ہے۔ اس کے تحت مندرجۂ ذیل پنشن ہیں :-

۱- لاچاروں کی پنشن

۲- بڑھاپے کی پنشن

۳۔ لواحقین کی پنشن

۴۔ طویل خدمت گزاری کی پنشن

۵۔ نام ور مزدوروں کی پنشن

۶۔ ذاتی پنشن۔

کتنے سال تک کام کرنے کے بعد کسی شخص کو پنشن ملنی چاہیے اس کا انحصار تین باتوں پر ہے۔ عمر جنس۔ کام کی نوعیت۔ ۲۲ سے ۲۵ سال تک کی عمر والوں کو لاچاروں کی پنشن اس شرط پر ملتی ہے کہ لاچار ہونے سے پہلے انھوں نے کم سے کم چار سال ملازمت کی ہو۔ اور اسی عمر کی عورتوں کے لیے صرف تین سال کا عرصۂ ملازمت کافی ہے۔ ۳۵ اور ۴۰ سال کی عمر کے مردوں کو لاچاروں کی پنشن دس سال کی ملازمت پر ملتی ہے اور عورتوں کو سات سال کی ملازمت پر۔ زیرِ زمین کام کرنے والوں کے لیے چھ سال کی مدت رکھی گئی ہے۔

پنشن کی رقم طے کرنے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اصولوں کی پابندی کی جاتی ہے:-

۱۔ جو مزدور صحت کو نقصان پہنچانے والے کام میں مصروف ہوتے ہیں انھیں زیادہ پنشن دی جاتی ہے اور اُن کے لیے ملازمت کی مدت بھی کم رکھی جاتی ہے۔

۲۔ جن مزدوروں نے کسی خاص صنعت میں مسلسل طور پر ملازمت کی ہو انھیں زیادہ پنشن دی جاتی ہے۔

۳۔ وہ مزدور جو پنشن پانے کے بعد بھی کسی صنعت میں دو چار گھنٹے کی ملازمت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں انھیں کچھ خاص مراعات دی جاتی ہیں۔

۴۔ پنشن کے لیے درخواست دینے والی عورتوں اور نو عمر کارکنوں کو بھی کچھ خاص مراعات دی جاتی ہیں۔

پنشن کی رقم کا انحصار لاچاری کے کم یا زیادہ ہونے پر ہے۔ پھر اس سلسلے میں اس بات کا بھی خیال کیا جاتا ہے کہ پنشن چاہنے والا جس صنعت میں کام کرتا تھا اس میں کام کرنا مشکل ہے یا آسان، چناں چہ اسٹیل اور کوئلے کے کارکنوں کو زیادہ پنشن دی جاتی ہے اور غذا اور کپڑے کی صنعت میں کام کرنے والوں کو کم۔ اس طرح پنشن چاہنے والے کی اوسط آمدنی کا ۳۳ فی صدی سے لے کر ۷۰ فی صدی حصہ تک پنشن کے طور پر دیا جاتا ہے۔ اگر مزدور کسی صنعتی حادثے یا ایسے مرض کی وجہ سے لاچار ہو گیا ہے جو اُس مخصوص صنعت میں کام کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے تو اُسے اوسطِ آمدنی کا سو فی صدی حصہ پنشن کے طور پر دیا جاتا ہے۔

بڑھاپے کی پنشن کے تعین میں اس بات کا بالکل نہیں خیال کیا جاتا کہ آدمی کس حد تک لاچار ہے۔ بلکہ سب کو یکساں رقم دی جاتی ہے۔ جس مرد نے ۲۵ سال تک کام کیا ہے اُسے ۶۰ برس کی عمر سے پنشن ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ اور جس عورت نے

۲۰ سال تک کام کیا ہو اُسے ۵۵ سال کی عمر سے۔ صحت کو نقصان پہنچانے والی ملازمتوں میں ۲۰ سال کی مدت کے بعد ۵۰ سال کی عمر سے پنشن ملتی ہے بڑھاپے کی پنشن اوسط آمدنی کا ۵۰ یا ۶۰ فی صدی حصہ ہوتی ہے۔

طویل خدمت گزاری کی پنشن دیہی علاقوں میں کام کرنے والے طبّی کارکنوں، زراعت کے ماہروں اور ٹیچروں کو ۲۵ سال کی مدت ملازمت کے بعد دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں عمر اور تن درستی کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ یہ پنشن اوسط آمدنی کا ۵۰ فی صدی حصہ ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی پنشنیں ہیں۔ لیکن ان کا تذکرہ ذرا طویل ہو جائے گا۔

نظری معاشیات

زرعی سرمایہ داری

از : —— چودھری شیر جنگ

زراعت کے لیے سب سے پہلی چیز جو درکار ہوتی ہے وہ ہے زمین۔ اور سرمایہ دارانہ سماج میں تمام زمین انفرادی ملکیت کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ تمام سرمایہ دارانہ ملکوں میں زمین کے بڑے بڑے تعلقے، بڑے بڑے زمین داروں کی انفرادی ملکیت ہیں جو خود ان پر کام نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو لگان پر دیتے ہیں۔ یہ حالت آج سے نہیں ہے بلکہ قرونِ وسطیٰ میں جاگیرشاہی کے زمانے سے چلی آئی ہے۔ تب ہی سے یہ زمین دار طبقہ دوسروں کی محنت پر عیش کرتا چلا آرہا ہے۔ فرق صرف استحصال کے طریقے میں کچھ پڑا ہے، اور کچھ نہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت زمیں دار (زمین کا مالک) اپنی زمین کا لگان وصول کرتا ہے۔ یہ لگان کیا ہے؟ لگان اُس آمدنی کو کہتے ہیں جو کہ زمیں دار کسی دوسرے شخص کو اپنی زمین استعمال کرنے کے لیے دے کر معاوضے میں پاتا ہے۔ جب زمیں دار خود ہی اپنی زمین پر پیداواری عمل کرتا ہے تو اس صورت میں اُسے اس لگان کے برابر آمدنی کے علاوہ اوسط منافع بھی حاصل ہوتا ہے۔

لگان کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ خود بخود تو زمین سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ دیگر تمام مادی قدروں کی طرح یہ بھی انسانی محنت سے ہی پیدا ہوتا

ہے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ قدرِ زائد کا ایک حصہ کس طرح لگان کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس سوال کو آسانی سے سمجھنے کے لیے ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ زمین کا مالک زمیں دار خود اپنی زمین کاشت نہیں کراتا بلکہ ایک دوسرے شخص کو لگان پر دے دیتا ہے جو مزدوروں کو اجرت پر رکھ کر اس زمین پر کھیتی باڑی کا کام کراتا ہے۔ آسانی کے لیے ہم زمین کے مالک کو زمیں دار کہیں گے اور اس دوسرے آدمی کو جو لگان پر زمین لےکر مزدوروں کے ذریعے کھیتی کراتا ہے زرعی سرمایے دار کہیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ آج بھی بہت سے چھوٹے بڑے زمیں دار اپنی زمین خود کاشت کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس قسم کی کاشت نہیں ہوتی جو کہ زراعت کو ترقی کی طرف لے جاتی ہے، اس لیے ہم زراعت کی اس صنف پر زیادہ بحث نہیں کریں گے۔

نوعی لگان

سرمایے دارانہ لگان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک کو نوعی لگان کہتے ہیں اور دوسرے کو مطلق لگان۔ ہم پہلے نوعی لگان کا مطالعہ کریں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ زمین کا رقبہ ضرورت کے مطابق گھٹایا بڑھایا نہیں جا سکتا، یعنی ضرورت پڑنے پر زمین پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تمام زمین نوعی اعتبار سے بھی یکساں نہیں ہوتی یعنی زمین کا کوئی ٹکڑا زیادہ زرخیز ہوتا ہے اور کوئی کم۔ ساتھ ہی کچھ زمینیں، شہروں، دریاؤں، سڑکوں اور سمندروں کے نزدیک ہوتی ہیں اور کچھ دور۔ ان کی یہ نزدیکی اور دوری ان زمینوں کی اہمیت کو بڑھا یا گھٹا دیتی ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے زرعی پیداوار پر باربرداری اور نقل و حمل کا خرچ گھٹ یا بڑھ جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ صنعتی جنسیں اپنی اوسط لاگت کے مطابق بازار میں قیمت پاتی ہیں لیکن زرعی جنسیں اس کے خلاف اس لاگت کے مطابق قیمت پاتی ہیں جو نوعی اعتبار سے ادنا ترین زمین پر صرف آئی ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زرعی سرمایے دار ادنا ترین زمین پر کاشت کاری میں اپنا سرمایہ نہ لگا کر صنعتی کاروبار میں اپنا سرمایہ منتقل کر دیتا۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ لوگ جو اعلا قسم کی زمینوں پر کاشت کاری میں سرمایہ لگاتے ہیں زیادہ منافع کماتے ہیں؟ ہرگز نہیں! اعلا قسم کی زمینوں کا مالک زمیں دار شروع سے ہی جانتا ہے کہ اُس کی زمین زیادہ زرخیز ہے۔ اس لیے وہ شروع سے ہی زیادہ لگان کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہر ایک زرعی سرمایے دار یہ کوشش کرتا ہے کہ اُس کا سرمایہ اعلا قسم کی زمین پر کاشت کاری میں صرف ہو۔ ان کی یہ کوشش زرخیز زمینوں کی طلب کو بڑھا دیتی ہے اور یہ بڑھی ہوئی طلب زمینوں کے لگان کو بڑھا ڈالتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زائد منافع جو کہ اعلا قسم کی زمین پر کاشت کرنے سے حاصل ہوتا ہے، اونچے لگان کی شکل میں زمیں دار کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ زمینوں کا یہ نوعی اختلاف 'نوعی لگان' کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں نوعی لگان اُس اختلاف سے پیدا ہوتا ہے جو کہ زرعی جنسوں کی پیداوار کی عام لاگت کے درمیان

اور اعلاترین زمین پر انفرادی لاگت کے درمیان ہوتا ہے۔ زراعت میں یہ عام لاگت ادنا ترین زمین پر محنت کی پیداوار سے مقرر ہوتی ہے۔ اس قسم کے نوعی لگان کے علاوہ اس کی چند اور شکلیں بھی ہیں۔ مثلاً منڈی کی نزدیکی، سڑک، ریل اور دریا وغیرہ کی قربت سے بھی نوعی لگان حاصل ہوتا ہے۔ لیکن نوعی لگان کی یہ تمام قسمیں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ سب کے پیچھے وہی ایک اصول کام کرتا ہے جو کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یعنی یہ سب قسم کے نوعی لگان زرعی محنت کی پیداواری طاقت کے اختلاف سے (یعنی زمین کے نوعی اختلاف سے) حاصل ہوتے ہیں۔

ادنا ترین زمین سے بھی لگان حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ لگان نوعی لگان نہ ہو کر محض مطلق لگان ہی ہوتا ہے۔ دوسری طرف اعلاترین زمین سے نوعی لگان بھی حاصل ہوتا ہے اور مطلق لگان بھی۔

مطلق لگان

زمین پر انفرادی ملکیت ایک قسم کی اجارہ داری ہے۔ اجارہ داری اس شکل میں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں دیگر تمام ذرائع پیداوار کی طرح زمین بھی محنت کش طبقے کے ہاتھ میں نہ ہو کر صرف سرمایہ دار طبقے کی ملکیت ہے۔ اس شکل میں تو تمام سرمایہ دارانہ ملکیت ہی اجارہ داری ہے لیکن زمین کی ملکیت ایک اور شکل میں بھی اجارہ داری ہے اور وہ یہ کہ یہ اجارہ داری محض محنت کش طبقے کے خلاف نہیں ہے بلکہ خود ان سرمایہ داروں کے خلاف بھی ہے جو کہ زمیں دار نہیں ہیں۔ ایک سرمایہ دار کے مقابلے پر دوسرا سرمایہ دار نہایت آسانی سے، اگر اس کے وسائل اجازت دیتے ہوں تو نیا کارخانہ کھول سکتا ہے لیکن زمیں دار کے مقابلے پر نئی زمین پیدا نہیں کی جا سکتی اس لیے زمیں دار ایک ایسی چیز کا اجارے دار ہے جو کسی حالت میں بھی کوئی دوسرا نئی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت سے زمیں دار خوب اچھی طرح واقف ہے اور اپنی اس اجارہ دارانہ فوقیت سے فائدہ اٹھا کر وہ بلا اس امتیاز کے کہ زمین اچھی ہے یا بری اس پر لگان حاصل کرتا ہے۔ زمین کی یہ اجارہ دارانہ ملکیت سرمایے کو صنعت سے زراعت کی طرف آزادی کے ساتھ منتقل نہیں ہونے دیتا، جس کی وجہ سے فنی ترقی میں زراعت، صنعت کی نسبت بہت زیادہ پس ماندہ ہے۔ زراعت کی اس پس ماندگی سے وہ سرمایہ جو کہ اس میں لگا ہوا ہے صنعتی سرمایے کی نسبت نیچی ترکیبی ساخت کا ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اتنے ہی سرمایے سے زراعت میں صنعت کی نسبت زیادہ قدر زائد حاصل ہوتی ہے۔ اگر صنعت اور زراعت کے درمیان آسانی سے سرمایہ ادھر ادھر منتقل ہو سکتا ہوتا تو مقابلے کی دوڑ دونوں جگہ منافع کی شرح کو یکساں کر دیتی۔ لیکن زمین کی انفرادی ملکیت نے اس کو ناممکن بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے زراعتی پیداوار اپنی لاگت کی نسبت اونچی قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔ اس طرح حاصل کیا ہوا یہ فاضل منافع زمیں دار کی جیب میں جاتا ہے اور زمین کا مطلق لگان کہلاتا ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ:-

"زمین کا مطلق لگان وہ خراج ہے جو کہ زمیں دار کو (محض اس کی ملکیت کی بنا پر) دیا جاتا ہے۔"

زمین کے لگان کا ماخذ لگان کے متعلق مارکس کا نظریہ، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل بنیادی اصول کو ظاہر کرتا ہے:۔

زمیں دار پٹے پر زمین دیتا ہے، پٹے دار خود بھی سرمایے دار ہوتا ہے جو کہ اُجرتی مزدوروں کے ذریعے کاشت کاری، کان کنی وغیرہ کا دھندا کرتا ہے۔ کاشت کاری کی اس شکل میں یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ زمین کے لگان کا ماخذ کیا ہے جو کہ زمیں دار یا پٹے دار کی جیب میں جاتا ہے۔ اُجرتی مزدور، اپنی ادا نا کردہ محنت سے قدرِ زائد پیدا کرتے ہیں۔ یہ قدرِ زائد پٹے دار کے پاس جاتی ہے جو اس کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک حصّہ وہ خود اپنے پاس رکھتا ہے جس کو وہ اپنے سرمایے کا منافع کہتا ہے اور دوسرا حصّہ جو کہ اس کے اس منافع سے فاضل ہوتا ہے، زمیں دار کو ادا کرتا ہے۔ قدرِ زائد کا یہی دوسرا حصّہ زمین کا لگان کہلاتا ہے۔

اب یہ قطعی واضح ہو جاتا ہے کہ نوعی اور مطلق ہر دو قسم کے لگان، دیگر ہر قسم کی اُس آمدنی کی طرح جو کہ سرمایے دارانہ نظام میں بلا محنت اور بنا کمائے حاصل ہوتی ہے، محض ایک ہی ماخذ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں اور وہ ماخذ ہے قدرِ زائد، یعنی محنت کش طبقے کی اُجرت ادا نا کردہ محنت۔

مارکس کہتا ہے: "زمین کا تمام لگان قدرِ زائد ہے، محنتِ زائد کی پیداوار ہے" (سرمایہ جلد سوم)

لینن کہتا ہے: "لگان کا نظریہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ تمام کی تمام زراعتی آبادی پوری طرح زمیں داروں، زرعی سرمایے داروں اور اُجرتی مزدوروں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ تقسیم بلاشبہ سرمایے داری کے لیے معیاری حالات کی آئینہ دار ہے، لیکن واقعات اس سے کچھ مختلف ہیں"
واقعات جن کی طرف لینن نے اشارہ کیا ہے نہ صرف مختلف ہی ہیں بلکہ انتہائی درجہ پیچیدہ بھی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان پیچیدہ حالات کی وجہ سے اس نظریے کی بنیادی صداقت میں بال برابر بھی فرق آ گیا ہو۔ حالات کی پیچیدگی تو اس کی صداقت کو اور بھی زیادہ واضح کرتی ہے۔ سرمایے دارانہ سماج میں یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ زمیں دار اپنی زمین کو لگان پر دینے کی جگہ اُجرتی مزدوروں کے ذریعے خود ہی کاشت کراتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ زمیں دار بہ یک وقت زمیں دار بھی ہوتا ہے اور پٹے دار بھی۔ زمیں دار کی حیثیت سے اُسے لگان حاصل ہوتا ہے اور پٹے دار کی حیثیت سے اُس سرمایے پر منافع ملتا ہے جو کہ اُس نے زراعتی کاروبار میں لگایا ہے۔ یعنی لگان اور منافع الگ الگ دو جیبوں میں جانے کی جگہ ایک ہی جیب میں چلے جاتے ہیں، دوسرے لفظوں میں مزدوروں کی اُجرت ادا نا کردہ محنت کا حاصل — قدرِ زائد — دو حصّوں میں تقسیم نہ ہو کر ایک ہی جگہ ایک ہی آدمی کے پاس رہ جاتا ہے۔

بسا اوقات یہ پٹے دار، کوئی سرمایہ دار نہ ہو کر غریب کسان ہوتے ہیں جو خود ہی زمین پر کام کرتے ہیں۔ زمین کی قلت کسانوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر قیمت پر اور ہر شرط پر زمیں دار سے زمین حاصل کریں۔ زمیں دار کا لگان ایسی حالت میں مختلف شکلیں اختیار کرتا، کبھی یہ پرتی کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے، کبھی محنت کی شکل میں (زمیں دار کے لیے اُس کے گھر یا کھیت وغیرہ میں کام کر کے) اور کبھی اجنا

کی شکل میں دکل پیداوار کا ایک حصہ دے کر)

اس شکل میں بھی ظاہر ہے کہ لگان کا ماخذ کسان کی محنت کا استحصال ہی ہے۔ کسان اپنی پیداوار کا ایک حصہ لگان کی شکل میں زمیں دار کو دے دیتا ہے اور یہ حصہ بسا اوقات اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کو دے دینے کے بعد کسان اکثر نیم فاقوں کی حالت میں ہی بسر اوقات کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مارکس ایک جگہ لکھتا ہے:-

"کسانوں کے استحصال میں اور صنعتی مزدور کے استحصال میں محض صورت کا ہی فرق ہے۔ حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے"

(فرانس میں طبقاتی جنگ' از مارکس)

زمین کی خرید و فروخت سرمایہ دارانہ ملکوں میں زمین نہ صرف پٹّے پر دی جاتی ہے بلکہ اس کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے۔ زمین کی قیمت کس طرح مقرر ہوتی ہے؟ اس کے لگان سے! کیسے؟ فرض کیجیے کہ کسی زمیں دار کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا ہے جسے وہ پچاس روپے سالانہ فی ایکڑ کے حساب سے لگان پر دیتا ہے۔ اب اگر وہ ایک ایکڑ زمین بیچنا چاہتا ہے تو اس کے لیے کیا قیمت طلب کرے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ اس کی قیمت مقرر کرتے وقت کچھ اس طرح حساب لگائے گا:-

اگر یہ زمین میرے پاس ہی رہتی تو مجھے پچاس روپے سالانہ لگان ملتا رہے گا۔ اب اگر میں اس کو بیچتا ہوں تو بہر صورت میری سالانہ آمدنی میں—— ان پچاس روپیوں میں —— کمی نہیں آنی چاہیے۔ اس ایک ایکڑ زمین کے عوض مجھے اتنا روپیہ ملنا چاہیے جس کا سود پچاس روپے سالانہ آتا رہے۔ اب فرض کیجیے کہ بینک پانچ روپے سیکڑہ سالانہ سود ادا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زمیں دار اپنی زمین کی قیمت ایک ہزار روپے فی ایکڑ مقرر کرے گا کیوں کہ ایک ہزار روپیہ بینک میں جمع کر دینے سے اس کی اس پچاس روپے سالانہ آمدنی میں فرق نہیں پڑتا جو کہ اُس کو لگان کی صورت میں فی ایکڑ زمین سے حاصل ہوتی تھی۔

زمین کی قیمت دراصل اُس کا وہ لگان ہی ہے جو کہ سرمایے کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

اس سے ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ زمین کی کوئی قدر نہیں ہوتی کیوں کہ یہ انسانی محنت کی تخلیق کردہ نہیں ہے۔ اس کی محض قیمت ہوتی ہے اور وہ بھی اس لیے چوں کہ اس پر زمیں داروں کا اجارے دارانہ قبضہ ہے۔ زمین کی یہ قیمت " زر کی شکل میں قدر کا اظہار" نہیں ہوتا جیسا کہ صنعتی جنسوں کا ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے زمین کی خرید میں لگا ہوا سرمایہ صحیح معنوں میں کاروباری سرمایہ نہیں ہوتا۔ یعنی ایسا سرمایہ نہیں ہوتا جس سے پیداواری ترقی میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہو یا جس کے اندر تخلیقی صلاحیت ہو۔ یہ سرمایہ تو محض ایک خراج ہے جو کہ سماج زمیں داروں کو ان کی اجارے دارانہ حیثیت کی وجہ سے ادا کرنے کے لیے مجبور ہے۔ زمین کی خرید میں لگا ہوا سرمایہ، سماجی پیداوار کے نقطۂ نظر سے، ایک بہت بڑا نقصان ہے، کیوں کہ سماج کے پیداواری عمل میں سے نکال کر ہی تو یہ خطیر رقم زمیں داروں کو ادا کی جاتی ہے۔ زمین کا نیا مالک یہ سمجھ سکتا ہے کہ زمین کی آمدنی کی شکل میں وہ اپنے سرمایے کا سود حاصل کر رہا ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ کیوں کہ یہ آمدنی تو فت

بغیر اس رقم کے خرچ کیے ہوئے بھی حاصل ہو سکتی تھی۔ یہ آمدنی تو زمین کا وہ لگان ہے جو اس سے ہمیشہ حاصل ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ پُونجی کا سود نہیں ہے۔ اس سرمایے نے اُس میں کچھ بھی نیا پیدا نہیں کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سرمایہ بے کار ضائع ہو گیا ہے۔ مارکس لکھتا ہے :۔

"وہ سرمایہ جو کہ زمین کی خریداری میں خرچ ہوتا ہے، زراعتی کاروبار کی ترقی میں صرف نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تو اُس سرمایے کی اضافی تخفیف ہے جو کہ کاشت کار اپنے پیداواری عمل میں لگا سکتا تھا۔ اس تخفیف کی وجہ سے کاشت کاروں کے ذرائع پیداوار میں تخفیف پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کی مکرر پیداوار کے لیے معاشی میدان تنگ ہو جاتا ہے . . . . . یہ زراعت کی ترقی کے راستے میں بہت بڑی رُکاوٹ ہے . . . . . اور سرمایے دارانہ طریقۂ پیداوار کی صریحاً ضد ہے . . . ." (سرمایہ، جلد سوم)

——— ✻ ———

صنعت

کپڑے کی قلّت

از : ——— منورنجن چودھری

اس وقت دُنیا کا کوئی مُلک یہ دعوا نہیں کرسکتا کہ وہ قلّت کا سامنا نہیں کررہا ہے۔ ہندُستان، چین اور دوسرے ایشیائی ممالک جو دُنیا میں غلّے اور دیگر چیزوں کی پیداوار کے لیے مشہور تھے اور ہیں قلّت کی ہول ناک گرفت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے مُلک کی اور بھی عجیب حالت ہے۔ ہندُستان شاید دنیا کا واحد مُلک ہے جہاں ایک گز کپڑے کے لیے لوگوں کو خودکشی کرتے ہوئے پایا گیا ہے۔ یہ بات ہمارے سامنے ایک عجیب متضاد نقشہ پیش کرتی ہے۔ جو مُلک دوسرے مُلکوں کو کپڑا پہناتا رہا ہے اور جہاں اتنی روئی پیدا ہوتی ہے کہ دوسرے ملکوں کی ضروریات اس سے پوری ہوتی ہیں آج خود وہی ملک کپڑے کی قلّت کا سامنا کر رہا ہے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے جب کہ ہندُستان میں مشینیں نہیں آئی تھیں ہاتھ سے اتنے کپڑے بُنے جاتے تھے کہ پورے مُلک کی ضروریات کے لیے کافی ہوتا تھا اور آج مشینوں اور کام کرنے والوں کے باوجود کپڑے کی قلّت ہے۔

ہندُستان میں سوتی مل

ہندُستان میں سب سے پہلی سوتی مل ۱۸۱۸ء میں کلکتہ کے نزدیک فورٹ گلوسٹر میں قائم ہوئی تھی۔ لیکن صحیح معنوں میں اس ملک میں سوتی کپڑے کی صنعت اس وقت سے شروع ہوئی جب ۱۸۵۱ء میں بمبئی میں ایک مل قائم ہوئی۔ اس مل کا نام بمبئی اسپننگ اینڈ ویونگ مل تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد بمبئی اور احمد آباد میں اور ملیں قائم ہوئیں۔ ان ملوں سے کافی اونچی شرح پر منافع حاصل ہوتا تھا چناں چہ اس صنعت میں سرمایہ لگانے والوں کی تعداد بڑھتی گئی اور یہ کاروبار ترقی

اکر گیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ہندستان میں ۱۹۵ سوتی ملیں قائم ہو گئیں جن میں مجموعی طور پر ۱۴،۱۹۵،۰۰۰ روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ ان ملوں میں مجموعی طور پر ۳۶،۰۰۰ لوم اور ۴،۹۴۶،۰۰۰ اسپنڈل کام کر رہے تھے۔ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۱ء کی سودیشی تحریک نے ہندستان میں سوتی مل کی صنعت کو بہت آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۲۶۴ تک پہنچ گئی۔ اس میں مجموعی طور پر ۲۰،۱۴۰،۰۰۰ روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ ان ملوں میں کل ملا کر ۹۰،۲۶۸ لوم اور ۶،۷۷۸،۰۵۸ اسپنڈل کام کر رہے تھے۔

پہلی عالمگیر جنگ کے شروع ہونے سے کچھ پہلے ہندستان نے سوتی صنعت کے لحاظ سے اتنی ترقی کر لی کہ دُنیا میں اس کا شمار چوتھے نمبر پر ہونے لگا۔ پہلا نمبر برطانیہ کا تھا، دُوسرا امریکہ کا اور تیسرا جرمنی کا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو دُشمن مُلکوں سے کپڑے کی درآمد بند ہو گئی جس سے ہندستان میں اس صنعت کو اور بھی شہ ملی۔ جنگ کے اخیر تک ہندستان میں سوتی صنعت کو اس قدر نشوونما حاصل ہوئی کہ اس سے ۳۰ فی صدی منافع ہونے لگا۔ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء میں ہمارے ملک کی سوتی صنعت پر سے عالمگیر معاشی بحران کے اثرات دُور ہونے لگے اور مُلکی اور غیر مُلکی بازاروں میں پھر سے ہندستانی کپڑے کی کھپت بڑھنے لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چین اور جاپان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی اور جاپان سے کپڑے کی درآمد گھٹ گئی تھی۔ جاپانی مال کی درآمد کے کم ہونے سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کا بھرنا لنکاشائر کے لیے غیر ممکن تھا اس لیے کہ مین چسٹر کے بنے ہوئے مال کی قیمت زیادہ تھی۔ چناں چہ پہلے جن بازاروں پر جاپان کا اجارہ تھا ان پر بہت آسانی کے ساتھ ہندستان نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۹ء کے شروع کا زمانہ ہندستان کی سوتی صنعت کے لیے کچھ اچھا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چیزوں کی قیمت بہت گھٹ گئی تھی۔ قیمتوں کے گھٹنے کا خراب اثر سوت اور پیس گُڈ پر پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ کپڑے کی مانگ گھٹ گئی۔ اور صنعت کو زبردست نقصان پہنچا۔ بمبئی جو کہ ہندستان میں سوتی صنعت کا مرکز سمجھا جاتا ہے وہاں اس صنعت کے راستے میں کئی مشکلات اور رُکاوٹیں حائل ہو گئیں۔ مثلاً مزدوری میں اضافہ اور غیر منقولہ جائداد کا ٹیکس وغیرہ۔

"روئی کی درآمد پر ایک اور محصول بڑھا دیا گیا اور لنکاشائر سے جو پیس گُڈ آتا تھا اس کے درآمدی محصول کو گھٹا دیا گیا۔ اس نازک صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ خیال پیدا ہوا کہ پیداوار کو گھٹانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن ٹھیک اُسی وقت دُوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی اور چند ماہ کے بعد حالات بالکل بدل گئے۔"　　　کوٹن ٹیکسٹائل اینوئل ۱۹۴۲ء م۔ پ گاندھی

وہی مصنف سوتی کپڑے کی صنعت پر اپنی ۱۹۴۲ء کی رپوٹ میں لکھتا ہے کہ

"جنگ کے زمانے میں سوتی صنعت میں اصلی تبدیلی اس وقت سے شروع ہوئی جب اکتوبر ۱۹۴۱ء میں ایسٹرن گروپ سپلائی کونسل قائم ہوئی۔ یہ کونسل اکتوبر ۱۹۴۰ء میں دہلی میں منعقد ہونے والی ایسٹرن گروپ کونسل کے فیصلے سے قائم ہوئی تھی۔ ہمارے مُلک کی بہت سی صنعتوں کا نقطۂ نظر اُس وقت سے بدلنا شروع ہوا جب مشرقِ وسطیٰ کے جنگی محاذ کی اہمیت بڑھنے لگی۔ ہندستان کا جغرافیائی اور جنگی محلِ وقوع بہت اہم تھا اس چیز نے دیگر ہندستانی صنعتوں کی اہمیت بھی بڑھا دی۔ ایسٹرن گروپ سپلائی

کونسل میں جتنے ممالک شامل ہیں اُن میں ہندستان سب سے بڑا ہے۔ جناں چہ پورے ایسٹرن گروپ اور ہندستان میں جو سوتی کپڑے کی فوجی ضروریات ہیں ان کا بڑا حصّہ ہندستان پورا کر رہا ہے۔"

"اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ کے زمانے میں ہماری سوتی صنعت کی ترقی سنہ ۱۹۴۰ء کے آخری تین ماہ سے شروع ہوئی اسی زمانے سے پیداوار بڑھنے لگی ہے۔"

غرض عالم گیر بازار میں ہندستان کے سوتی کپڑے بڑی مقدار میں فروخت ہوئے اگرچہ جنگ کے زمانے میں کوئلے کی قلّت اور سوت کی کمی کے باعث بہت سی ملیں بند بھی ہوگئیں۔ بہ ہرحال ہمارے ملک میں اتنی ملیں ہیں کہ اگر سوت مسلسل طور پر ملتا رہے تو مجموعی پیداوار آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھائی جاسکتی ہے۔

مصنف آگے چل کر کہتا ہے کہ ملک میں کپڑے کی پیدائش کو بڑھانے کا بس ایک اور طریقہ ہے اور وہ یہ کہ زیادہ سوت پیدا کیا جائے اور اس کے لیے اسپننگ سیکشن میں روزانہ تین شفٹوں میں کام کرایا جائے۔

۳۱ر اگست سنہ ۱۹۴۴ء کو ہندستان کے مختلف صوبوں میں جتنی ملیں موجود تھیں اُن کے اعداد یہ ہیں:-

بمبئی	۲۰۹
راجپوتانہ	۸
برار اور سی پی	۱۱
بہار اور اُڑیسہ	۲
میسور	۸
حیدرآباد	۶
مرکزی ہندستان	۱۷
بنگال	۳۷
پنجاب	۹
پانڈی چیری	۳
دہلی	۶
یو۔پی	۳۰
مدراس	۶۹
ٹراونکور	۲
	۴۱۷

ہندستان میں روئی کی پیداوار ۱۹۴۱-۴۲ء میں دُنیا میں ۲۵۶۴۳۰۰۰ گانٹھ روئی پیدا ہوئی تھی۔ دنیا میں سب سے زیادہ روئی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پیدا ہوتی ہے، اس کے بعد ہندستان کا نمبر آتا ہے۔ ہندستان میں روئی کی سالانہ پیدائش ۴۵۵۴۰۰۰ گانٹھ ہے۔

اگر ہندستان میں کپڑے کی ضرورت کا اوسط تخمینہ ۱۶ گز فی کس کے حساب سے کیا جائے تو ۴۰ کروڑ افراد کے لیے ۶ ارب ۴۰ کروڑ گز کپڑے کی سالانہ ضرورت ہوگی۔ لیکن ہندستان میں کپڑے کی پیدائش سے متعلق اعداد و شمار مندرجۂ ذیل ہیں:-

برآمد گھٹانے کے بعد ہندستانی ملوں کی مجموعی پیداوار	۳۸۰۰۰۰۰۰۰۰ گز
ہینڈلوم کی پیداوار کا تخمینہ	۱۶۵۰۰۰۰۰۰۰ گز
کھادی کا تخمینہ	۱۲۰۰۰۰۰۰ ″
صرف کے لیے جو موصول ہوتا ہے	۵۵۴۲۰۰۰۰۰۰ ″

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کپڑے کی برآمد روک دی جائے تو ہمیں ۶۰۰۰۰۰۰۰۰ گز مزید کپڑا مل سکتا ہے۔ جنگ سے پہلے ہندستان میں ۴۲۰۰۰۰۰۰۰۰ گز کپڑا پیدا ہوتا تھا۔ یہ شمار برآمد کے اعداد گھٹا دینے کے بعد ہوتا ہے، اور اس میں مل کا کپڑا اور کھادی دونوں شامل ہیں۔ اس میں وہ کپڑا بھی نہیں شامل کیا گیا ہے جو فوجی ضرورت کے لیے ملک معظم کی حکومت نے ہندستان سے خریدا اور جو جنگ کے ابتدائی زمانے میں ۳۰ فی صدی کے قریب تھا اور آج سے کچھ عرصے پہلے ۲۰ فی صدی۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کپڑے کی قلت کو دور کرنے کے لیے حکومت نے کچھ کارروائی بھی کی تھی۔ برآمد پر بھی پابندی بٹھائی گئی اور حکومت کے بہ قول فوجی ضروریات کو بھی گھٹانے کی کوشش کی گئی۔ جب ہمارے سامنے یہ نقشہ ہے تو پھر کپڑے کی قلت کیوں ہے؟

اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو اس وقت ہندستان میں کہیں بھی کپڑے کی قلت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر کپڑے کی قلت کی وجہ محض سوت کی قلت ہے تو اُسے آسانی سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اسپننگ سیکشن میں روزانہ تین شفٹوں میں کام کرایا جائے۔ ۶۴۰۰۰۰۰۰۰۰ گز کپڑا چالیس کروڑ باشندوں کے لیے یقیناً پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہاتھ سے سوت کاتنے کے کام کو بھی آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ایک آدمی روزانہ دو گھنٹے سوت کاتنے میں صرف کرے تو وہ آسانی کے ساتھ روزانہ ۱۵۰ گز سوت کات سکتا ہے۔ اگر ۱۰ کروڑ آدمی بھی سال میں ۳۰۰ دن سوت کاتیں تو ایک سال میں، ۱۵۰ گز روزانہ کے حساب سے ۹۰ کھرب گز سوت پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ۲۰۰ گز سوت سے ایک گز کپڑا تیار ہوتا ہے تو ۷ ارب ۵ کروڑ گز کپڑا پیدا کیا جا سکتا ہے۔

بنگال کے دیہاتوں میں سوت نہ ملنے کے باعث جُلاہوں نے اپنا کام روک دیا ہے۔ ان کے پاس سوت کاتنے کے لیے کافی روئی بھی نہیں ہے۔ اس لیے انھیں روئی مہیا کرنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ سوت کاتنے کی اہم صنعت بند نہ ہو جائے۔ یہ کچھ مشکل نہیں اس لیے کہ ہندستان میں ضرورت سے فاضل روئی پیدا ہوتی ہے۔ اگر سوت کاتنے کا کام آگے بڑھایا جائے تو اسپنڈلا میں کم طاقت خرچ ہوگی۔ اس طرح ہاتھ سے سوت کاتنے سے نہ صرف اس وقت ملک کی ایک اہم ضرورت پوری ہوتی ہے بلکہ طاقت کا خرچ بھی کم ہوتا ہے۔

(ماڈرن ریویو)

معاشی صورتِ حال

۱۔ کُل ہند معاشیاتی کانفرنس

۲۔ زرعی معاشیاتی کانفرنس

۳۔ غذا

کُل ہند معاشیاتی کانفرنس

کُل ہند معاشیاتی کانفرنس ۳۰ر دسمبر سے کراچی میں شروع ہوئی جس میں الہ آباد یونی ورسٹی کے پروفیسر ایس۔ کے۔ رودرا نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ملک کے معاشی مسائل پر چند اہم خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر رودرا نے جو کچھ کہا وہ مختصراً یہ ہے:۔

"موجودہ حالات میں ہم مُلک کی تمام تر معیشت کو ریاست کے حوالے نہیں کرسکتے اور نہ اُسے پُورے طور پر ذاتی اور انفرادی کاروبار کے رحم وکرم پر چھوڑ سکتے ہیں۔ ہماری معاشی زندگی میں ہر چیز کا ایک مناسب انداز میں وجود رہنا چاہیے، ریاستی ملکیت، ذاتی مِلکیت، امدادِ باہمی اور جماعتی ملکیت ان تمام چیزوں کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مقابلے کی صورت میں ذاتی کاروبار سے اشیا کی پیدائش کا کام زیادہ خوبی سے انجام پاتا ہے۔ ریاست سیاسی میدان میں چاہے سب پر حاوی ہو لیکن معاشی میدان میں اس کو ساری طاقت سونپ دینا کچھ ٹھیک نہیں ہندُستان میں معاشی زندگی اور کاروبار پر ریاست کی نگرانی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسی حالت میں اس بات کی سخت ضرورت [illegible] امورِ انتظامیہ میں اعلا سائنسی اور علمی مشورے کا دخل ہو۔ آج کل یونی ورسٹیوں میں معاشیات کی تعلیم کا طریقہ غلط ہے۔ ضرورت ہے کہ ایک چھوٹی سی نمایندہ کمیشن مقرر کی جائے جو یونی ورسٹیوں میں معاشیات کی تعلیم اور ریسرچ کے موضوع پر غور وخوض کرے۔ سماجی علوم اور معاشیات کے موضوعات پر ریسرچ کے ادارے قائم کیے جائیں۔

ہندستان کو نہ صرف اپنے صنعتی ذرائع بلکہ زرعی وسائل و ذرائع کو بھی وسیع کرنا ہے۔ ہمیں زمین کو زیادہ پیداآور اور مویشی کو زیادہ صحت مند بنانے میں کسانوں کی مدد کرنی ہے، ساتھ ہی اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ زرعی اشیا کی اقل ترین قیمت مقرر کردی جائے تاکہ قیمتوں کے بہت زیادہ گھٹ جانے کی صورت میں کسان مالی بدحالی کا سامنا نہ کریں۔ کسانوں مزدوروں اور کھیت مزدوروں کے تحفظ کے لیے ہمیں راشن بندی سے کام لینا ہے۔ زمین کے لگان میں رد و بدل اور زمین داری کے خاتمے پر غور کرنا ہے۔ گوشت، کھال اور چمڑے کی تجارت کی تنظیم کرنی ہے۔ امدادِ باہمی کسانوں کی معاشی طاقت کو بڑھانے اور مستحکم بنانے کا واحد ذریعہ ہے۔ روس میں جو یا ستی کھیت اور اجتماعی کاشت کاری کی اسکیمیں رائج ہیں وہ ہندستانی دیہاتوں کی زندگی اور کام کرنے کے طریقوں کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ دیہی علاقوں میں مکانات کے مسئلے پر بھی ہمیں توجہ کرنی ہے۔

ذرائع رسل و رسائل خاص کر ہوائی آمد و رفت کی توسیع و ترقی ملکی معیشت کو سدھارنے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ ہندستان کو عالم گیر ہوائی سروس اور سمندری آمد و رفت میں بھی مناسب حصہ لینا چاہیے۔ اس کے لیے جہازی بیڑوں کی تعمیر ضروری ہے۔

ایشیائی ملکوں سے گہرے تجارتی رشتوں کا قائم رکھنا ضروری ہے، اس کام کے لیے تمام بڑے بڑے ایشیائی ملکوں میں تجارتی کمشنر مقرر کیے جائیں خاص کر ان ملکوں میں جو ہندستان کی سرحدوں پر واقع ہیں۔ خارجی تجارت سے متعلق ہماری پوری پالیسی خود ہماری اندرونی ضرورتوں سے متعین ہوگی نہ کہ کسی غیر ملکی طاقت کی ضرورتوں سے۔ کچے مال کے عوض میں ہندستان کو دوسرے ملکوں سے مالی اور فنی امداد اور مشینیں اور کلیں منگانی پڑیں گی۔ اس سلسلے میں باہمی امداد اور تعاون سے کام لیا جائے گا۔ محصولات سے متعلق ہماری پالیسی کا مقصد یہ ہوگا کہ ہماری صنعت و تجارت کا تحفظ ہو سکے۔ اس کا مقصد محض حکومت کی آمدنی میں اضافہ کرنا نہیں ہوگا۔ تجارتِ خارجہ اور مبادلۂ زر پر حکومت کی نگرانی ہونی چاہیے۔ سونے خاص کر چاندی کی قیمتوں کو مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔

اسٹرلنگ قرضے کا معاملہ جس قدر جلد طے پا جائے بہتر ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ہندستان میں جو برطانوی سرمایہ کاروبار میں لگا ہوا ہے اس کا فروخت کیا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ اور اگر ہندستان میں برطانوی سرمایے کو ختم کرنا ہی لازم ہے تو بہتر یہ ہے کہ اُسے ریاست کی ملکیت بنا دیا جائے۔

مزدوروں اور مالکوں میں تعاون اور اشتراکِ عمل ہونا چاہیے۔ مزدور لیڈروں کو چاہیے کہ وہ صنعتوں کے کام میں خلل نہ پیدا کریں اور اشیا کی پیدائش میں اضافہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ صنعتی مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لیے سماجی تحفظ کی اسکیمیں عمل میں لائی جائیں مثلاً بڑھاپے کی پنشن اور لاچاری کے معاوضے وغیرہ دیے جائیں۔"

زرعی معاشیاتی کانفرنس میں خطبۂ صدارت

جنگ کے ختم ہونے کے بعد یہ امید کی جارہی تھی کہ مُلک کی معاشی حالت سُدھر جائے گی۔ لیکن یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ جنگ کے زمانے میں جو افراطِ زر کے رجحانات کام کر رہے تھے وہ اب تک جاری ہیں۔ زندگی کے اخراجات بڑھتے جارہے ہیں جس کے باعث مزدوروں میں بے چینی اور بے اطمینانی کی لہر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ متوسط طبقے کے تنخواہ پانے والوں میں یہ بے چینی پھیل گئی ہے اگر افراطِ زر کو نہیں روکا گیا تو ہماری مشکلات کے اور بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

ابتدائی ضروریات کی جو چیزیں ہیں ان کی خاص طور پر کمی ہے جیسے تیار کپڑا اور دیگر تعمیرات کی چیزیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عوام پر بہت بوجھ پڑ رہا ہے۔ ہماری قوتِ پیدائش کم زور ہے اس لیے کوئی چارۂ کار بھی نظر نہیں آتا۔ کافی کوئلہ نہیں پیدا ہونے کے باعث صنعت میں بڑی رُکاوٹ پیدا ہورہی ہے۔ خاص کر کپڑے کی صنعت میں۔ ہمیں نئی مشینیں اور کلیں بھی نہیں مل رہی ہیں۔ دوسرے مُلکوں سے صرفی اشیاء کے آنے کے امکانات اب کھُل گئے ہیں۔ لیکن وہ چیزیں ہماری زندگی کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتیں۔

غذائی قلت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے سنہ ۱۹۴۶ء کے شروع میں یہ معلوم ہوا کہ مُلک میں ۷ لاکھ ٹن غلّے کی کمی ہے۔ یہ قلت اُس وقت رونما ہوئی جب غلّے کی سپلائی کی حالت جنگ کے باعث پہلے ہی سے خراب تھی۔ راشن بندی اور غلّے کی جبری وصولی سے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی گئی اور راشن میں بھی ایک پونڈ سے ۱۲ آونس کی کمی کردی گئی۔ بعض جگہ تو صرف ۸ اونس راشن ملنے لگا۔ کم غذائیت کی وجہ سے نچلے اور متوسط طبقے کی صحت پر خراب اثر پڑا۔ گزشتہ ۷ سال کے عرصے میں ہندُستان میں فی کس خوراک میں ڈیڑھ پونڈ سے ایک پونڈ کی کمی ہوئی اور اب خوراک ۱۲ آونس ہے۔ اگر اس طرح آبادی ہر سال ۵۰ لاکھ بڑھتی رہی تو ہر ۱۰ سال پر ہماری غذائی صورتِ حال بدتر ہوتی جائے گی۔ جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد زیادہ غذا پیدا کرنے کی تحریک چلائی گئی جس سے غلّے کی مقدار میں ۲۰ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا اور کوئی ۸ کروڑ رُپے خرچ ہوئے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پوری زرعی پالیسی کو اس طرح بدلا جائے کہ زمین سے زیادہ سے زیادہ پیدا ہو اور لوگوں کے پاس اتنی قوتِ خرید ہو کہ وہ ضرورت کی تمام چیزیں خرید سکیں۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ اب زمیں داری کو اُٹھایا جارہا ہے اور خود کاشت کار کو اپنی زمین کا مالک بنایا جارہا ہے۔ اس طرح وہ اپنی زمین پر زیادہ سے زیادہ محنت کرسکے گا اور پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ کافی نہیں ہے ایسے کاشت کاروں کو بھی زمین سے ہٹا دیا جائے جو کاشت کاری پوری توجہ اور محنت سے نہیں کرسکتے، جن کے پاس کاشت کاری کے سامان بھی نہیں ہیں اور نہ جن کے اندر اس پیشے کو اختیار کرنے کا میلان ہے۔

ہندُستان میں زرعی توسیع و ترقی کے لیے پلان بنانے میں جو سب سے بڑی دقت حائل ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کافی اعداد و شمار موجود نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل موجود نہیں ہیں۔ ہندُستان میں معاشی حالت اور اعداد و شمار سے متعلق تحقیق و تفتیش

کے کام کو بالکل اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ اس وقت ہر صوبائی حکومت کے پاس لوگوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے اور زراعت کی از سرِ نو تنظیم کرنے کا پروگرام ہے۔ لیکن اعداد و شمار کے بغیر اس کا عمل میں لانا غیر ممکن ہے۔ سوائے پنجاب اور بنگال کے نہ تو مرکز میں اور نہ صوبے میں کوئی ایسا ادارہ ہے جو معاشیاتی تحقیق و تفتیش کا کام انجام دے رہا ہو۔ امپیریل کونسل آف ایگری کلچرل ری سرچ کا دائرۂ عمل صرف فنی باتوں تک محدود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ یہ کمیٹی جو تجاویز پیش کرے اُن کی روشنی میں حکومت امپیریل کونسل آف ایگری کلچرل ری سرچ کے دائرۂ عمل کو اور وسیع کر دے۔ ہندستان میں زرعی تحقیق و تفتیش کے بہت محدود معنی لیے جاتے ہیں چناں چہ ان سرکاری محکموں کا کام صرف چند باتوں تک محدود ہے مثلاً زمین کی پیداآوری کو بڑھانا، زیادہ اچھا کھاد اور بیج تیار کرنا، کاشت کاری کے طریقوں کو بہتر بنانا اور زیادہ اچھے آلات کے استعمال کا پرچار کرنا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان چیزوں کی بھی بڑی اہمیت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی زرعی ترقی کے پروگرام کو اور بھی زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ چیزیں بھی اس کے اندر آجائیں۔ چناں چہ زراعتی طبقوں کے حالات کی تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے فنی ری سرچ اور معاشیاتی ری سرچ دونوں کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ صوبوں میں بھی یونی ورسٹیوں اور غیر سرکاری اداروں کے تحت اس قسم کی تحقیق و تفتیش کا کام شروع ہونا چاہیے تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں صوبائی حکومتوں کے کام میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور اس کی نگرانی کرنے کے لیے مرکز میں ایک محکمہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

دیہی تنظیم و ترقی کو عمل میں لانے کے لیے سب سے ضروری یہ ہے کہ خود دیہات والوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔ "زیادہ غذا پیدا کرو" کی تحریک صرف اس لیے زیادہ کام یاب نہ ہو سکی کہ حکومت نے کاشت کاروں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی مثال کی طور پر غیر غذائی اشیا کی پیداوار کو روکنے کے لیے اور غذائی اشیا پیدا کرنے والے کھیتوں کا رقبہ بڑھانے کے لیے حکومت نے کچھ ایسی زبردستی سے کام لیا کہ کاشت کار بدظن ہو گئے۔ اسی طرح فنی اصلاح و ترقی کی کوششیں جو حکومت کی طرف سے کی گئیں بھی زیادہ تر ناکام یاب ہی رہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسانوں کے تعاون اور ہم دردی کے بغیر کام یابی نہیں حاصل کی جا سکتی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ پورے ملک میں خود گانو والوں کی ایسی انجمنیں بنائی جائیں جو ایک طرف تو کسانوں کو نئی اصلاح و ترقی کا فائدہ بتائیں اور دوسری طرف خود حکومت کو کسانوں کی ضرورتوں اور شکایتوں سے مطلع کرتے رہیں تاکہ ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

غرض ملک کے سامنے فوری مسئلہ یہ ہے کہ غذا کی پیداوار بڑھائی جائے اور اُسے ہر طبقے کے لوگوں تک آسانی سے پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔ اس کے لیے ایسے طبقوں کے ہاتھ سے زراعت کو نجات دلانی ہے جو خود کاشت کاری کے کام میں پوری توجہ سے حصہ نہیں لیتے اُس کے بعد اعداد و شمار فراہم کرنے کا کام بڑے پیمانے پر چلانا ہے اور معاشیاتی تحقیق و تفتیش کے کام کو اس طرح پھیلانا ہے کہ

ملنے کا پتا، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

عرضِ مرتب اور غلام احمد پرویز صاحب کے "پیش رس" کے بعد اس کتاب میں علامہ اقبال مرحوم کے تین خطبات ہیں: خطبۂ صدارت کل ہند اجلاس مسلم لیگ الہ آباد، دسمبر ۱۹۳۰ء، خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس اجلاس منعقدہ لاہور، ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء، ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔

علامہ اقبال کے سیاسی افکار کو جاننے کے لیے ویسے تو ان کے کلام سے استفادہ لازمی ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ کافی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں علامہ مرحوم کے نثری مضامین اور خطبات کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے جن میں انھوں نے صاف اور کھلے الفاظ میں اپنے سیاسی خیالات و نصب العین کا اظہار کیا ہے۔ موجودہ کتاب کی یہی اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں پہلا خطبہ سب سے اہم ہے جس میں اسلام اور قومیت، قومیتِ ہند کا اتحاد وفاق اور ہندی مسلمانوں کے سیاسی نصب العین جیسے اہم اور بنیادی موضوعات پر علامہ مرحوم کے خیالات و افکار کی تشریح ملتی ہے۔ لیکن کتاب کے شروع میں چودھری غلام احمد پرویز صاحب کا "پیش رس" ان خطبوں کے ساتھ کچھ جوڑ نہیں کھاتا اس لیے کہ اپنے بے حد طویل پیش لفظ میں انھوں نے علامہ اقبال پر کچھ ایسی باتیں چپکانے کی کوشش کی ہے جن کی ممکن ہے علامہ مرحوم کی روح کو بھی خبر نہ ہو یا جو پرویز صاحب کے اپنے افکار ہیں۔ پھر علامہ مرحوم کوئی اتنے چھوٹے موٹے آدمی بھی نہ تھے کہ ان کے خطبات کو پبلک کے سامنے پیش کرتے ہوئے اتنے لمبے چوڑے تعارف کی ضرورت تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ کتاب بغیر اس پیش لفظ کے چھپ جاتی تو زیادہ مناسب بات ہوتی۔

رائے کے مضامین | مندرجہ ذیل عنوانات پر ام۔ ان۔ رائے کے مضامین کا مجموعہ ہے: فلسفیاتی انقلاب، مذہب اور توہم، تیاگ اور نفس کشی، ہندو فلسفے کا الحاد، مارکسیت کیا ہے، مارکسیت اور اخلاقی فلسفہ، مسلکِ عدم تشدد، سائنس اور فلسفہ۔ شائع کردہ مکتبۂ اردو، لاہور۔ حجم ۶۲ صفحات، چھپائی نہایت اعلا اور نفیس۔ ام۔ ان۔ رائے نے ان فلسفیانہ موضوعات پر مارکسی اور سائنسی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔ فلسفے کے طالب علم کے لیے یہ کتاب خاص طور پر دل چسپ اور مفید ہے۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتا: مکتبۂ اردو، لاہور۔

قلمی صنعت میں جدید رجحانات کی داغ بیل ڈالنے والا

فلم، آرٹ اور ادب کا اردو ماہ نامہ

ترتیب دینے والے:-

ملک حسیب احمد
فکر تونسوی
ممتاز مفتی

ہندستانی فلم سازی رجعت اور فرسودگی کے دلدل میں پھنسی ہے۔ فلم آرٹ کو ترقی پسندانہ اور صحت بخش رہ نمائی کی ضرورت ہے۔

فلمان —— اس ضرورت کی فن کارانہ تکمیل کرے گا۔

فلمان —— اس اہم فن کو سماجی افادیت، ذہنی بلندی اور تمدنی ارتقا کے لیے استعمال کرنے کی تکنیک سجھائے گا۔

فلمان —— سائنس، فلسفہ، نفسیات اور ادب کی گہرائیوں کو فلم آرٹ میں سموئے گا۔

اس میں

ملک کی نام ور اور ترقی پسند دماغی قوتیں حصہ لیں گی

منفرد زاویۂ نگاہ رکھنے والے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی تخلیقات پیش کی جائیں گی۔

تنقید کا بے لاگ اور اچھوتا معیار دکھائی دے گا۔

فلمان زندگی اور فن کی بچھڑی ہوئی راہوں کو ملائے گا۔

فلمان عوامی انقلاب کے لیے بنتے ہوئے عناصر کو پروان چڑھائے گا۔

فلمان نئے فلم سے نئے ہندستان کی تعمیر کرے گا۔

فلمان ادب اور فلم کو ایک سنگم پر لا کھڑا کرے گا۔

اشاعتی محاسن سے مزین۔ نادر مضامین سے آراستہ۔ آرٹ پیپر تصاویر۔ بہترین لکھائی۔ اعلا چھپائی۔

پہلے نمبر کا انتظار کریں!

مکتبہ جدید
لاہور

انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) کا ماہانہ معاشی رسالہ

معاشیات

ایڈیٹر

طفیل احمد خاں، ایم اے

'ہماری زبان'

انجمنِ ترقّیٔ اُردُو (ہند) دہلی کا پندرہ روزہ اخبار

ہر ماہ کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہی

سالانہ چندہ ۲ دُو رپے۔ قیمت فی پرچہ ۲ دُو آنے

ہندُستان بھر میں اُردُو سے متعلق تمام واقعات اور خبریں، اُردُو کے دوستوں کی کارروائیاں اور اُردُو کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں سب بہ یک وقت اِس اخبار میں مِل جاتی ہیں۔ ہر اُس شخص کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہی جسے اُردُو کی ترقّی اور ترویج سے دِل چسپی ہی۔

مِلنے کا پتا

لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی دروازہ، دہلی

معاشیات

جلد ۲ مارچ ۱۹۴۷ء نمبر ۳

فہرستِ مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱ -	نئی حکومت نیا بجٹ	اڈیٹر	۲
۲ -	ہندستان کی صحتِ عامّہ اور معاشی ترقی	پروفیسر عطاء اللہ	۶
۳ -	منصوبے بندی اور جمہوریت	پروفیسر برج نرائن	۱۳
۴ -	عالم گیر بازار اور قیمتیں	ایملی برنس (مترجمہ حمیدہ نقوی)	۲۱
۵ -	سرمایہ کاری اور اجتماعی ملکیت	ی۔ کیسیموسکی	۲۶
۶ -	بے روزگاری	مظہر ح۔ یوسف	۲۹
۷ -	معاشی صورتِ حال	ابو سالم ایم۔ اے (علیگ) و ادارہ	۳۴

اداریہ

نئی حکومت نیا بجٹ

از: ——— اڈیٹر

اگرچہ ہم موجودہ حکومت کو کچھ بہت زیادہ "نیا" نہیں سمجھتے اس لیے کہ یہ حکومت بنیادی سماجی اور معاشی تبدیلیوں کا نتیجہ نہیں ہے پھر بھی یہ پُرانی افسرشاہی کے مقابلے میں "نئی" اور اس سے مختلف ضرور ہے۔ اور جس حدتک یہ حکومت پُرانی حکومت سے مختلف ہے اُسی حدتک اس کا پیش کیا ہوا بجٹ بھی پُرانے بجٹوں سے یقیناً مختلف ہے۔

مرکزی اسمبلی میں جس انداز سے اس پر مباحثہ ہو رہا ہے وہ بھی اس بجٹ ہی کی نوعیت کا سیاسی نتیجہ ہے۔ ہمارا مطلب ہے کہ مباحثے نے سیاسی جماعت بندیوں کا ڈھنگ یا فرقے وارانہ رنگ نہیں اختیار کیا ہے بلکہ ایک حدتک طبقے وارانہ رنگ اختیار کر لیا ہے۔ یہ منظر ایک خوش گوار مستقبل کا نقشہ پیش کرتا ہے چاہے وہ ابھی ہم سے کتنا ہی دور ہو۔

یہ بجٹ بالکل واضح طور پر سرمایے داروں اور منافع خوروں کے خلاف ہے اور ایک حدتک عام لوگوں کے مفاد کے موافق۔ اگرچہ اس میں کچھ بڑی بڑی اور بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت کے تحت جاری کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ اگر ایک طرف سرمایے داروں کا استحصال اور منافع خوری پر تخریبی حملہ کیا گیا ہے تو دوسری طرف عام خوش حالی میں اضافہ کرنے کا کوئی مثبت اور تعمیری پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ اگر ذاتی منافعوں پر حملہ کیا گیا ہے تو صرف اِس مقصد سے کہ بجٹ کا خسارہ پورا کیا جائے، لیکن اگر صرف ذاتی کاروبار کے پھیلاؤ کو روک دیا گیا تو اس سے عام لوگوں کو کوئی خاص فائدہ اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک قومی ملکیت کے تحت بڑی بڑی صنعتیں نہ جاری کی جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بجٹ میں معاشی توسیع و تعمیر کے لیے

صوبوں کو قرض دینے کے علاوہ قومی شاہ راہوں کی تعمیر اور برقابی کی اسکیموں کو عمل میں لانے کے لیے بھی مد نکالی گئی ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ عوام کی خوش حالی میں اضافہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ حکومت صاف اور راست طور پر بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت اور سرکاری نگرانی کے تحت جاری کرنے کا اعلان کرتی۔

ہندستانی مالیات کے نقطۂ نظر سے اس وقت دو مسائل بہت اہم ہیں:۔ برطانیہ اور ہندستان کے درمیان جنگی معیشت کے پیدا کردہ چند اہم معاملات کا طے ہونا۔ اور دوسرے ہندستانی معیشت کو مابعد جنگ کے حالات سے پورے طور پر ہم آہنگ کرنا۔ اس سلسلے میں وزیر مالیات نے اپنی تقریر میں کچھ اہم باتیں واضح کی ہیں مثلاً اسٹرلنگ قرضے کے سلسلے میں ہندستان کسی قسم کی رعایت سے کام نہیں لے سکتا۔ اسٹرلنگ قرضے کا معاملہ طے پا جانے کے بعد ہندستان پر سے "ڈالر پول" کی پابندیاں اُٹھ جائیں گی، ۳۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو" ہند ـــ برطانوی مالیاتی معاہدہ" (۱۹۴۰ء) کی میعاد ختم ہو جائے گی جس کے بعد فوجی تحفظ کے تمام اخراجات ہندستان خود برداشت کرنے لگے گا۔ یہ ضرور ہے کہ سمندر پار ہندستانی فوجیں جو خدمات انجام دے رہی ہیں اُن کے اخراجات مملکتِ معظم کی حکومت ادا کرے گی۔ جنگی استعمال کی اشیا کا کافی ذخیرہ فروخت کیا جا چکا ہے اور اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ۴۶ آرڈی ننس کے کارخانوں میں ۱۵ تو برقرار رکھے جائیں گے اور بقیہ امن کے زمانے کی اشیا پیدا کرنے کے کام میں لگا دیے جائیں گے۔ ان تمام معاملات میں وزیر مالیات نے جس پالیسی کا اعلان کیا ہے وہ بہ حیثیت مجموعی ہندستان کے مفاد سے ہم آہنگ ہے۔ ریزرو بینک کے قومی ملکیت کے تحت آنے کی اطلاع بھی ہمارے لیے اطمینان بخش ہے۔

طویل عرصے کی منصوبے بندی کو موجودہ سیاسی بے استقلالی کے پیشِ نظر ناممکن قرار دینے کے باوجود منصوبے بندی کے سلسلے میں وزیر مالیات نے خطے وار منصوبے بندی Regional Planning. کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ کچھ عرصے سے خطے وار منصوبے بندی اور مرکزی منصوبے بندی کا جھگڑا ہندستان اور پاکستان کا جھگڑا بن گیا ہے، حال آں کہ ان دونوں میں در اصل کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خطے وار منصوبے بندی پاکستان کے لیے یقیناً کوئی وجہ جواز نہیں پیش کرتی، اگر پاکستان کے لیے جواز موجود ہیں تو وہ بالکل دوسرے ہیں، خصوصاً اس حالت میں کہ پاکستان کے مطالبے میں جن علاقوں کو شامل کیا جا رہا ہے وہ جغرافیائی حالات سے مطابقت نہیں رکھتے اور نہ رکھ سکتے ہیں، یہاں تک کہ وہ قومی اور تہذیبی علاقوں کے بھی مطابق نہیں ہیں، پاکستان کے تحت چند پورے پورے صوبوں کا مطالبہ ہے، لیکن خطے وار منصوبے بندی کے تحت جن علاقوں کی وحدتیں بنائی جائیں گی وہ پورے طور سے جغرافیائی نقشے کے مطابق ہوں گی۔ اس لحاظ سے ہندستان اگر سیاسی لحاظ سے متحد رہا تو بھی ہمیں مُلک کے ہر ہر حصّے کو معاشی لحاظ سے ترقی دینے کے لیے خطے وار منصوبے بندی سے ہی کام لینا پڑے گا، چناں چہ وزیر مالیات آنریبل لیاقت علی خاں کا خطے وار منصوبے بندی پر زور دینا بالکل بجا ہے۔ اور خطے وار منصوبے بندی جیسی مفید چیز کو سیاسی مرکزیت

سے متعلق تعصبات کا شکار بنا لینا بدقسمتی کے مرادف ہوگا۔

اب ہم بجٹ کے زیادہ اہم حصّوں پر آتے ہیں۔

وزیر مالیات نے پہلے سال رواں (سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء) کی آمدنی اور خرچ کا جائزہ لیتے ہوئے بتلایا کہ اس سال حکومت کو ۲۴۶ر۱۹ کروڑ رُپے کی آمدنی ہوئی جو بجٹ سے ۲۹ر۶۶ کروڑ رُپے زیادہ ہی۔ اس اضافے کی وجہ کسٹم اور انکم ٹیکس کی آمدنی کی زیادتی ہی۔ اُمید کی جاتی ہی کہ سالِ رواں کے بجٹ میں کسٹم کی آمدنی کا جو تخمینہ پیش کیا گیا تھا اُس میں ۲۸ر۰۲ کروڑ کا اضافہ ہوگا۔ مرکزی اکسائز کی آمدنی کا تخمینہ بجٹ میں ۴۴ر۳۲ کروڑ رُپے لگایا گیا تھا، لیکن اُس سے ۴۲ر۸۷ کروڑ رُپے سے زیادہ حاصل نہیں ہوسکے گا۔ انکم ٹیکس کی آمدنی میں البتہ بجٹ کے اندازے سے زیادہ آمدنی ہوگی، یعنی ۲۵ر۹۴ کروڑ کی بہ جائے ۱۵۷ کروڑ رُپے۔ ڈاک اور تار کے محکمے میں ۱۵ر۱۳ کروڑ رُپے کی آمدنی ہوگی جو بجٹ سے ۵۷ لاکھ رُپے زیادہ ہی۔ ریلوے کی آمدنی کا سال رواں (سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء) کے بجٹ میں ۳۶ر۷ کروڑ رُپے کا تخمینہ پیش کیا گیا تھا مگر آمدنی ۶۱ر۵ کروڑ سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ تحفظ کی مد میں ۲۴۳ر۴۵ کروڑ کی بہ جائے ۲۴۴ر۱۱ کروڑ رُپے خرچ ہوئے۔ مجموعی طور پر بجٹ کی بہ نسبت ۳۵ر۲۳ کروڑ زیادہ خرچ ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غلّے کی درآمد کے لیے امدادی رقم دی گئی، نیپال کو ڈھائی کروڑ رُپے جنگی خدمات کے عوض میں دیے گئے اور کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازموں کو رعایتیں دی گئیں۔ سِول اخراجات میں ۱۰ر۱۱۱ کی بہ جائے ۱۴۳ر۳۶ کروڑ رُپے خرچ ہوئے۔ اس طرح سالِ رواں میں آمدنی ۲۴۶ر۱۹ کروڑ رُپے ہوئی، خرچ ۲۸۱ر۴۷، اور خسارہ ۳۵ر۲۸ کروڑ رُپے۔

نئے سال کے بجٹ میں مجموعی آمدنی کا تخمینہ ۲۷۹ر۴۲ کروڑ رُپے رکھا گیا ہی۔ یہ تخمینہ موجودہ ہی ٹیکسوں پر مبنی ہی۔ اس کے آمدنی کے مختلف ذرائع یہ ہیں:- کسٹم کی آمدنی = ۸۹ کروڑ۔ (سالِ رواں کی آمدنی سے ڈیڑھ کروڑ رُپے زیادہ)، مرکزی اکسائز = ۴۰ر۹۳ کروڑ۔ انکم ٹیکس = ۱۳۵ کروڑ۔ ڈاک اور تار = ۳۰ر۲ کروڑ۔ اس میں سے ۲۵ر۹۸ کروڑ کے اخراجات کو منہا کر دیجیے تو ڈاک اور تار سے ۴ر۲۲ کروڑ رُپے فالتو بچیں گے۔ ریل = ۷ر۵ کروڑ رُپے۔

یہ تو آمدنی ہوئی، اب اخراجات پر آئیے۔ فوجی تحفّظ پر ۱۸۸ر۱۷ کروڑ رُپے کا تخمینہ رکھا گیا ہی اور سِول اخراجات پر ۱۳۹ر۱۷ کروڑ۔ نئے سال کے سِول اخراجات کا تخمینہ سالِ رواں کی بہ نسبت ۴ر۱۹ کروڑ رُپے کم ہی۔ سِول اخراجات میں ۱۳ کروڑ رُپے تو بندوبست وبحالی کے کام پر خرچ ہوں گے اور ۱۷ر۳۵ کروڑ رُپے غلّے کی درآمد پر امدادی رقم کے طور پر خرچ کیے جائیں گے سالِ رواں میں اس بابت میں ۲۰ کروڑ رُپے خرچ ہوئے ہیں۔ معاشی توسیع وترقّی میں ۴۵ کروڑ رُپے خرچ ہوں گے اور ۳۲ کروڑ رُپے صوبوں کو اس کام کے لیے قرض کے طور پر دیے جائیں گے۔ قومی شاہ راہوں کی تعمیر پر مرکزی حکومت ۶ کروڑ کی رقم صرف کرے گی اور دمودر اسکیم اور دوسری برقابی اسکیموں پر اندازاً ۵ کروڑ رُپے۔ اخراجات کا تخمینہ کُل مِلا کر ۳۲۷ر۸۸ کروڑ پیش کیا گیا ہی۔

اس طرح خسارہ ۴۸ر۴۶ کروڑ رہ جاتا ہے۔ جنگ کے زمانے کے حالات چوں کہ اب رفع ہوگئے ہیں اس لیے آمدنی اور خرچ کا گھٹ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ آمدنی کی بہ نسبت اخراجات زیادہ نہیں گھٹے ہیں اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جنگی اخراجات کی جگہ اب معاشی توسیع و ترقی کے اخراجات لے رہے ہیں۔

ٹیکس کے سلسلے میں جو نئی تجویزیں پیش کی گئی ہیں وہ یہ ہیں:۔ نمک پر سے محصول ہٹا دیا گیا ہے جس سے ۴۸ر۴۶ کروڑ رُپے کے خسارے میں مزید ۸ر۲۵ کروڑ کا اضافہ ہوگا۔ اس طرح خسارے کا تخمینہ کل ملاکر ۵۶ر۷۱ کروڑ رپے ہے۔ ہماری رائے میں نمک پر سے محصول ہٹانے میں زیادہ تر سیاسی جذبات کا دخل ہے ورنہ کوئی تین آنے فی کس سالانہ کا خرچ ایسا مالی بوجھ نہیں تھا جس کے لیے ۸ کروڑ رُپے کی سرکاری آمدنی ختم کردی جاتی، خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ توسیع و ترقی کے کام کے لیے رُپے درکار ہیں۔

دوسرے ٹیکسوں سے متعلق جو تجویزیں ہیں وہ البتہ بالکل صحیح اور مناسب ہیں۔ خسارے کو پورا کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں اختیار کیا جا سکتا تھا کہ غریبوں کی بہ جائے امیروں کی بھاری بھاری جیبوں سے رقم نکلوائی جائے۔ انکم ٹیکس اب دو ہزار کی بہ جائے ۲۵۰۰ یا اُس سے اوپر کی آمدنی پر بٹھایا جائے گا، اگرچہ اس سے سرکاری آمدنی میں ۲۵ لاکھ رُپے کی کمی واقع ہوگی۔ لیکن نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے یہ ضروری تھا جو اس وقت دوسرے نچلے طبقے کے لوگوں سے کم مصیبت زدہ نہیں ہیں۔ ان کمیوں کو پورا کرنے کے لیے ایک اسپشل انکم ٹیکس نافذ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ایک لاکھ رُپے سے زیادہ کے کاروباری منافع پر ۲۵ فی صدی کا محصول عائد کیا گیا ہے۔ اس محصول سے غیر کاروباری آمدنیاں بھی بری نہیں ہیں۔ اس سے دوسرے سال سرکاری آمدنی میں ۳ کروڑ رُپے کا اضافہ ہوگا۔ سوپر ٹیکس کی اقل ترین حد گھٹا دی گئی ہے۔ سرمایے کی منتقلی پر ٹیکس لگایا جائے گا جیسا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کیا جاتا ہے۔ (سرمایے کی منتقلی سے مراد ہے جائداد اور ملکیت کی خرید و فروخت۔ اس سے جو منافع حاصل ہوگا اُس پر ٹیکس بڑھایا جائے گا۔) اِس سے دوسرے سال ساڑھے تین کروڑ رُپے کی آمدنی کی توقع کی جاتی ہے۔ کارپوریشن ٹیکس کو ایک آنے سے بڑھا کر دو آنے کر دیا گیا ہے۔ اس سے دوسرے سال چار کروڑ رُپے کی آمدنی ہوگی۔ چائے کا برآمدی محصول بھی بڑھا دیا گیا ہے۔

اِن ٹیکسوں سے مجموعی طور پر مرکزی حکومت کو ۳۹ر۷۵ کروڑ رُپے کی آمدنی ہوگی اور خسارہ صرف ۱۶ر۹۶ کروڑ رُپے رہ جائے گا۔ یہ تو تخمینہ ہوا، لیکن حقیقی خسارہ اس سے زیادہ ہوسکتا ہے، اس لیے کہ مرکزی تنخواہ کمیشن کی تجویزوں کے سلسلے میں یا درآمدی محصولات کے کم ہوجانے کی صورت میں آمدنی میں کمی واقع ہوسکتی ہے۔ بہ ہر حال موخر الذکر کے عوض میں ہمیں بھی دوسرے ممالک محصولات کی رعایت دے سکتے ہیں، اس طرح اُس سے کسی (باقی صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ فرمائیے۔)

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

ہندستان کی صحت عامّہ اور معاشی ترقّی

از : ——— پروفیسر عطاء اللہ علی گڑھ یونیورسٹی

ہر ہُنر در ستایش کا قدرتی طور پر خواہاں ہوتا ہے لیکن شاعر طلبِ داد کا مرض بڑی جاں فشانی سے پالتا ہے۔ اگر سخن ناشناسوں میں گھِر جائے تو بے تکلّف اپنی داد خود دے لیتا ہے۔ دلّی کے ایک مشہور شاعر نے اپنی داد خود دیتے ہوئے فرمایا تھا ؎

نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دِل   مَیں وہ بلا ہوں شیشے سے پتّھر کو توڑ دوں

شیشے سے پتّھر کا توڑ دینا شیخ سعدی کے اعلانِ حقیقت کے باوجود کہ خواہ شیشے کو پتّھر پر پٹکو یا پتّھر کو شیشے پر دونوں صورتوں میں شیشہ ہی ٹوٹے گا نازک خیالی تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن بعد کو ادبی تنقید کے ایک دوْر میں جب حریفانہ چشمک طنز و لطافت کا پہلو لیے ہوتی تھی ایک دبستانِ شعر کے نوخیزوں نے دوْسرے دبستان کے شعرا پر ؎

رگِ گُل سے بُلبُل کے پر باندھتے ہیں

کی تاریخی پھبتی کسی اور بہ خیالِ خویش اُن کی شاعری کو زندہ درگور کر دیا۔ یہ نازک خیالی اپنے زمانے میں غالباً آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ناروا سمجھی گئی۔ شاید آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کا بلبل آج کل کے نوجوانوں سے زیادہ باہمت ہوتا تھا۔ علامہ اقبال ترجمانِ حقیقت سمجھے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف اُن کی نازک خیالی کا محتاج تھا چناں چہ انھوں نے ہندستان کے بلبل کو چھوڑ ہندستان کے نوجوان کو رگِ گُل سے باندھ کر دکھا دیا۔ نوجوان سے مخاطب ہو کر وہ فرماتے ہیں کہ تو اپنی آرام طلبی اور

تن آسانی کی یہ دولت اس قدر نکما اور بودا ہو گیا ہو کہ ؎

از رگِ گل می تواں بستن ترا   وز نسیمے من تواں خستن ترا

علامہ اقبال نے نوجوان کو رگِ گل سے باندھ کر ہی نہیں دکھا دیا اُسے ہوا کے جھونکوں سے ٹوٹتا ہوا بھی دکھا دیا ہو۔ میں جب کبھی کسی نوجوان کو نزلے سے نڈھال دیکھتا ہوں اور یہ منظر آج کل کس قدر عام ہو تو مجھے بے اختیار اقبال کا مندرجہ بالا شعر یاد آجاتا ہو۔ ٹھنڈی ہوا سے چھینکوں کا ایک تار بندھ جاتا ہو۔ ناک سرچشمۂ سیلِ رواں بن جاتی ہو مہینوں یہی کیفیت چلی جاتی ہو۔ یہ ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ جانا نہیں تو اور کیا ہو۔

نزلہ۔ زکام۔ کھانسی۔ ملیریا۔ تپِ محرقہ۔ تپِ دق۔ ہیضہ۔ طاعون۔ چیچک۔ اسہال اور پیچش کون سی بیماری ہو جس کے لیے ہندستان کی وسیع دہماں نواز سرزمین ہمہ تن دیدہ و دل فرش راہ نہیں۔ ہندستان بیماریوں اور وباؤں کی پناہ گاہ ہی نہیں پرورش گاہ بنا ہوا ہو۔

ہندستان اگر ایک طرف تعداد آبادی اور شرحِ پیدائش کے لحاظ سے لاثانی ہو تو دوسری طرف شرحِ اموات کے اعتبار سے بھی اپنا جواب آپ ہی ہو۔ سالانہ شرحِ اموات ہالینڈ میں ۹۔ برطانیہ میں ۱۲۔ جرمنی میں ۱۱۔ فرانس میں ۱۶ لیکن ہندستان میں ۲۴ فی ہزار ہو۔ یہ شرح جرمنی سے دوگنا اور ہالینڈ سے ½۲ گنا زیادہ ہو۔ ملک میں سالانہ اموات کا اندازہ اسّی لاکھ ہو۔ روس کو چھوڑ کر پورے یورپ کے مقابلے میں ہندستان کی اموات بقدر تیس لاکھ سالانہ کے زیادہ ہیں اس طرح ۱۹۲۱-۳۶ء تک ۱۷ سال کے عرصے میں یورپ کے مقابلے میں ہندستان میں اموات کی زیادتی انگلستان اور آسٹریلیا کی مجموعی آبادی سے زیادہ رہی ہو۔ موت کی یہ گرم بازاری بجائے خود افسوس ناک ہو لیکن اس کے بعض پہلو حد درجہ جگر خراش ہیں۔ اس شرحِ اموات میں پچاس فی صدی حصّہ اُن غنچوں کا ہو جو بن کھلے مرجھا جاتے ہیں یعنی دس برس سے کم عمر کے بچے۔

ہندستان میں اپنی پہلی سال گرہ تک نہ پہنچنے والے بچوں کی تعداد سنہ ۱۹۴۱ء میں ۱۵۸ فی ہزار تھی۔ بعض بڑے بڑے شہروں میں تو ہر چوتھا بچہ سال سے پہلے پہلے ہمیشہ کی نیند سو جاتا ہو۔ انگلستان میں یہ شرحِ اموات صرف ۵۹ فی ہزار ہو۔ ہندستان میں بچوں کی اموات کُل اموات کا ۴۲ فی صدی ہیں اور انگلستان میں صرف ۷ فی صدی۔

بچوں کا تو یہ حال ہوا۔ ماؤں کی جو گت بنتی ہو وہ اس سے کچھ کم دردانگیز نہیں۔ عورتیں عمر باروری (یعنی پندرہ سے پینتالیس برس کی عمر میں) زمانۂ زچگی میں بہ کثرت مرتی ہیں۔ بیس فی ہزار کا اندازہ ہو۔ ہر سال دو لاکھ عورتیں ایامِ زچگی میں لقمۂ اجل بن جاتی ہیں۔ جو بچ نکلیں اُن میں سے اکثر کوئی نہ کوئی ایسا روگ خرید کر اُٹھتی ہیں کہ اُن کی زندگی بالکل تلخ ہو جاتی ہو۔ اندازہ کیا گیا ہو کہ ہمارے ملک میں چالیس لاکھ عورتیں زچگی کے مختلف عوارض میں مبتلا ہیں۔

ملیریا ہندستان کا سب سے بڑا جان لیوا ہے۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں اس دشمن کے ہاتھوں چودہ لاکھ اموات واقع ہوئیں۔ دس کروڑ انسان ہر سال اس میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو اس کی وہ شدت ہوتی ہے کہ کارخانے سونے پڑ جاتے ہیں اور پکے کھیتوں کا کوئی کاٹنے والا نہیں ملتا۔ ملیریا کی وجہ سے کام کے نقصان کا اندازہ دو ارب تک کیا گیا ہے ملک میں تپ دق کے ۲۵ لاکھ مریض موجود ہیں۔ ۵ لاکھ سالانہ اس کی نذر ہو جاتے ہیں اور یہ موذی مرض پھیلتا چلا جاتا ہے اور اب شہروں اور صنعتی علاقوں سے نکل کر دیہات کا رُخ کر رہا ہے۔ خوراک کی قلت اور حفاظتی خوراکوں خاص کر دودھ اور گھی کی موجودہ کمی کے پیش نظر اس مرض کے زور پکڑنے کا قوی احتمال ہے۔

طاعون، ہیضہ اور چیچک دنیا بھر میں ختم ہو چکے ہیں لیکن ہمارے ملک میں اب بھی ان میں سے جب کبھی کوئی ہلکا سا حملہ بھی بول دے تو کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔ فقدانِ بصارت کا یہ حال ہے کہ دوسرے ملکوں والے ہندستان کو اندھوں کی دنیا کہتے ہیں۔ خللِ دماغ کے عارضے کی بنا پر اسے دیوانوں کا ملک کہنا بھی چنداں بے جا نہیں۔

کہتے ہیں پہلے زمانوں میں ہندستان میں لوگ بڑی بڑی عمر پاتے تھے اور بڑی بڑی عمر تک پہنچ کر بھی نہ صرف ان کے ہوش حواس درست رہتے تھے بلکہ وہ بلا تکلف اپنا کام کاج کرتے تھے۔ دانت ان کے موجود، نظر ان کی تیز، ہر طرح چاق و چوبند۔ اب بھی پرانی وضع کا کوئی بڈھا نظر آجائے تو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ برطانیہ میں اوسطِ عمر ۶۲، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۶۵، نیوزی لینڈ میں ۶۷ اور ہندستان میں صرف ۲۷ سال یعنی نیوزی لینڈ والوں سے ۲½ گنا کم۔ ہماری عمریں گزشتہ سو سال میں کافی گھٹ گئی ہیں لیکن گزشتہ نصف صدی میں انگریز کی عمر پچاس فی صدی بڑھ گئی ہے۔ ہمارے ملک میں پہلے حالت بہتر تھی۔ سرسیّد احمد خاں، دادا بھائی نارو جی اور رومیش چندر دت نے اچھی عمریں پائیں اور ملک کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ لیکن موجودہ نسل میں وہ دم خم کہاں۔ لوگ ادھیڑ عمر ہی کو پہنچ نہیں پاتے۔ بڑھاپا کسے دیکھنا اور پنشن کسے کھانا نصیب ہوتی ہے۔ لوگ پنشن سے پہلے ہی سفرِ آخرت کی تیاری کرتے ہیں اور اس طرح یہ بدنصیب ملک اپنے سیاسی رہنماؤں، اخبار نویسوں، عالموں، ادیبوں، سوداگروں، کارخانہ داروں، فن کاروں، پروفیسروں اور سائنس دانوں کے تجربے، پختہ کاری اور مہارت سے محروم ہو کر مفلس ہو جاتا ہے۔ اگر سی۔ آر۔ داس، محمد علی، اجمل خاں، جگدیش چندر بوس اور اقبال دس دس سال اور جی جاتے تو ہندستان کا کیا یہ دنیا متعدد اعتبارات سے کتنی امیر ہوتی۔

ہندستان میں شرح اموات بھی زیادہ ہے۔ عمریں بھی دوسروں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ لیکن جتنی دیر ہم جیتے ہیں اُس میں بھلا کیا تیر مار لیتے ہیں۔ تن درست قوموں کی رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑتا ہے۔ وہ زندگی پر حکم رانی کرتے ہیں اُن کی ہمتیں اور ارادے بلند ہوتے ہیں وہ قدرت کو مسخر کر لیتے ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں فتح و کام رانی ان کے قدم چومتی ہے۔

دو نیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا　　　سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی

ہندستان میں تن درستی ایک تہمت بن کر رہ گئی ہے اور دیکھنے کو کہیں خال خال نظر آجاتی ہے۔ ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی ہے جو چار و ناچار جیئے جارہے ہیں زندگی اُن کے لیے موت کے انتظار کا نام ہے۔ جسمانی کمزوری نے انھیں بودا و بزدل بنا رکھا ہے۔ کولھو کے بیل کی طرح مجبوری و ناداری کے چابک سہتے ہیں۔ خود اُن کی زندگی بے کیف ہے ملک و ملت کی خدمت کا خیال اور سکت کہاں۔ تیسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جنھیں کوئی نہ کوئی گھن لگا ہوا ہے۔ ہندستان کی بیش تر آبادی کا شمار اسی تیسرے گروہ میں ہے۔

بیماریوں کے اسباب

جب ہماری صحت عامہ کی حالت اس درجہ افسوس ناک ہے اور اُس کی وجہ سے ہمارا کوئی کام سلیقے سے انجام نہیں پاسکتا تو ہمیں موجودہ صورتِ حال کے اسباب دریافت کرنے کے بعد اُن کے انسداد کی فکر کرنی چاہیے۔ کسی فرد، خاندان یا ملک کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ اُسے پاکیزہ اور صاف ہوا ضروری مقدار میں میسّر آئے۔ پینے کو ایسا پانی کافی مقدار میں مہیا ہو جو بیماریوں کے جراثیم سے پاک ہو۔ رہنے کو کافی کشادہ مکان اور کام کو ایسا کارخانہ یا دُکان ملے جس میں روشنی اور ہوا کا کافی گزر ہو۔ کھانے کو کافی اور متناسب غذا ملے۔ ورزش کا اہتمام ہو۔ گھر بار، دفتر، دُکان اور نالائق و نامہربان افسروں کا غم انسان کو نہ کھا رہا ہو۔ ہندستان میں بڑے بینک اور سرکاری دفتر اور مکتب اصل میں قتل گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ سیر و تفریح کا بھی کچھ نہ کچھ اہتمام چاہیے۔ پیٹ بھر کھانے اور پہننے اوڑھنے کے لیے یہ نہ ہو کہ آدمی کو خون پسینہ ایک کر دینا پڑے اور انسان اشرف المخلوقات کولھو کا بیل بن کر رہ جائے۔ گھر، گلی، محلے، گانو اور شہر، صوبے اور ملک میں حفظانِ صحت کے اصولوں پر سختی سے عمل ہو۔ امراض کے اسباب و انسداد پر ریسرچ ہو۔ مریضوں کے علاج کا بہترین انتظام ہو تو فرد و قوم کی صحت جو تمام ترقیوں کی بنیاد ہے بحال رہ سکتی ہے۔ ہندستان میں تیس فی صدی آبادی کو تو پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ جنھیں ملتا ہے اُن کی خوراک زیادہ تر ناقص ہوتی ہے اور صرف شکم پُری کا کام دیتا ہے۔ ہماری خوراک میں حفاظتی اجزا وٹامن، چکنائی اور پروٹین کی حد درجہ کمی ہے۔ ملک کو معقول مقدار میں صحت بخش غذا مہیا کرنے کے لیے ہمیں غلّوں میں دس فی صدی، دالوں میں بیس فی صدی، چکنائی میں ۲½ سو فی صدی پھلوں میں پچاس فی صدی، سبزیوں میں سو فی صدی، مچھلی، دودھ اور انڈے میں تین سو فی صدی اضافے کی فوری ضرورت ہے۔

ڈاکٹروں کی قلت

بیماری میں علاج کے انتظامات کی کیفیت بھی حد درجہ ناقابلِ اطمینان ہے۔ بیماریوں اور وباؤں کی اس کثرت و

ناتن درستی کی اس عالم گیری پر شفا خانوں، ڈاکٹروں اور حکیموں کی افسوس ناک قلت ہے۔ اگر انگلستان میں ہر ہزار آدمی کے لیے ایک ڈاکٹر موجود ہے تو ہندستان میں ساڑھے چھ ہزار کے لیے ایک ڈاکٹر ہے۔ انگلستان میں تین سو کے لیے ایک نرس کا اوسط ہے تو ہندستان میں، ہزار کے لیے دایہ ایک لاکھ چاہییں مگر صرف پانچ ہزار موجود ہیں۔ لیڈی ڈاکٹروں کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔

ڈاکٹر اور حکیم جو کچھ اور جیسے کچھ ہیں شہروں میں ہیں دیہات میں ملک الموت کی ہی فرماں روائی ہے۔ ملک میں جو ڈاکٹر موجود ہیں اُن کے لیے کام کی وہ بھرمار ہے کہ مریض کو آدھے اور پون منٹ میں ٹرخا دینے پر مجبور ہیں ایسی حالت میں تشخیص، علاج اور فائدہ معلوم۔ ملک میں اتنے بڑے ملک میں ڈاکٹری کی ترقی یعنی امراض کے ریسرچ کا انتظام نہایت ناکافی بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ہندستان کو قدرت نے صحت کے لحاظ سے اپنی فیاضیوں سے پورا پورا حصہ دیا ہے ؎

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا   وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

ہمالیہ ہماری قدرتی، فوجی و سیاسی سرحد ہی نہیں صحت کے لحاظ سے بھی ہمارا پاسباں ہے۔ ہمالیہ ہمیں برفانی ہواؤں سے محفوظ رکھتا ہے۔ نہ ہڈیوں ہیں گودا جما دینے والی سردی، نہ نشتر کی طرح کاٹنے والی ہوائیں۔ نہ بے دھوپ کے یاس انگیز اور بے رونق دن اور نہ دن کو رات بنانے والی تیرہ و تار کہر۔ ملک کے تین طرف مچھلیوں سے بھرپور اور موتیوں سے معمور سمندر ہندستان کے چو راہے سے جہازوں کو ہر طرف سے لے آتے اور لے جاتے ہیں۔ سمندر کی صحت بخش اور روح پرور ہوائیں موتی لٹاتیں اور رزق برساتی ہیں۔ ہمارے ملک کا روشن سورج جس کی تیزی سے بعض وقت ہم بلبلا اٹھتے ہیں یاس انگیز اور دن کو رات بنانے والی کہر کے بجائے وٹامن ڈی لٹاتا اور ہزاروں بیماریوں کے جراثیم کو پوری خاموشی اور تیزی کے ساتھ فنا کر دیتا ہے۔ بیماریوں کے انسداد اور روک تھام کا قدرتی اہتمام تو موجود لیکن ہماری شامتِ اعمال سے ہندستان بیمارستان بنا بیٹھا ہے۔ قدرت نے ہمیں پہاڑ، دریا، سمندر اور زرخیز زمین سبھی کچھ دیے لیکن ہم غریب ہیں۔ صحت کے تمام قدرتی لوازم ہمیں مہیا ہیں اور ہم درماندہ و بیمار۔ اس افسوس ناک صورتِ حال کا سب سے بڑا سبب ہماری جہالت اور غفلت ہے۔ یہی جہالت و غفلت آیندہ ترقی کے راستے میں سب سے بڑی روک ہے۔ لہٰذا اس کا علاج ہونا چاہیے۔

ہر شخص کو پیٹ بھر ایسا کھانا نصیب ہونا چاہیے جو ممدِ صحت ہو اور بیماریوں اور وباؤں کے خلاف معقول قوتِ مقابلہ پیدا کرے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی ترقی میں ایک انقلاب پیدا کرنا پڑے گا۔ اس کے طریقوں اور پیداوار کے تناسب کو بدلنا پڑے گا۔ گھی، مکھن پیدا کرنے کے لیے ہمیں مویشی کی غور و پرداخت میں زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ یہ بجائے خود ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔

جراثیم سے پاک و صاف پانی ہوا کے بعد صحت کی اوّلین ضرورت ہے گانو کا تو ذکر ہی کیا وہاں بے زبان بستے ہیں اُن کی فکر کسے۔ لیکن شہروں کا بھی یہ حال ہے کہ ہر چھٹے شہر میں پانی کی بہم رسانی کا انتظام صحت کے اعتبار سے اطمینان بخش ہے۔ پانی کے ساتھ ساتھ بیماریوں کا ایک بڑا ذریعہ دودھ ہے۔ ایک انگریز ماہر نے گزشتہ سال یہاں کے حالات دیکھنے کے بعد یہ کہا کہ ہندستان کے شہروں

میں پکنے والا دودھ صحت کے لحاظ سے لندن کی نالیوں کے پانی سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ فیصلہ ہے تو تلخ لیکن اس کی صداقت میں کوئی شک نہیں۔ کیا سال بھر میں اس شہادت کے بعد ملک میں اس کا کچھ تدارک کیا گیا ہے۔

مکان انسان کو موسم کی اذیتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کی کارگزاری کو بڑھاتا ہے۔ ہندستان میں مکان کی ضرورت و اہمیت پر خاندان کی صحت و مسرت کے لحاظ سے کبھی کسی نے غور ہی نہیں کیا۔ بڑے بڑے شہروں میں مکانیت کے لحاظ سے چار پانچ گنا وسعت کی ضرورت ہے۔ ایسے شہروں میں جن کی عالی شان عمارتیں بام فلک سے ہم سری کا دعوا کرتی ہیں۔ غریبوں کی آبادیاں نمونۂ جہنم بنی ہوئی ہیں۔ ایک ہی تنگ و تار دھوئیں سے بھرپور کوٹھری اُن کی کائنات ہے۔ خلقِ خدا چیونٹیوں کے بلوں میں گھسی پڑی ہے۔ یہ مکان نہیں قبرستان ہیں جن میں مُردے بس رہے ہیں۔

ہمارے لباس کے متعلق بھی کسی نے خوب کہا ہے ہندستانی کا تمام لباس اُس کے زیب تن ہی ہوا کرتا ہے ان صاحب کو غالباً معلوم نہیں کہ دیہات میں یہ لباس زیادہ تر ع

یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا

کا مصداق ہوتا ہے۔ انگلستان میں فی کس ۳۸ گز کپڑا صرف ہوتا ہے اور ہمارے ملک میں صرف ۱۷ گز سالانہ کا اوسط ہے۔ ہمیں صحت کے لحاظ سے کافی لباس کے لیے گیارہ ہزار چھ سو ستر ملین گز زائد کپڑے کی ضرورت ہے۔

خوراک کی ضروری مقدار زراعت میں ایک انقلاب کی طالب ہے وہ انقلاب جلد از جلد آنا چاہیے۔ ملک کی آبادی تشویش ناک حد تک بڑھ گئی اور بعض لوگوں کی رائے ہے کہ مسئلہ خوراک بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر پیچیدہ تر ہوتا چلا جائے گا۔ دوسرے ملک والوں نے خشک زمین سے چاول پیدا کر لیے ہیں اور سمندروں سے بن بوئی کھیتیاں کاٹ رہے ہیں ہندستان میں تو ابھی زرعی پیداوار میں اضافے کے بڑے امکانات ہیں دیہات میں صفائی زمینوں کی زرخیزی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ مویشی ہماری خوراک، دودھ، مکھن اور گھی کے اتھاہ سمندر ہیں جنھیں ہم نے خشک اور نکما بنا رکھا ہے۔ ہندستان کی اوسطاً سالانہ چار سو پونڈ دودھ دینے والی گائے کو جب ڈیری فارم میں بہتر حالات میں رکھا اور کھلایا پلایا گیا ہے تو اُس کا دودھ دس ہزار پونڈ سالانہ تک بڑھ گیا۔ انگلستان کے مقابلے میں چکنائی ہندستانی گائے کے دودھ میں پہلے ہی تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ شہر اور دیہات میں پھل دار درختوں کے لگانے کی ایک مہم شروع ہو جانی چاہیے تاکہ پانچ سات سال کے اندر اس ملک میں پھل زیادہ مقدار میں پیدا ہوں۔ جن گھروں میں گنجائش ہو وہاں دو چار پھل دار درخت ضرور لگوانے چاہییں تاکہ گھر والوں کو پھل ملتا رہے خاص کر پپیتے کے درخت جلد اور صحت کے لحاظ سے نہایت مفید پھل دیتے ہیں۔ مرغیاں۔ مچھلیاں اور شہد کی مکھیاں دیہات میں کثرت سے پالنی چاہییں۔

مصفا پانی کے لیے ہر گاؤں میں پانچ سال کے اندر اندر زمین دوز پمپ لگ جانے چاہییں یا بڑے بڑے دیہات میں ٹیوب ویل

تاکہ آبادی کو جراثیم سے پاک پانی مل سکے۔ صرف اسی ایک اہتمام سے آدھی بیماریاں ختم ہو جائیں گی۔ اس کام کے لیے حکومت ہند، صوبائی حکومتوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور پنچایتوں سبھی کو شریک ہونا چاہیے۔

ہمارے مکتبوں میں حفظانِ صحت کی تعلیم لازمی قرار دینی چاہیے لیکن پہلے استادوں کو یہ علم خاص طور پر پڑھنا چاہیے پھر ٹریننگ کالجوں اور سکولوں کی معرفت اس علم کو عام کرکے اس کے استاد ہر اسکول میں پہنچانے چاہییں۔ حفظانِ صحت کے نصاب کی تیاری میں ماہرینِ تعلیم اور ماہرینِ صحت کی مدد سے کارآمد اور دلچسپ کتابیں طلبا کے لیے علاحدہ اور عام شہریوں کے لیے علاحدہ تیار کرانی چاہییں۔

جہاں کہیں ملک میں قدرتی اسبابِ مضرِ صحت موجود ہیں اُن کو بدل ڈالنا چاہیے۔ دنیا دریاؤں کے دھارے اور سمندروں کے رُخ بدل رہی ہے۔ اپنی معاشی ترقی اور صحت کی بہ دولت ہر مشقت اٹھائی اور ہر خرچ برداشت کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں کروڑوں روپے سالانہ کی دوائیں باہر سے آتی ہیں اور دوسرے ملک ہماری بیماری پر اپنی صحت و خوش حالی کی بنیاد قائم کرتے ہیں ہمیں اپنے ملک میں دوائیں تیار کرنے کے کارخانے کھولنے چاہییں۔

سب سے ضروری اور مقدم کام یہ ہے کہ اسی سال سے ہمارے تمام مدرسوں میں طلبہ کا طبّی معائنہ شروع ہو جائے جس کا سالانہ یا ششماہی ریکارڈ رکھا جائے۔ تاکہ بیس سال بعد اُس وقت کے اور موجودہ حالات کا مقابلہ کرکے ہم پتا معلوم کرسکیں کہ آیندہ نسل کی صحت، وزن، قد، سینے کی کشادگی، منہ، آنکھ، ناک اور کان کی بیماریوں کے لحاظ سے بہتر ہو رہی ہے یا ابتر۔ ایسے ہی ریکارڈ کی عدم موجودگی اس وقت ہماری پریشانی کا موجب ہو رہی ہے۔ کیا محکمۂ صحت اور محکمۂ تعلیم اس مسئلے میں ایک دوسرے سے تعاون کرکے معلومات متعلقہ صحتِ عامہ کی بنیاد رکھیں گے۔ اسی طرح فوج اور کارخانوں کو اپنے آدمیوں کے معائنے کے بعد ریکارڈ رکھنا اور شائع کرنا چاہیے۔

ہماری آنے والی آزادی جس پر ہماری معاشی ترقی کا دار و مدار ہے ہر طرف سے خطرے میں گھری ہوئی ہے اُس کی حفاظت کے لیے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو بناسپتی گھی کھا کر پیدا نہیں ہوسکتے۔ ہر اُس شخص کو جسے اس ملک سے محبت ہے کوشش کرنی چاہیے کہ صحتِ عامہ کی بہتری میں اپنے علم۔ دولت اور کوشش سے پورا پورا حصہ لے۔ آج یہی اس ملک کی سب سے بڑی خدمت ہے اور صحتِ عامہ پر ہی دوسری تمام ترقیوں کا انحصار ہے ؎

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مال او فرزند ہاے تن درست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

(اقبال)

——— ✻ ———

منصوبے بندی اور جمہوریت

از: ——— پروفیسر برج نرائن پروفیسر معاشیات پنجاب یونی ورسٹی

سیاسی نظام اور معاشی نظام میں گہرا تعلق ہی۔ معاشی نظام بدلے تو سیاسی نظام کا بدلنا ضروری امر ہی۔

ان دونوں میں مقدم چیز کون سی ہی؟ سیاسی نظام یا معاشی نظام! جان اسٹورٹ مِل کی کتاب "نیابتی حکومت Representative Government." کا مطالعہ کیجیے۔ پہلے ہی صفحے پر مِل نے شکایت کی ہی کہ بعض لوگ آئین کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کسان ہل کو دیکھے یا دانے نکالنے والی مشین کو۔ دانے نکالنے والی مشینوں کا استعمال ابھی ہندستان میں شروع نہیں ہوا۔ زمین میں ہل چلا کر ہی بیج ڈالا جاتا ہی ہل زمین دیکھ کر لیا جاتا ہی۔ کہیں ہلکا ہل زیادہ کارآمد ہی کہیں بھاری۔ پہلے دیکھو کہ اس سے کام کیا لینا ہی اور پھر ہل پسند کرو۔ اسی طرح ہم پہلے یہ فیصلہ کیوں نہ کریں کہ سیاسی نظام سے کام کیا لینا ہی اور معاشی نظام کی ضرورتوں کو مدِّ نظر رکھ کے سیاسی نظام ڈھالیں۔ جان اسٹورٹ مِل کو یہ منظور نہ تھا۔ ان کی راے میں جمہوری آئین مقدم چیز ہی۔ کیوں کہ ان کے زمانے میں باترتیب نظام Planned System. کی بحث شروع نہیں ہوئی تھی۔ مِل خود مسئلۂ غیر مداخلت کے قائل تھے۔ مسئلہ غیر مداخلت اور جمہوریت کا آپس میں میل ہی۔ اگر غیر مداخلت کے آپ بھی قائل ہیں تو جو سیاسی راہ مِل نے دکھائی ہی اس پر بے شک چلیں۔ مگر یہ رستہ باترتیب نظام کی طرف نہیں لے جاتا۔

باترتیب معاشی نظام اور غیر مداخلت میں بیر ہی۔ جیسے کتے بلّی کا۔ کتا بلّی شاید ایک جگہ بیٹھ بھی جائیں۔ مگر جس جگہ آپ باترتیب نظام کی عمارت کھڑی کریں گے، غیر مداخلت دُم دبا کر بھاگے گی۔ جس جگہ غیر مداخلت کے اصولوں پر عمل ہوتا ہی باترتیب نظام لاپتا ہوگا۔

ہیں غیر مداخلت کا قائل نہیں۔ غیر مداخلت ختم ہو چکی ہے۔ غیر مداخلت کے ختم ہونے پر ہی باترتیب معاشی نظام کی بحث شروع ہوتی ہے۔

غیر مداخلت کیوں کر ختم ہوئی اور کب ختم ہوئی؟

کہانی دل چسپ ہے مگر بحث دقیق ہے۔ معاشیات کے طالب علم اس سرگزشت سے واقف ہیں۔ مگر عوام نہیں۔ میرا مطلب حل نہیں ہوگا جب تک ثابت نہ کر دوں کہ قرار واقعی غیر مداخلت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں روس میں باترتیب نظام کی داغ بیل پڑی۔ یعنی روس میں پنج سالہ منصوبے بندی کی شروعات ہوئی۔ روس میں نئے نظام کے قائم ہونے کا معاشی دنیا پر اثر پڑنا تھا۔ مگر روسی منصوبے بندی نے روس میں غیر مداخلت کا خاتمہ کیا، دنیا بھر میں نہیں۔ عالم گیر سرد بازاری سنہ ۱۹۲۹ء میں شروع ہوئی جس نے دنیا بھر میں سرمایہ داری کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ یا یوں کہیے کہ قبر کھود کر غیر مداخلت کو اس میں ہمیشہ کے لیے سُلا دیا

سنہ ۱۹۲۹-۳۲ء کی سرد بازاری نے دنیا بھر کے معاشی نظام کو بدل دیا۔

سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگِ عظیم سے پہلے اشیا کی قیمتیں بڑھ رہی تھیں۔ ہندستان میں اور دیگر ملکوں میں بھی۔ مگر اناج اور خام اشیا کی قیمتیں زیادہ بڑھیں اور صنعتی اشیا کی مقابلتاً کم۔ ہندستان سے برآمد زیادہ تر اجناس کی تھی۔ اجناس کو بیچ کر ہم یورپ سے صنعتی اشیا خریدتے تھے سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگِ عظیم سے پہلے غیر ملکوں کے ہاتھ کپاس، گیہوں، سن، بیج وغیرہ بیچ کر ہم نے بہت نفع کمایا۔ اور یورپ کی صنعتی اشیا مقابلتاً سستے داموں خریدیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء کے بعد صورتِ حال برعکس تھی۔ سنہ ۱۹۲۸-۳۳ء کے پانچ سال کے عرصے میں برآمد کی قیمت اوسطاً ۳۵ فی صدی گھٹ گئی اور درآمد کی ۲۰ فی صدی۔ خام اشیا کی ارزانی کی وجہ کیا تھی۔

ایک پُرانی کہانی ہے کہ کسی فقیر نے گھور تپسیا کی اور تپسیا کے زور سے ایک بھوت پیدا کیا۔ نمودار ہوتے ہی بھوت نے کہا۔ کیا حکم ہے۔ میں تیرے بس میں ہوں جو کہے گا کروں گا۔ مگر مجھے ایک لمحہ بھی خالی بٹھایا تو تجھے کھا جاؤں گا۔ فقیر کے ڈر کے مارے پران نکل گئے۔ ہمت کر کے کہا یہ لا وہ لا۔ جو فقیر کہتا بھوت دم کے دم میں حاضر کر دیتا۔ پھر کہتا جلد بتا اور کیا کروں ورنہ تجھے کھاتا ہوں۔ تنگ آ کر فقیر نے اونچا بانس زمین میں گاڑ دیا اور کہا بھائی جب کچھ کام نہ ہو تو بانس پر چڑھا اُترا کر اس طرح اپنی جان بچائی۔

سرمایہ داروں نے علم کے زور سے کلوں کے بھوت کو تو اپنے سامنے کھڑا کر لیا مگر اس کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ کلوں کے بھوت کی برکت تھی کہ سنہ ۱۹۲۹-۳۲ء میں اشیا کی پیداوار مانگ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو گئی۔

کلوں نے اٹھارہویں صدی میں برطانوی صنعت و حرفت کی کایا پلٹ دی۔ ایک زمانہ تھا کہ اہلِ برطانیہ ہمارے سوتی کپڑے شوق سے لے جایا کرتے تھے۔ خود استعمال کرتے اور جو باقی بچتا دُوسرے ملکوں میں نفع پر فروخت کرتے۔ مگر کلوں نے ہماری دست کاری کا ناس

بلا دیا۔ رفتہ رفتہ ہندستان سے سوتی کپڑے کی برآمد بند ہوگئی اور ہم خود ولایتی کلوں کا استعمال کرنے لگے۔ دنیا بھر میں کلوں کے ذریعے لوہے کی اور دیگر اشیا بننے لگیں۔ ریلیں اور جہاز بنے جن سے بین اقوامی تجارت کی شکل بدل گئی۔ کلوں کی ایجاد کا سلسلہ پہلے انگلستان میں شروع ہوا۔ کلوں کے بھوت نے انگریزوں کو مالا مال کر دیا اور دنیا بھر کے خزانوں سے ان کا گھر بھر دیا۔

انگلستان کے بعد جرمنی، فرانس یورپ کے اور ملکوں اور امریکہ میں کلوں کا استعمال شروع ہوا۔ جگہ جگہ کارخانے بنے اور کلوں کا بھوت سرمایہ داروں کا خادم بن کر ان کا حکم بجا لانے لگا۔

۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگِ عظیم میں اربوں روپے کا سرمایہ برباد ہوا ہزاروں جہاز غرقاب ہوئے شمالی فرانس اور بلجیم میں لاکھوں عمارات اور کارخانے مسمار ہوئے۔ مگر کلوں میں وہ طاقت ہے کہ جنگِ عظیم کے اختتام کے چند سال بعد ہی پہلے سے بھی زیادہ جہاز مہیا ہوگئے۔ نئے انجن ریلیں اور گاڑیاں بن گئیں۔ نئے کارخانے تعمیر ہوکر صنعتی اشیا کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ اور صنعتی پیداوار بڑھنے لگی۔ یہ ترقی ۱۹۲۹ء تک جاری رہی۔

سب سے پہلے ممالک متحدہ شمالی امریکہ میں زراعت کا کام بھی کلوں کے بھوت نے سنبھالا۔ کلوں کے استعمال سے زراعت کے طریقے بدل گئے۔ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگِ عظیم سے پہلے اس ملک میں بھی کل والے ہلوں کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ ہل مہنگے تھے اور ان کے چلانے کا خرچ اتنا تھا کہ گیہوں کی قیمت دیکھ کر کسانوں کو ان ہلوں کو کام میں لانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مگر پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں اوّل گیہوں کی قیمت بڑھی۔ پھر یہ ہل زیادہ تعداد میں بننے کی وجہ سے سستے ملنے لگے۔ اب کیا تھا۔ جگہ جگہ کلوں کے ہل چلنے لگے۔ امریکہ سے ہل اور زراعتی کلیں آسٹریلیا، ارجن ٹین اور دیگر ملکوں میں جانے لگیں۔ نئی آبادیوں میں زمین کی کمی نہیں۔ کلوں کے ذریعے کام کرنے میں خرچ اور محنت مزدوری کی بچت ہوتی ہے جس طرح کلوں کے استعمال نے صنعت کی کایا پلٹی تھی۔ کلوں نے یورپ اور امریکہ کی زراعت کا نقشہ بدل دیا۔ گیہوں، کپاس، قہوہ اور دیگر اجناس کی پیداوار بڑھ گئی اور قیمتیں گریں۔ قیمتیں بڑھانے کی خاطر برازیل میں لاکھوں قہوے کی بوریاں سمندر میں الٹ دی گئیں اور آگ کی نذر ہوئیں۔ شمالی امریکہ میں گیہوں ریل کے انجنوں میں ایندھن کے طور پر کوئلے کی جگہ برتا گیا۔ اُگے ہوئے کپاس کے پودوں کی زمین میں دوبارہ ہل چلوا دیے گئے۔

دوسری جنگِ عظیم ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔ مگر ابھی دنیا بھر میں ہر چیز کی قلت ہے۔ یہ قلت دائمی نہیں۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی مگر ۱۹۲۰ء کے بعد اشیا کی قیمتیں گرنی شروع ہوئیں۔ دوسری جنگِ عظیم کا تباہ کن اثر زائل ہو رہا ہے۔ مگر چوں کہ تباہی کا پیمانہ زیادہ وسیع تھا، قیمتوں کو گرنے میں پہلے سے زیادہ دیر لگے گی۔

ہندستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں سونے کی برآمد شروع ہوئی اور ۱۹۳۹-۴۰ء تک سال بہ سال جاری رہی۔ سونا بیچنے والے زیادہ تر کسان تھے جنھوں نے مجبور ہوکر مالیہ آبیانہ دینے اور دیگر ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے گھر کے زیورات بیچے۔

عالمگیر سرد بازاری نے بین اقوامی لین دین کا سلسلہ قریب قریب بند کر دیا۔ قرضوں کا سود بھی دینا پڑتا ہے اور اصل رقم بھی واپس کرنی پڑتی ہے۔ مقروض ملک اجناس بیچ کر قرضوں کا بوجھ ہلکا کیا کرتے تھے۔ جب اجناس کی قیمتیں گریں۔ ان کے لیے سود اور اصل کی ادائگی محال ہوگئی۔ اجناس کی جگہ سونا بھیجنا پڑا۔ سونے کے ذخیرے جن کی بنا پر نظامِ زر قائم تھا، خالی ہو گئے۔ اور انگلستان کے سونے کے نظام کے ٹوٹنے سے پہلے ہی کئی ملکوں نے سونے کا معیار ترک کر دیا۔

بین اقوامی تجارت گھٹ کر ایک تہائی رہ گئی۔ ہر ملک میں بے کاری بڑھ گئی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۲۸ ملکوں میں آخر دسمبر ۱۹۳۱ء میں بے کار مزدوروں کی تعداد ۲½ کروڑ سے زیادہ تھی۔ آبادی کے لحاظ سے ۵ر۷ فی صدی تعداد بے کار مزدوروں کی امریکہ میں تھی تقریباً ۹ فی صدی جرمنی میں اور ۱۰ فی صدی سے زیادہ برطانیہ اور شمالی آئرلینڈ میں۔

سرد بازاری نے ۲۱ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو انگلستان کا سونے کا نظام توڑا۔

انگلستان میں ۱۹۲۵ء میں دوبارہ سونے کا نظام قائم کرنا سخت غلطی کے مرادف تھا۔ انگریز مدبروں اور بنکروں کو عزت کی چاہ نے مار دیا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم سے پہلے لندن دنیا کا مالی مرکز بن گیا تھا۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک شہر دنیا کا مالی مرکز تو ہو، مگر جب کوئی سونا مانگے سونا دینے سے انکار کر دے۔ ایسے ملک کے ساہوکاروں کا کون اعتبار کرے گا اور کون اپنا سونا ان کے پاس رکھوائے گا۔

اپریل ۱۹۲۵ء میں حکومتِ برطانیہ نے "بینک آف انگلینڈ" کو سونا باہر بھیجنے کی اجازت دے دی اور سونے کی برآمد پر جو قیود لگی ہوئی تھیں انھیں ہٹا دیا۔ پرانا نظام پھر عمل میں آیا۔ اور برطانیہ کی ناک کٹنے سے بچ گئی۔

ناک تو کٹنے سے بچ گئی مگر انگریزی برآمد کی ناگفتہ بہ حالت ہوگئی۔ پونڈ کی قیمت بڑھنے سے ایک طرف تو درآمد بڑھی اور دوسری طرف برآمد گھٹی۔ سرد بازاری نے ایک اور چوٹ لگائی۔ انگریزی ساہوکار یا بینکر، جہازوں کے مالک اور بیمہ کمپنیاں اُجرت اور کمیشن کی صورت میں ہر سال کروڑوں روپے غیر ملکوں سے کھینچ کرتے جاتی تھیں۔ تجارت کی عالمگیر سرد بازاری سے یہ آمدنی گھٹ گئی۔ پھر نوآبادیوں میں انگریزوں کا بہت کچھ سرمایہ لگا ہوا تھا۔ ربڑ، ٹین، تانبے اور اور اشیا کی قیمتوں کے گرنے کے باعث سود وغیرہ کی آمدنی جو نوآبادیوں سے ہوتی تھی، وہ ماری گئی۔ جنوبی امریکہ کی بعض ریاستوں نے انگلستان سے روپیہ قرض بھی لیا تھا۔ وہ روپیہ ہضم کر کے بیٹھ گئیں۔ بہتر یہ ہوا کہ ہر قسم کی آمدنی کو ملا کر بھی برطانیہ غیر ملکوں کی قرض دار بن گئی۔

ایسی حالت میں برطانیہ کے لیے سونے کا نظام قائم رکھنا اور پونڈ کی قیمت برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ چناں چہ برطانوی سونے کا نظام ٹوٹا۔ اور اس نظام کے ٹوٹتے ہی چند مہینوں میں آدھی دنیا کے سونے کے نظام اس طرح غائب ہوئے جس طرح گدھے کے سر سے سینگ۔

۱۹۳۱ء کو برطانوی سونے کا نظام ٹوٹا۔ اس کے ایک سال بعد سلطنتِ برطانیہ کے مختلف ملکوں کے تجارتی نمایندوں کا اٹاوہ میں ایک جلسہ ہوا اور معاہدۂ اٹاوہ پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے نے آزادیٔ تجارت کا خاتمہ کیا۔ درآمد برآمد کے لیے ملکوں کی جتھے بندی

شروع ہوئی۔

آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ میرا مضمون اور تھا اور یہ باڑا میں کہیں اور۔ نہیں۔ آپ غلطی پر ہیں۔ میں مضمون سے باہر نہیں گیا۔ غیر مداخلت کا قلعہ دو بڑے بڑے ستونوں پر قائم ہو۔ ایک سونے کا معیار، دوسرا آزادیٔ تجارت۔ آزادیٔ تجارت کے معنی ہیں کہ گاہک جہاں چاہے مال خریدے۔ اپنے ملک میں یا کسی اور ملک میں۔ درآمد پر حکومت محصول لگائے بھی تو ہلکے اور آمدنی کی خاطر۔ اس خیال سے نہیں کہ اپنی صنعتوں کو غیر ممالک کی صنعتوں کے مقابلے میں تقویت پہنچے۔ سونے کا نظام ٹوٹنے سے غیر مداخلت کی عالی شان عمارت کو ضعف پہنچا۔ اور آزادیٔ تجارت کو خیرباد کہتے ہی یہ عمارت دھڑام سے گر پڑی اور کھنڈر بن گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے کے چند سال پہلے ہر ملک نے سرمایے کی برآمد اور اشیا کی درآمد برآمد پر سخت قیود لگا دی تھیں۔ شرح تبادلہ ہر جگہ مصنوعی تھی۔ کیوں کہ ہر ملک کے زر کا سونے سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ بعض جگہ جیسے جرمنی میں، معاشی نظام کی باگ ڈور مکمل طور پر حکومت نے خود سنبھال لی تھی۔ بغیر حکومت کی مرضی کے نہ مال باہر جاتا تھا نہ اندر آتا تھا۔ اشیا کی قیمتیں، مزدوروں کی اجرت حکومت خود براہِ راست مقرر کرتی تھی۔ سرمایے داروں کو مرضی کے مطابق سرمایہ لگانے، نئے کارخانے کھڑے کرنے یا پیداوار بڑھانے گھٹانے کی اجازت نہ تھی۔ شرح تبادلہ ہر ملک کے لیے ایک نہ تھی، بلکہ جداگانہ۔ عام طور پر بین اقوامی تجارت کا نقشہ ایک سیدھی لکیر کا سا نہیں ہوتا جو ہم دو ملکوں کے درمیان کھینچ دیں۔ ایک ملک کا قرضہ دوسرے ملکوں کو زیادہ مال بھیج کر ادا کیا جاتا ہو۔ ان دنوں میں بین اقوامی تجارت نے ادلا بدلی کی شکل اختیار کی۔ اگر بچّوں کی جیبوں کی تلاشی لی جائے تو چاک کے ٹکڑے ٹوٹی پنسلیں، کنکر پتھر، کھیلنے کی گولیاں وغیرہ نکل آئیں گی۔ بچّے آپس میں سودا بھی کیا کرتے ہیں۔ چاک کا ٹکڑا دے دیا اور پنسل کا ٹکڑا لے لیا۔ اُس زمانے میں، اور اسے گزرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، باہر سے چیز لینے کی شرط یہ تھی کہ اُسی قیمت کی چیز دوسرا ملک بھی خریدے۔ اٹلی نے میکسیکو کے لیے تیل لے جانے والا جہاز بنایا اور اس کے بدلے میں میکسیکو سے تیل لیا۔ اس قسم کی تجارت کی بے شمار مثالیں ہیں۔

سونے کے نظام ٹوٹنے اور بین اقوامی تجارت کی شکل بدلنے سے ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی جس کی مثال عالم گیر سرد بازاری سے پہلے نہیں ملتی۔

عالم گیر سرد بازاری نے دُنیا کی معاشی شکل ہی نہیں بدل دی بلکہ ماہرینِ معاشیات پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ غیر مداخلت کی رٹ ختم ہوئی۔ اور باترتیب نظام کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا۔

ان ماہرینِ معاشیات میں لارڈ کینز کو، جنھوں نے اسی سال وفات پائی ہو، بلند درجہ حاصل ہو۔ لارڈ کینز ریاستی اشتراکیت (State Socialism.) کے خلاف تھے۔ اس کا مطلب ہو کہ تمام ذرائع پیداوار کی مالک حکومت ہو — ان کا خیال تھا کہ اگر حکومت یہ انتظام کر سکے کہ سرمایہ جو ذرائع پیداوار کے بڑھانے میں لگایا جاتا ہو بے جا طور پر نہ بڑھنے پائے۔ اور ذرائع پیداوار

کے مالکوں کے منافع کی شرح مقرر کر دی جائے۔ تو پھر حکومت کے لیے ذرائع پیداوار کو اپنے قبضے میں لانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سرمایہ داری کے اونٹ کی ناک میں نکیل پڑ گئی۔ حکومت جس طرف چاہے اسے لے جائے۔

باترتیب نظام کی دو شکلیں ہیں ایک جیسی روس میں ہے۔ اور دوسری وہ شکل جو معاشی نظام دورانِ جنگ میں اختیار کر لیتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں حکومتِ ہند نے تمام ذرائع پیداوار پر اپنا قبضہ نہیں جمالیا۔ احکام جاری ہوئے جن کی رو سے بغیر حکومت کی اجازت کے نئی کمپنیاں، نئے کارخانے نہیں کھڑے کیے جا سکتے تھے۔ بے شمار اشیا کی قیمتیں مقرر ہوئیں، راشن بندی جاری ہوئی۔ درآمد برآمد، رُپیہ باہر بھیجنے پر پابندیاں لگیں۔ یہ کارروائی لڑائی جیتنے کی خاطر کی گئی۔ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھ میں رہے، مگر ان کا استعمال حکومت کی مرضی کے مطابق ہوا۔ تاکہ سامانِ جنگ تیار ہو۔ جب ہر ملک میں دورانِ جنگ میں سرمایہ داری کے اونٹ کی ناک میں نکیل لازمی طور پر پڑ جاتی ہے تو صلح اور امن وامان کے ایام میں کیوں نہیں؟

سرمایہ داری کا اونٹ بے مہار ہو گا تو بگٹٹ بھاگے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بے حد سرمایہ ذرائع پیداوار کے بڑھانے میں لگایا جائے گا۔ سرمایہ داروں کی آمدنی ان کے خرچ سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ خرچ کم بچت زیادہ۔ بچت ذرائع پیداوار بڑھانے میں صرف ہوتی ہے۔ نئے کارخانے نئی کلیں بنتی ہیں۔ دھڑا دھڑ مال تیار ہوتا ہے۔ پیداوار مانگ سے آگے نکل جاتی ہے۔ اشیا کی قیمتیں گرتی ہیں اور سرمایہ داری کا دفعدورہ ہوتا ہے۔ یا یوں کہو کہ سرمایہ داری کی لیلیٰ مر چکی ہے اور اسے دفنایا جا چکا ہے۔ ممکن ہے کبھی سرمایہ دار مجنوں واہ آہ کا نعرہ مارے اور ع

ٹھوکریں کھاتی ہوئی قبر سے لیلیٰ نکلے

اس چکر سے نکلنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک طرف غریب طبقے کی آمدنی بڑھائی جائے تاکہ ان کی قوتِ خرید میں اضافہ ہو۔ دوسری طرف ذرائع پیداوار کو نامناسب طور سے بڑھنے نہ دیا جائے۔ دونوں کام لارڈ کینز نے حکومت کے سپرد کیے۔

خیال رہے کہ لارڈ کینز انگریز تھے یعنی اس قوم کے فرد جس نے غیر مداخلت کا جھنڈا ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے تک بلند رکھا۔ ان کی کتابوں نے قبر کھود کر غیر مداخلت کے مردے کو گاڑ دیا ہے۔ ممکن ہے کبھی مردہ کفن پھاڑ کر چیخیں مارتا ہوا باہر نکل آئے مگر لیبر پارٹی اسے نکلنے نہ دے گی۔

بے ترتیب اور باترتیب نظاموں میں آپ کو کون سا پسند ہے۔ موجودہ نظام بے ترتیب ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ معاشی زندگی قواعد کی پابند نہیں۔ ہر کارخانے میں کام قواعد و ضوابط کے ماتحت ہوتا ہے۔ کھیتوں میں بیج ہر کسان اپنے اندازے سے ڈالتا ہے۔ انفرادی ترتیب و تنظیم ضرور ہے مگر مجموعی نہیں۔ مثال کے طور پر ایک کالج کو لیجیے۔ یونیورسٹی نے نصاب مقرر کیے ہوئے ہیں۔ پڑھائی کے گھنٹے مقرر ہیں۔ مقررہ وقت پر لیکچر ہوتے ہیں۔ امتحانات لیے جاتے ہیں، کالج کا ٹائم ٹیبل ترتیب اور تنظیم کا ایک نمونہ ہے۔ اگر ٹائم ٹیبل کھو جائے اور کسی کو یاد بھی نہ رہے پڑھائی ختم ہو جائے اور شور و غوغا بلند ہو۔ ہر کالج، اسکول یا درس گاہ ایک خاص منصوبے کے مطابق کام کرتی ہے مگر تعلیمی پیداوار

، لیے مجموعی پلان نہیں ہو۔ ملک کو صنعتی ماہروں اور انجنیروں کی ضرورت ہو لیکن کالج اور یونی ورسٹیاں محرر پیدا کیے جاتی ہیں۔ محرروں کی تعداد مانگ سے تجاوز کر جاتی ہے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ گریجویٹ جوتیاں چٹخاتے نوکریوں کی تلاش میں در بہ در مارے پھرتے ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں یہ حال دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے سے پہلے گریجویٹوں کا تھا۔

ایک اور مثال لیجیے۔ آپ اپنی تصویر کھنچوانی چاہتے ہیں۔ کتنے مصوروں کو بلائیں گے۔ آپ کہیں گے ایک کو۔ نہیں میری مانیے۔ سو مصوروں کو بلائیے۔ اور ان کے سامنے ایک ہی کاغذ یا کپڑا پھیلائیے جس پر تصویر اتاری جائے گی۔ ایک مصور آپ کے ایک کان کا نقشہ اتارے۔ دوسرا دوسرے کان کا۔ چار پانچ مصور جدا جدا ناک پکڑیں، پانچ سات سر کے بال، ہاتھ پاؤں کی انگلیاں جدا جدا مصوروں کے سپرد ہوں۔ نایاب تصویر تیار ہوگی۔

لغو تجویز ہے یا نہیں۔ مگر بے ترتیب نظام میں معاشی بہبودی کا نقشہ اسی طرح تیار ہوتا ہے۔ مصور ایک نہیں لاکھوں اور کروڑوں ــــــ ذرائع پیداوار کے مالک جدا جدا کام بھی نہیں کرتے۔ کوشش کرتے ہیں کہ اپنا کام بنے اور دوسرے کا بگڑے۔ میری جیت ہو اور رقیب کی ہار ــــــ کروڑوں روپیہ سال میں اشتہار بازی پر خرچ ہوتا ہے۔ اشتہار بازی سے نئی مانگ نہیں پیدا ہوتی۔ ایک کی بکری بڑھتی ہے تو دوسرے کی گھٹتی ہے۔ مجموعی نقطۂ نگاہ سے اس قسم کی اشتہار بازی کا فائدہ صفر کے برابر ہے۔

سرمایہ داری کا گھوڑا بے لگام دوڑے جا رہا ہے۔ اسے قابو میں کرنا حکومت کے اختیار میں ہے اور بغیر ذرائع پیداوار کو اپنے قبضے میں کیے ــــــ بحث کی خاطر مان لیجیے۔ کہ باترتیب نظام کو سرمایہ داری یا بے ترتیب نظام پر فوقیت حاصل ہے۔ معاشی نظام کی اس طرح تنظیم کرنا چاہتے ہیں کہ سود، مزدوری، شرح منافع، سرمایہ کا استعمال حکومت کے قابو میں ہوں۔ پیداوار مانگ کے برابر رہے۔ اور مانگ کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہے۔ اشیا کی قیمتیں مقرر رہیں اور غیر مناسب طور پر گھٹنے بڑھنے نہ پائیں۔ اگر معاشی نظام کی یہ شکل ہو تو سیاسی نظام کی شکل کیا ہوگی؟ باترتیب نظام اور جمہوریت پر ایک کتاب خاص طور پر قابلِ ذکر ہے: "کیا منصوبہ بندی جمہوری اصولوں پر قائم ہو سکتی ہے" (Can Planning be Democratis) یہ کتاب فے بیئن سوسائٹی کی طرف سے چھپی ہے اور چھ نامور مصنفوں کے مضمونوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ایک خاتون ہیں، باربرا ووٹن۔ انھوں نے منصوبہ بندی اور آزادی پر بحث کی ہے۔ لائق مضمون نگار نے منصوبہ بندی یا باترتیب نظام اور اشتراکی نظام میں فرق بتایا ہے اشتراکیت باترتیب نظام ہے۔ مگر باربرا ووٹن لارڈ کینز کی ہم خیال ہیں لکھتی ہیں کہ ذرائع پیداوار کو اپنے قبضے میں لائے بغیر باترتیب نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ مانگ مجموعی شکل اختیار کرے۔ مطلب یہ ہے کہ حکومت فیصلہ کرے کہ کیا کیا چیز کس کس مقدار میں اور کہاں کہاں تیار ہوگی۔ یہ ضروری نہیں کہ حکومت خود وہ اشیا پیدا کرے۔ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ لڑائی جیتنے کے لیے حکومت معاشی نظام کی باگ ڈور سنبھال لیتی ہے۔ اصطلاحی لفظوں میں مانگ مجموعی شکل اختیار کر لیتی ہے مگر ذرائع پیداوار ان کے مالکوں کے ہی قبضے میں رہتے ہیں۔

آگے چل کر وہ فرماتی ہیں کہ جہاں تک آزادی کا تعلق ہو بعض اصحاب کا خیال ہو کہ منصوبے بندی کے بغیر آزادی نصیب نہیں۔ اس کے برعکس اوروں کا خیال ہو کہ منصوبے بندی آزادی کا خاتمہ کر دیتی ہو۔ پارٹیوں کے بارے میں انھوں نے لکھا ہو کہ اکثر کہا جاتا ہو کہ ایک سے زیادہ پارٹی باترتیب نظام کے راستے میں رُکاوٹ ہو۔ باترتیب نظام ایک ہی ملک کا ہو — روس کا — اور روس میں ایک ہی پارٹی ہو۔ پھر وہ سوال اُٹھاتی ہیں کہ کیا باترتیب نظام قائم کرنے کے لیے پارٹی بندی کو مٹا دینا ضروری ہو۔ ان کا جواب ہو، نہیں مگر معاملہ پیچیدہ ہو۔ کیوں کہ پنج سالہ منصوبہ بنا کر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر چھٹے ہفتے ہم اپنی رائے بدل لیں۔ اگر سیاسی پارٹیوں کی موجودگی کے یہ معنی ہیں کہ ہر فیصلے کے بارے میں ہر چھٹے ہفتے ہم اپنی رائے بدل لیں تو لمبے عرصے کے لیے منصوبے بندی ناممکن ہو۔ مخالف پارٹی کے لیے جگہ ہوگی بہ شرطے کہ مخالف پارٹی منصوبے کی مخالفت نہ کرے۔

نتیجہ نکلا کہ اگر برطانیہ کا معاشی نظام بدلے گا تو جمہوریت بھی بدلے گی۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ برطانوی جمہوریت کیا شکل اختیار کرے گی۔ مگر برطانوی جمہوریت اور ہندُستانی جمہوریت میں فرق ہو۔ ممکن ہو برطانیہ میں دو پارٹیاں مِل کر باترتیب معاشی نظام چلا سکیں۔ ہندُستان میں ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ باترتیب نظام قائم کرنا اور چلانا خالہ جی کا گھر نہیں ٹیڑھی کھیر ہو۔ عملی طور پر جمہوریت میں جو پارٹی انتخاب میں فتح حاصل کرتی ہو، اپنی حکومت قائم کرتی ہو۔ اور کسی مسخرے کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ گدھوں کے لیے زیادہ سے زیادہ گاجریں مہیا کرتی ہو۔ گدھوں کو گاجریں شاید مرغوب ہیں۔ گدھوں اور گاجروں سے کیا مراد ہو۔ آپ سمجھتے ہیں۔ باترتیب نظام میں بھی گاجریں بانٹی جاتی ہیں۔ مگر گدھوں کے حصّے میں نہیں آتیں۔ جب روس میں منصوبے بندی شروع ہوئی تو ملک ماہروں کی جنّت بن گیا۔ ماہر روسی ہی نہیں تھے، امریکہ برطانیہ اور جرمنی سے بھی بُلائے گئے۔ ان کی رہائش کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا۔ معقول تنخواہیں دی گئیں۔ منصوبے بندی شروع ہونے سے پہلے صنعتی ملکوں میں روس کی گنتی نہ تھی، دس سال کے عرصے میں ماہروں نے روس کا صنعتی اور زراعتی نقشہ بدل دیا۔

باترتیب نظام دس یا پندرہ سال کے عرصے میں معاشی لحاظ سے ہندُستان کی کایا پلٹ کر سکتا ہو مگر شرط یہ ہو کہ نام نہاد جمہوریت کا خاتمہ ہو۔ جان اسٹوارٹ مِل نہیں چاہتا تھا کہ پارلی منٹ کے ممبروں کے لیے تنخواہیں مقرر ہوں۔ ہمارے ملک میں اسمبلیوں کی ممبری نوکری بن گئی ہو۔ ان نوکریوں کی خاطر انتخاب لڑے جاتے ہیں۔ انتخابات میں جیت ماہروں کی نہیں ہوتی۔ کس سائنس داں، انجنیر یا صنعتی ماہر کی جرات ہو کہ وہ انتخابات لڑنے کھڑا ہو، اور جرأت کرے بھی تو ان لوگوں کے پاس انتخاب جیتنے کے لیے وقت اور سرمایہ کہاں۔

ہماری جمہوریت میں حکومت ان لوگوں کی ہوگی جو خود اپنا ڈھول پیٹیں اور نت نئے سوانگ رچیں۔ اس طرح باترتیب نظام نہ کبھی قائم ہوگا اور کھڑا کیا بھی گیا تو چلے گا نہیں۔

———

نظری معاشیات

عالم گیر بازار اور قیمتیں

از: —— ایملی برنس

ہر ملک میں پیدائشِ اشیا کا کام برابر جاری رہتا ہے اور مطلوبہ اشیا کی پیداوار ہوتی رہتی ہے، اگرچہ یہ پیدائش ملک کی مطلوبہ مقدار سے کم یا زیادہ ہوسکتی ہے۔ مثلاً یورپ کے تقریباً ہر ملک میں کوئلہ پیدا ہوتا ہے مگر زیادہ تر ممالک میں ضرورت سے بہت کم پیدا ہوتا ہے صرف انگلستان اور جرمنی میں کافی مقدار میں کوئلہ فاضل بچ رہتا ہے جس سے کم کوئلہ پیدا کرنے والے ممالک کی ضرورت رفع ہوجاتی ہے۔

صنعتی اشیا کی پیدائش میں بھی یہی ہوتا ہے، ہر ملک میں ضرورت کی چیزوں کا کچھ حصہ ملک کے اندر ہی پیدا کیا جاتا ہے باقی دوسرے ممالک سے درآمد ہوتا ہے۔ اکثر خام چیزوں کی پیداوار میں بھی یہی ہوتا ہے۔ ایک ہی قسم کے خام مال کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جو مختلف اشیا کی پیدائش کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ صنعتی اشیا کی بھی بے شمار قسمیں ہوتی ہیں۔ اگر درآمد و برآمد پر حکومت کی عائد کی ہوئی پابندیاں نہ ہوتیں تو ہر ملک قریب قریب ایک ہی قسم کی چیز درآمد بھی کرتا اور برآمد بھی۔ جیسے پہلی جنگِ عظیم سے پہلے برطانیہ میں لوہا برابر درآمد ہوتا رہا گو کہ خود برطانیہ میں لوہا پیدا ہوتا ہے اور برآمد بھی کیا جاتا ہے، اسی طرح اکثر سوتی کپڑے درآمد ہوتے تھے گو کہ خود برطانیہ بہت بڑی مقدار میں سوتی کپڑے برآمد کرتی تھی۔

بین اقوامی مقابلے کی صورت میں ہر ملک اور ہر بازار میں اشیا کی قیمتیں تقریباً ہمیشہ یکساں ہوتیں۔ بیچنے والا خواہ کوئی بھی سکہ استعمال کرے پونڈ یا مارک، ڈالر یا فرینک سب کی قیمتیں جب سونے کے سکوں کی نسبت سے جانچی جائیں گی تو دو ملکوں میں ایک ہی چیز کی قیمت میں

کوئی فرق نہیں ہوگا ٹھیک اسی طرح جیسے ایک ہی ملک کی مختلف مِلوں اور کارخانوں کے مالک ایک ہی چیز کی شرح قیمت ایک سی طلب کریں گے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے اگر برطانیہ میں ایک جوڑے جوتے کی قیمت چوتھائی اونس سونے کے برابر ہے تو فرانس یا ریاست ہائے متحدہ کے مِل مالک اس سے زیادہ قیمت نہیں مانگ سکتے (یا ۸۶ء۴ ڈالر یا ۲۲/۵ ۲ فرینک، اگر ایسا ہو تو وہ اپنی چیز ہی فروخت نہ کریں۔ اس سلسلے میں خریدار کی انفرادی پسند یا ناپسند کا سوال اُٹھتا ہے۔ مگر اس سے تجارت کے عام رُخ پر جو قیمت کے ماتحت رہتی ہے کوئی اثر نہیں پڑتا) اور اگر بدیشی تاجر نے اس چیز کی قیمت مستقل طور پر ایک پونڈ کے مساوی سکّے سے کم کر دی ہے تو بالآخر برطانوی تاجر کو بھی تجارت جاری رکھنے کی غرض سے قیمت گرانا پڑے گی اور پھر یہی گری ہوئی قیمت عالم گیر معیاری قیمت بن جائے گی۔

کسی چیز کی قیمت ہمیشہ اتنے ہی عرصۂ محنت میں ڈھالے ہوئے سونے کے برابر ہوتی ہے جتنا عرصۂ محنت اُس چیز کی پیداوار میں صرف ہوتا ہے اور یہ عرصۂ محنت ہر ملک میں مختلف ہو سکتا ہے۔ مثلاً آج سے بہت پہلے لنکاشائر کے مشین کے بنے ہوئے کپڑوں میں ان ملکوں کی بہ نسبت بہت کم محنت اور وقت صرف ہوتا تھا جہاں کپڑے ہاتھ کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ اسی لیے برطانوی مال کا تاجر ہمیشہ دُوسرے ممالک کی بہ نسبت کم قیمت لگاکر بازاروں پر قبضہ کر لیتا اور جس ملک میں اس کا مال جاتا تھا وہ گری ہوئی قیمت عام قیمت بن جاتی تھی۔ جس کا سب سے پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اس ملک کے ہاتھ سے کپڑا بنانے والے کاری گر تباہ و برباد ہو گئے۔ نیز اس مُلک کے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنے ملک میں سوتی کپڑے کی مِلیں اور کارخانے کھولیں، تاکہ یہاں بھی لنکاشائر کی طرح کم عرصۂ محنت میں کپڑے تیار ہو سکیں اور پھر دونوں مُلکوں میں برابر کا مقابلہ ہو۔ یہ سلسلہ آج تک صنعتی ممالک اور پس ماندہ ممالک کے درمیان جاری ہے۔ روز بہ روز نئے نئے ممالک صنعتی ہوتے گئے اور عالم گیر بازار میں پُرانے صنعتی ممالک کے مدِ مقابل بنتے گئے۔

مختلف ممالک کے مِل مالکوں کے مابین جب مقابلہ جاری رہتا ہے تو ہر مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک ملک کا کوئی زبردست مِل مالک ایسی نئی تدبیرِ عمل میں لاتا ہے کہ اشیا کی پیدائش کا عرصۂ محنت نسبتاً کم ہو جاتا ہے اور تب اُس ملک کی برآمد اور وسیع ہو جاتی ہے، اور اس ملک کا مال دیگر ممالک کے بازار میں مزید اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ کیوں کہ چیز کی جتنی قیمت اس ملک نے مقرر کی ہے وہ کم عرصۂ محنت کو ظاہر کرتی ہے یعنی اس عرصۂ محنت سے کم جتنا اس کی پیدائش کے لیے اوسطاً درکار ہوتا ہے۔

مگر جلد ہی پیدائش کی اس نئی تنظیم پر یکے بعد دیگرے تمام ممالک عمل پیرا ہونے لگتے ہیں جس سے پھر ایک ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس چیز کے پیدا کرنے والے تمام ممالک میں تقریباً یکساں عرصۂ محنت صرف ہونے لگتا ہے جس سے اس کی ایک نئی عالم گیر قیمت مقرر ہو جاتی ہے اور وہ پہلی قیمت سے کم ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پہلی عالم گیر جنگ سے پہلے بھی اس عمل میں تھوڑی بہت رُکاوٹ ضرور ہوتی تھی۔ آزاد تجارت میں

سب سے زیادہ رخنہ ڈالنے والی چیز اگر تھی تو جنگی کی پابندیاں تھیں جو بعض ممالک میں کچھ چیزوں پر اور اکثر میں تمام اشیا پر عائد تھیں اس کی وجہ سے قیمتوں کا عالمگیر معیار قائم ہونے میں سخت رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ جن اشیا پر دوسرے ملکوں سے درآمد کے وقت محصول ادا کرنا پڑتا تھا ان کی قیمت درآمد کرنے والے ملک میں اُن کی حقیقی قدر مبادلہ سے زیادہ ہوتی تھی (قدر مبادلہ مبنی ہوتی ہے اُس عرصۂ محنت پر جو کسی چیز کے پیدا کرنے میں صرف ہوتا ہے) اس طرح اکثر اشیا کی قیمت درآمد کرنے والے ملک میں برآمد کرنے والے ملک کے مقابلے میں زیادہ ہو جاتی تھی مگر جو اشیا درآمد ہونے کے علاوہ خود ملک میں بھی پیدا کی جاتی ہیں اُن کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ درآمدی مال کی قیمت مقابلے کی وجہ سے پھر گھٹ کر اُسی معیار پر آجاتی ہے جو اس کی حقیقی قدرِ مبادلہ کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ وہ اُس اوسط عرصۂ محنت کو ظاہر کرنے لگتی ہے جو اس چیز کی پیدایش میں صرف ہوتا ہے۔

دوسری چیز جس نے ملک کے اندر نیز عالمگیر بازار میں آزاد مقابلے کو روکا وہ اجارے داری تھی۔ جب کوئی واحد کمپنی یا متعدد کمپنیاں مل کر کسی خاص صنعت میں اجارے داری قائم کر لیتی ہیں تو وہ اشیا کی قیمت اُس حد سے بڑھا دیتی ہیں جو اس کی پیدایش میں صرف ہونے والے عرصۂ محنت کے مساوی ہوتی ہے۔ وہ مصنوعی طور پر اشیا کی قلت ظاہر کرتی ہیں اور اس بہانے اس مخصوص چیز کی قیمت کو بڑھنے پر مجبور کرتی ہیں اور اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ طلب کی زیادتی کے باعث اشیا کی قیمتیں یونہی بڑھی ہوتی ہیں لیکن وہ مصنوعی طور پر قیمت کو اور بھی بڑھا دیتی ہیں۔ اجارے داری کے ذریعے پیدایش اور عرصۂ محنت کی کفایت ہوتی ہے جس کے باعث چیزوں کی قیمت کو اصولاً گرنا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ جہاں مخالف گروہ موجود ہوتے ہیں (مثلاً امریکہ کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی اور برطانیہ و ہالینڈ کا رائل ڈچ شل) وہاں شدید مقابلوں کے دور آتے ہیں۔ اس صورت میں تیل کی قیمت قدرِ مبادلہ سے بھی کم کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد دونوں کاروباریں بازار کو بانٹ لینے یا مقابلے کو کسی دوسرے طریقے سے بند کرنے کا معاہدہ ہو جاتا ہے تب اجارے داری کا اثر یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ قیمتیں بڑھتی ہیں حتیٰ کہ قدر سے بھی تجاوز کر جاتی ہیں۔

آزاد تجارت میں اجارے داری اور جنگی کی پابندیوں کے علاوہ (جن کا نتیجہ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اشیا کی قیمتیں قدر سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں) مستقل قسم کے معاشی تعلقات کی وجہ سے بھی برابر رخنہ پیدا ہوتا رہتا ہے جو صحیح معیار پر قیمتوں کے مقرر ہونے سے مانع ہوتے رہتے ہیں۔ حال آں کہ پیدایش کے فن میں مسلسل اصلاح و ترقی کی وجہ سے ہر چیز کی پیدایش میں محنت کا صرفہ کم ہوتا جاتا ہے اور اس لحاظ سے چیزوں کی قیمت کم ہونی چاہیے۔ یہ مستقل معاشی تعلقات کیا ہوتے ہیں اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ برطانوی سرمایے کا کافی حصہ ارجنٹائن میں ریلوں کے بنانے میں صرف ہوا ہے۔ اس سرمایے کا نفع جو ریل کی آمدنی کا ایک حصہ ہے ارجنٹائن ہی کے سکّے میں مل سکتا ہے یعنی "پیسو" میں۔ لیکن اس منافع کو برطانیہ میں خرچ اور استعمال کرنے کے لیے پیسو کو پونڈ میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک ارجنٹائن اس مبادلے کے لیے کچھ سونا (جو ارجنٹائن میں نہیں ہے) یا کوئی اور مال برطانیہ میں نہ بھیجے جو وہاں کے پونڈ کے بدلے

فروخت کیا جاسکے اس وقت تک پیسو کی صورت میں حاصل کیے ہوئے منافع کو پونڈ میں نہیں بدلا جاسکتا۔ چناں چہ ارجنٹائن میں بینکوں کی مدد سے گوشت برآمد کرنے کی صنعت کو ترقی دی گئی تاکہ وہاں کا گوشت انگلستان میں پونڈ کے بدلے بکے اور اس طرح جو پونڈ حاصل ہو اُسے ارجنٹائن کی ریلوں کے منافع کے طور پر لے لیا جائے۔ لہٰذا یہ ضروری ہوگیا کہ گوشت برطانیہ میں فروخت ہو ورنہ برطانیہ کو ریلوں کا منافع نہیں مل سکتا تھا۔ حالاں کہ یہ بات برطانوی نوآبادیات کے مفاد کے خلاف تھی اس لیے کہ وہ برطانیہ میں خود اپنے مال کے لیے بازار چاہتی تھیں۔

اس قسم کے تعلقات صنعتی لحاظ سے اہم ملک اور ان ممالک کے درمیان قائم تھے جہاں اوّل الذکر نے اپنا سرمایہ سود پر لگا رکھا تھا۔ اس طرح ان ملکوں نے آپس میں مستقل اور بندھے ہوئے بازار بنا رکھے تھے جو عالم گیر بازاروں سے مستثنا تھے، اور جو دنیا کی رسد اور عام قیمتوں کی تبدیلی سے بہت دیر میں متاثر ہوتے تھے۔

لیکن ان تمام پابندیوں کے باوجود ایک وسیع عالم گیر بازار ایسا تھا جو ہر نئے آنے والے کے لیے کھلا ہوا تھا اور برابر وسیع ہوتا جاتا تھا اور ساتھ ہی جب نئے مقابلہ کرنے والے اپنی خام اجناس اور صنعتی پیداوار کو لے کر بازار میں داخل ہوتے تو اشیا کی برآمدی قیمتوں کا معیار شدید مقابلے کے باعث اس معیار سے بھی گرنے لگ جاتا جو اندرونِ ملک کے بازار میں مقرر کی گئی تھی۔ اگر کسی ملک میں اجارے داری ہوتی یا مستحکم تجارتی تعلقات قائم ہوتے تو لوگ ملک کی اندرونی قیمت کو بڑھا کر مزید منافع اُٹھاتے تاکہ گری ہوئی برآمدی قیمت کا نقصان پورا کیا جائے۔ یعنی اشیا کے لیے کسی بھی قیمت پر خواہ وہ قدر سے کم ہی کیوں نہ ہو بازار حاصل کیا جائے اور برآمد سے جو نقصان ہوا اس کا خود اپنے ملک میں چیزوں کو بڑھی ہوئی قیمت پر فروخت کرکے ازالہ کیا جائے۔

جن ممالک کو یہ اشیا برآمد کی جاتیں وہاں اُن کی قیمتوں پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ اکثر لوگ عالم گیر بازار کی بات کرتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ اِس عالم گیر بازار کا وجود خود انھی مختلف ممالک کے بازاروں سے علاحدہ تو ہے نہیں جو دوسرے ممالک کی بنائی ہوئی اشیا درآمد کرتے ہیں! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کنیڈا یا ریاست ہائے متحدہ سے گیہوں جہاز پر لدوا دیا گیا، اگرچہ اس کی کوئی خاص منزلِ مقصود متعین نہیں ہوتی۔ جہاز کا مالک گیہوں لے کر عالم گیر بازار یا کم از کم یورپ کی منڈیوں کو لے جاتا ہے وہ کسی یورپی ملک کے ایسے خریدار کو تلاش کرتا ہے جو اس کے گیہوں کو خرید لے اور جب اسے قابلِ اطمینان اور اونچی قیمت دینے والا خریدار مل جاتا ہے تو وہ وائرلس کے ذریعے جہاز کو اس ملک یا کسی مخصوص بندرگاہ پر لے جانے کی ہدایت کرتا ہے جب تک اس ملک میں جہاز کے مالک کو خریدار نہیں ملتا اُس وقت تک وہاں کی قیمتوں پر عالم گیر منڈیوں کی قیمتوں کا کوئی براہِ راست اثر نہیں پڑتا۔ مگر جونھی یہ گیہوں اس ملک میں آترتا ہے وہاں کی رسد اور طلب کی حالت اور قیمتوں پر اس کا اثر پڑنے لگتا ہے۔

مگر صنعتی پیداوار کی صورت میں اشیا کے لانے لے جانے کا طریقہ مختلف ہے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ صنعتی اشیا کسی ملک سے

فروخت کی بات چیت طے کیے بغیر جہازوں میں بھر کر عالم گیر بازار کو نہیں روانہ کی جاتیں۔ وائرلس اور تار برقی کے ذریعے جب ہر ملک سے درخواستیں آتی ہیں تو تمام اشیا کے لیے بلکہ اکثر ایسی اشیا کے لیے جو ابھی کارخانوں اور ملوں سے باہر بھی نہیں آتی ہیں عالم گیر بازار پیدا ہوجاتا ہے۔ جب عالم گیر بازار کی قیمت کسی ملک میں تحقیقی صورت میں ظاہر ہوتی ہے یعنی جب عالم گیر بازار کے داموں پر پیش کیا ہوا سامان ملک کے اندر آتا ہے تو اس ملک میں قیمتوں کے معیار پر فوراً اثر پڑتا ہے۔

جب عالم گیر بازار وسیع ہوگیا اور اس کے ساتھ ساتھ سامانِ درآمد و برآمد میں اضافہ ہوا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عالم گیر بازار یا کسی خاص ملک کے بازار کی قیمتوں میں کوئی شدید قسم کا گھٹا و بڑھاؤ ہوتا تو اس کا اثر فوراً دوسرے ممالک کی قیمتوں پر پڑنے لگا اور کسی ایک ملک کی گرم بازاری یا سرد بازاری تمام ممالک کی حالتوں پر اثر انداز ہونے لگی۔

پہلی عالم گیر جنگ سے قبل تمام اہم ممالک میں جہاں سونے کا معیار قائم تھا یہی صورت حال تھی کیوں کہ زر کی تمام معیاری اکائیوں میں سونا ایک عام جز ہونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جدا جدا ممالک میں جنگی اور محصول، اجارہ داری، محدود اور بندھے ہوئے بازار اور برآمد کی پابندیوں کے باوجود قیمتوں کا معیار تقریباً ایک ہی سا ہوتا تھا۔ مگر جنگ کے دوران میں اور جنگ کے بعد یک سرنئی حالتیں رونما ہونے لگیں، بین اقوامی تجارت اور عالم گیر بازار کی قیمتوں کی نقل و حرکت میں نئی بندشیں حائل ہونے لگیں اور ہر ملک کی قیمت میں اور عالم گیر بازار کی قیمتوں کے مابین جو نزدیکی رشتہ قائم تھا وہ بھی ختم ہونے لگا۔

(مترجمہ حمیدہ نقوی)

مسائلِ حاضرہ (غیر ممالک)

سرمایہ کاری اور اجتماعی ملکیت

از: ——— ی۔ کیسیموسکی

پہلی جنگِ عظیم میں روس میں ٹینک اور ہوائی جہاز بالکل نہیں بنتے تھے، لیکن دوسری جنگِ عظیم میں ہزاروں کی تعداد میں بنے۔ سنہ ۱۹۱۴-۱۷ء میں وہاں سال بھر میں صرف ۴ ہزار بندوقیں بنتی تھیں لیکن دوسری جنگِ عظیم میں ہر سال اس سے تیس گنی تعداد میں بنیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں ہر سال صرف نو ہزار مشین گنیں روس میں ڈھالی گئیں۔ اور دوسری جنگِ عظیم میں اس سے پچاس گنی تعداد میں۔ ساتھ ہی ۱۶ گنے زیادہ مارٹر، اور ۱۵ گنے زیادہ بم، مائن اور گولے بنائے گئے۔

۲۵ سال کے مختصر سے عرصے میں کیوں کر یہ تبدیلی رونما ہوئی؟ وجہ یہ تھی کہ ملک میں بڑے پیمانے پر صنعتیں کھولی گئیں اور سوویت یونین معاشی لحاظ سے دوسرے ملکوں کا دست نگر نہیں رہا۔ لیکن اس سے بھی اہم وجہ یہ تھی کہ سوویت یونین میں جو بھی صنعتیں کھولی گئیں وہ اشتراکی بنیاد پر جس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بھاری صنعتیں، یعنی مشینیں اور کلیں ڈھالنے کی صنعت پہلے کھولی گئی۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ اس میں عظیم سرمائے کی ضرورت تھی۔ سرمایے کے بغیر اشیاے اصل کی صنعتوں کا کھولنا غیر ممکن تھا۔ اس مضمون میں ہم اسی سے بحث کریں گے کہ سوویت یونین کی حکومت نے اتنا سرمایہ کس طرح اکٹھا کیا۔ اس سلسلے میں یہ جاننا بھی دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ دوسرے غیر اشتراکی ملکوں میں صنعتوں کے اجرا کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے کا کون سا طریقہ اختیار کیا گیا۔

برطانیہ نے اپنی صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے اپنی نوآبادیات اور محکوم ملکوں کو لوٹ کھسوٹ کر سرمایہ فراہم کیا۔ سینکڑوں

سال تک برطانیہ اُن ملکوں سے سرمایہ وصول کر کرکے اپنی صنعتوں میں لگاتی رہی اور اس طرح اپنی صنعتی توسیع کا کام انجام دیتی رہی۔ جرمنی نے شکست خوردہ فرانس سے (سنہ ۱۸۷۰ء میں) ۵ ارب فرینک (فرانسیسی سکّہ = ۹½ پنس کے) وصول کرکے اپنی صنعتوں میں لگایا۔ انقلاب سے پہلے کی روسی حکومت نے صنعتوں کی ترقّی کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ملک میں غیر ملکی سرمایہ داروں اور کاروبار کرنے والوں کو سرمایہ لگانے اور کاروبار کرنے کی اجازت دی۔ چناں چہ نومبر سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے روس کی لوہے اور اسٹیل کی صنعت کا تین چوتھائی حصہ غیر ملکی سرمایہ داروں کے قبضے میں تھا، تیل کی پیداوار کا ساٹھ فی صدی حصہ بیرونی فرم کی ملکیت اور نگرانی میں تھا، اور ڈونباس کی تقریباً پوری کوئلے کی صنعت میں غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا تھا۔

اب ہم سوویت یونین کے سرمایہ فراہم کرنے کے طریقے سے بحث کریں گے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ سوویت یونین نے کوئی بھی مندرجہ بالا طریقہ نہیں اختیار کیا۔ ایک طریقہ اور رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ دوسرے ملکوں سے قرضے لیے جائیں، لیکن انقلاب کے بعد جو مزدور حکومت قائم ہوئی اُسے بھلا سرمایہ دار ممالک کیوں قرضہ دینے پر راضی ہوتے۔ چناں چہ مطالبے کے باوجود امریکہ اور برطانیہ نے سوویت یونین کی حکومت کو قرضہ دینے سے انکار کردیا۔ اب سوویت یونین کو اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ملک کے اندرونی ذرائع اور وسائل سے کام لے۔ تمام دنیا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سوویت یونین میں پہلے ہی پنج سالہ منصوبے کے تحت ۲۵ ارب روبل صنعتوں میں لگائے گئے اور دوسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت ۶۶ ارب روبل۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ عظیم سرمایے کہاں سے حاصل کیے گئے؟ بات اصل یہ ہے کہ سوویت یونین میں تمام صنعتیں، کارخانے، ملیں، بینک، ذرائع نقل و حمل، بیرونی و ملکی تجارت ریاست کی ملکیت میں ہیں، چناں چہ ان تمام چیزوں سے جو منافع حاصل ہوا اسے ریاست نے سرمایے کے طور پر پھر صنعتوں ہی میں لگا دیا۔ سرمایہ دار ملکوں میں یہی منافع انفرادی سرمایہ داروں کے معدے میں چلا جاتا ہے اور پوری قوم کی بہبودی کے لیے صرف نہیں ہوتا، اس لیے سرمایہ دار ملکوں میں صنعتوں کی توسیع و ترقّی کے لیے فراہمیِ سرمایہ کا مسئلہ[1] بے حد مشکل ہوتا ہے۔

سوویت حکومت نے فراہمیِ سرمایہ کے لیے ہر شعبے میں سخت قسم کی کفایت شعاری سے بھی کام لیا جس سے محفوظا سرمایے میں دن بہ دن زبردست اضافہ ہوتا گیا۔ سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء میں یعنی صرف ایک سال میں کوئی ایک ارب روبل صنعتی توسیع و ترقی کے کام میں لگایا گیا اور دوسرے سال ۵ ارب روبل۔

---

[1] آج ہندستان کے سامنے بھی یہی مسئلہ ہے۔ کیا ہندستان کی "آزاد" قومی حکومت سرمایہ داروں سے منافع کی عظیم رقمیں چھین کر قومی صنعت و حرفت میں لگانے کے لیے تیار ہے؟ ایڈیٹر

دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں ۳۰ ارب روبل مختلف صنعتوں میں لگائے گئے۔ اس کا تقریباً نصف حصہ یعنی کوئی ۱۵ ارب روبل اس رقم پر مشتمل تھا جو صنعتوں سے منافع کے طور پر حاصل ہوئی تھی۔ منافع کے بڑھتے رہنے کی وجہ یہ تھی کہ پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا اور پیدائش کے اخراجات گھٹتے گئے۔ سرمایے کی فراہمی کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ خود ملک کے اندر پبلک سے قرضے لیے گئے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں سوویٹ یونین کے عوام نے صنعتوں میں لگانے کے لیے اپنی جیب سے کوئی ۶ ارب روبل نکالے اور دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ۱۰۸۱ ارب روبل۔ سیونگ بینک کے جمع میں بھی اضافہ ہوتا گیا جو صنعتی ترقی کے کام میں لگایا گیا۔ تھوڑی سی رقم ٹیکس کے ذریعے بھی وصول کی گئی، لیکن بہت قلیل۔ ٹیکس کی رقم سرکاری آمدنی کے صرف ۵ فی صدی حصے پر مشتمل تھی۔ زیادہ تر سرمایہ صنعتوں کے منافعوں اور اندرونی قرضوں سے حاصل کیا گیا۔ یہ ہر صنعتی ترقی کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا اشتراکی طریقہ جو سرمایہ دار ملکوں کے طریقہ کار سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

بے روزگاری

بے روزگاری

از: ——— مظہر ح۔ یوسف، بی۔ اے

بے روزگاری کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ ذاتی ملکیت کے آنے سے پہلے عہدِ قدیم کی معیشت میں بھی کچھ نہ کچھ بے روزگاری ضرور رہی ہوگی۔ عہدِ متوسط میں بھی ہمیں بے روزگاری کے آثار ملتے ہیں۔ اُس زمانے میں یورپ میں کاریگروں اور تاجروں کی انجمنوں کا ایک یہ بھی کام تھا کہ بے روزگاروں کے لیے امداد اور بھتّے کا انتظام کرے۔ لیکن اُس زمانے اس مسئلے کی وہ شکل نہیں تھی جو آج ہے۔ اُنیسویں اور بیسویں صدی میں مشینوں کا استعمال بہت بڑھ گیا، کام کرنے والوں کی تعداد کم کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے تاکہ اخراجاتِ پیدایش میں بچت کی صورت پیدا ہو اور اُسی حساب سے منافع میں اضافہ ہو، پیدایشِ اشیا کے فن اور طریقے میں بھی تبدیلی اور ترقّی ہوئی جس سے کم محنت سے زیادہ چیزیں پیدا ہونے لگیں۔ ان چیزوں نے مل کر بے روزگاری کے مسئلے کو ایک نئی شکل اور ایک نئی نوعیت دے دی۔ اِس سے پہلے بے روزگاری کی وجہ آدمی کی کاہلی اور سستی بتائی جاتی تھی یا اُسے خدا کی مرضی سے منسوب کیا جاتا تھا۔ لیکن اب لوگوں کی سمجھ میں آگیا ہے کہ بے روزگاری کی وجہ یہ ہے کہ معاشی نظام کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بنانے سے انکار کیا جاتا ہے۔ بے روزگاری خود ہماری خواہش کا نتیجہ نہیں ہے۔ حالات ہمیں بے روزگار رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اِس کی ذمّے داری فرد پر نہیں عائد ہوتی بلکہ سماج اور ریاست پر۔

اس وقت دنیا کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہر شخص کو کام ملے اور کوئی بھی کام کرنے کے قابل شخص بے روزگار نہ رہے بہت سے

ملکوں میں بڑے بڑے ماہرینِ معاشیات نے مکمل روزگار کی صورت پیدا کرنے کے لیے تجویزیں اور منصوبے مرتب کیے ہیں۔ تمام معاشیین اس بات پر متفق ہیں کہ "معاشی لحاظ سے اگر چین اور امن قائم ہوسکتا ہے تو صرف اِس صورت میں کہ مکمل روزگار کے حالات پیدا ہوں اور وہ تمام سماجی فائدے لوگوں کو حاصل ہوں جو مکمل روزگار ہمیں عطا کرتا ہے"۔ کسی مرد یا عورت کے لیے اس سے زیادہ تباہ کن احساس اور کوئی نہیں کہ سماج کو میری ضرورت نہیں ہے۔

پروفیسر پیگو نے "مکمل روزگار" کی یوں تعریف کی ہے:۔ "یہ ایسی حالت کا نام ہے جس کے تحت ہر کوئی رائج شرح مزدوری پر کام کرنے کے لیے تیار ہو اور کام کر رہا ہو"۔ مکمل روزگار کی صورت میں بھی اتنے گنے لوگ بے روزگار رہ سکتے ہیں لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ مکمل روزگار کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کام کرنے والوں کی ضرورت زیادہ ہو اور کام کرنے والے کم ہوں، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ کارکنوں کی طلب کی صحیح اور مناسب تنظیم ہو۔ موخر الذکر چیز عام بے روزگاری کا قلع قمع کرتی ہے جو ہمارے زرعی نظامِ پیدائش کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

گزشتہ ڈیڑھ سو سال کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ ذاتی کاروبار والی معیشت میں جس میں ریاست بالکل مداخلت نہ کرے مکمل روزگار کا حصول تقریباً ناممکن ہے۔ روس نے خاص طور پر اس قسم کی معیشت کی جڑ کاٹ دی ہے اور رائج نظامِ طلب کو توڑ پھوڑ کر ایک نئی معیشت کی بنا ڈالی ہے۔ انقلاب کے بعد روس نے اپنی "نئی معاشی پالیسی" کے ذریعے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ بے روزگاری خود بخود غائب ہوگئی۔ ذاتی کاروبار کو چاہے برقرار رکھا جائے لیکن اگر اس پر ریاست کی نگرانی قائم رہے تو مکمل روزگار پیدا ہوسکتا ہے۔ اس طرح برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ میں بھی مکمل روزگار کے حالات پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ اگر صنعت و تجارت اور دوسرے معاشی امور پر ریاست قابو رکھے تو بے روزگاری کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ اِسی سے ایک قومی معاشی پالیسی کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج میں مصارف کو ہمیشہ اور مسلسل طور پر برقرار رکھا جائے۔ یہ مصارف اتنے کافی ہوں کہ صنعتی پیداوار کے لیے مانگ برابر موجود رہے۔ ایسی صورت میں مانگ کی تسکین کے لیے اس بات کی ضرورت ہوگی کہ پیدائش اشیا کے کام میں ملک کے تمام لوگ مصروف رہیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے کام کی تعداد یا مقدار کام کرنے والوں کی تعداد کے مساوی ہوگی یا اُس سے زیادہ۔ لیکن اتنے مصارف کو برقرار رکھنا محض ذاتی کاروبار کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے ریاست کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی نگرانی میں مصارف پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی کوشش کرے تاکہ تمام لوگوں کو مصروف رکھا جاسکے اور بے روزگاری نہ پیدا ہو۔

ولیم بیورج کہتا ہے کہ مکمل روزگار کے حالات پیدا کرنے کے لیے ریاست کے لیے ایک نئے قسم کا بجٹ تیار کرنا ضروری

ہے، ایسا بجٹ جس کی بنیاد ملک میں افراد کی تعداد سے متعلق اعداد و شمار پر ہو۔ ریاست کی آمدنی اور خرچ کا مکمل روزگار پیدا کرنے کے کام سے گہرا تعلق ہے۔ پُرانے قسم کے بجٹ میں صرف سال بھر کی سرکاری آمدنی اور خرچ سے بحث کی جاتی ہے لیکن ایسا بجٹ جس کا مقصد مُلک میں مکمل روزگار کے حالات پیدا کرنا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قومی آمدنی، پیدائش اشیا اور صرفِ اشیا ـــ ان تمام عناصر پر حاوی ہو۔ اس قسم کے بجٹ میں لچک کا ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اُسے طویل عرصے کی حاجتوں کا خیال رکھ کر بنایا جائے۔ اس قسم کے بجٹ میں آمدنی سے کہیں زیادہ خرچ کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے اور ریاست کی اندرونی اور بیرونی قرض داری بڑھ سکتی ہے مگر اس سے کوئی نقصان نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان رقموں کو ایسی چیزوں پر صرف کیا جائے جو ملک کے لیے دائمی اور مستقل سرمایے کی حیثیت رکھتی ہوں، مثلاً سڑکیں، اسکول، اسپتال وغیرہ۔ یا پھر انھیں صارفین کی مالی امداد میں خرچ کیا جائے۔ مکمل روزگار پیدا کرنے کے لیے بجٹ کو جامع اور حسبِ ضرورت بنانے کے علاوہ ٹیکس کو بھی ایک نئے سسٹم کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہوگی۔

مکمل روزگار کے حالات کو وجود میں لانے کے لیئے ملک کی پوری معیشت کو ایک نئے انداز سے چلانے کی ضرورت پیش آئے گی، مثلاً صنعت اور تجارت وغیرہ کو کسی خاص منصوبے کے تحت چلانا ضروری ہوگا۔ قومی معیشت کی توسیع و ترقی کے لیے وسیع بنیاد پر منصوبے بندی کے بغیر کام نہیں چل سکتا، طویل عرصے کی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نئے معاشی رجحانات متعین کرنے ہوں گے، یہ طے کرنا ہوگا کہ کن سروسوں اور صنعتوں کو پھیلایا جائے اور کن کو گھٹایا جائے۔ یہ عام غلط فہمی ہے کہ اس قسم کی منصوبے بندی سے معاشی ترقی میں رُکاوٹ پیدا ہوگی۔ اس قسم کی منصوبے بندی کا مقصد دراصل یہ ہے کہ چند معیّنہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مُلک کی معاشی سرگرمیوں کو ایک خاص راستے پر لے جایا جائے۔ اس سے رُکاوٹ کی بہ جائے معاشی زندگی میں اور توسیع ہوگی۔ مکمل روزگار کے لیئے مُلک کی بیرونی تجارت کو بھی خاص اصولوں کے مطابق چلانا ضروری ہوگا، اُسے بے لگام دنت کی طرح آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ پہلے تجارتی عدم توازن کو دُور کرنے کے لیے تحدید و تخفیف کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا یعنی درآمد میں کمی کر کے درآمد اور برآمد میں توازن اور ہم سطحی قائم کر دی جاتی تھی۔ یہ توازن ایک ایسی سطح پر آکر قائم ہوتا تھا جہاں درآمد اور برآمد دونوں بہت گھٹ جاتی تھیں، لیکن مکمل روزگار کے حالات پیدا کرنے کے لیے اب نہیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا یعنی تجارتی عدم توازن کی صورت میں درآمد کو گھٹانے کی بہ جائے برآمد ہی کو بڑھا کر ایک بلند سطح پر توازن قائم کرنا پڑے گا، تاکہ درآمد اور برآمد دونوں خوب بڑھتی رہیں۔

مکمل روزگار کے مقصد کے پیشِ نظر ہر فرد کے لیے ریاست کی طرف سے مالی تحفظ کا انتظام کرنا بھی ایک ضروری چیز ہے۔ سماجی تحفظ کا مطلب ہے لوگوں کی ضرورتوں کو رفع کرنا۔ اس کے لیے متعدد کارروائیوں کی ضرورت پیش آئے گی:۔ ریاست

کی طرف سے انشورنس کا انتظام ہو، بے روزگاری اور با روزگاری دونوں حالتوں میں آمدنی کو خاندان کی ضروریات کے مطابق بنایا جائے، بچّوں کے لیے بھتّے کا اور بوڑھوں کے لیے پنشن کا انتظام کیا جائے۔ انگلستان میں سماجی تحفّظ کے لیے سرولیم بیورج نے جو منصوبہ پیش کیا ہے اُس میں یہ تمام چیزیں موجود ہیں۔ یہ منصوبہ دراصل ایک ایسے درخت کا پھل ہے جس کے بیج بہت پہلے ڈال دیے گئے تھے، دراصل اس چیز کی ابتدا امدادِ غربا کے قانون سے ہوتی ہے۔ دعوا کیا گیا ہے کہ اِس منصوبے کے تحت ماں کے پیٹ سے لے کر قبر تک ہر شخص کی معاشی دیکھ بھال کی جائے گی۔ لیکن عملی لحاظ سے یہ منصوبہ کس حد تک کام یاب ہوتا ہے اس کا انتظار ہے۔

لیکن گزشتہ جنگ نے اور تمام چیزوں سے متعلق ہمارے نظریوں کو بدلنے کے ساتھ ساتھ مکمّل روزگار کے مسئلے کو بھی ایک نئی شکل میں پیش کر دیا ہے اور اس سے متعلق ہم اپنے پُرانے نظریے بدلنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ سب سے اہم بات جو ہم پر واضح ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف مُلکوں نے اگر علاحدہ علاحدہ طور پر بے روزگاری دُور کرنے کے لیے منصوبے بندی کی کوشش کی اور اُن کی کوششوں میں باہمی تعلّق اور ہم آہنگی نہیں ہوئی تو ناکامی یقینی ہے۔ جنگ نے عالم گیر معیشت کو درہم برہم کر دیا ہے اور دنیا دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طرف تو امریکہ اور انگلستان ہیں جو صنعتی لحاظ سے بہت آگے ہیں۔ امریکہ کی اندرونی معیشت کے لیے جو خطرے کی بات ہے وہ قوتِ پیدائش کی زیادتی ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں جنگی معیشت کو بدل کر امن کے زمانے کے حالات کے مطابق بنانا کافی دِقّت آمیز ثابت ہو رہا ہے۔ اگر ملازمتوں سے لوگوں کو برخاست کیا گیا اور پیداوار کو گھٹانے کی کوشش کی گئی تو زبردست بے روزگاری کے پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ چناں چہ دونوں ممالک ایسا کرنے سے احتراز کر رہے ہیں۔ —— واحد صورت یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں جو پیدائشِ اشیا کی حالت تھی اُس کو برقرار رکھا جائے لیکن اس کے لیے بازار کی ضرورت ہے، ایسے بازار کی ضرورت جس میں طلب اِس وقت سے بھی زیادہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ بازار کہاں ہے؟

دُوسری طرف ایشیا کے پچھڑے ہوئے ممالک ہیں جو صنعتی لحاظ سے بہت پست حال ہیں، خاص کر ہندُستان اور چین۔ ان دونوں ممالک کے قدرتی ذرائع بہت وسیع ہیں لیکن انھیں استعمال نہیں کیا گیا ہے اور دونوں ملکوں میں آبادی بھی بہت گھنی ہے۔ لیکن یہاں معیارِ زندگی پست ہے اور غربت کے باعث اشیا کی طلب زیادہ نہیں ہے۔ اسی زمرے میں مرکزی یورپ کے وہ ممالک بھی شامل ہیں جن کی معیشت کو جنگ نے تباہ و برباد کر دیا ہے۔ جنگ سے پہلے اُن کی حالت چاہے بہت اچھی رہی ہو لیکن اِس وقت تو وہ چین اور ہندُستان سے بھی بدتر حالت میں ہیں۔ اِن ملکوں کو سرمایہ کاری کے لیے عظیم سرمایوں کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی یہ ممالک بنیادی صنعتوں کو اور اندرونی و بیرونی تجارت کو قومی ملکیت بنانا چاہتے ہیں، تاکہ بے روزگاری دُور ہو اور اشیا کی طلب بڑھے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جب تک اِن ملکوں میں بڑے پیمانے پر سرمایہ لگا کر اشیا کی طلب نہیں

بڑھائی جائی اس وقت تک امریکہ اور برطانیہ میں مکمل روزگار کے حالات نہیں برقرار رکھے جاسکتے۔ اس لیے کہ ان ملکوں کی ترقی کے بغیر برطانوی اور امریکی اشیا کے لیے بازار نہیں مل سکتا۔ اس کا حل یہ ہو کہ امریکہ ان پست حال ملکوں کو کم عرصے کے لیے قرضے دے لیکن اُن کی واپسی کا مطالبہ نہ کرے۔ بین اقوامی تعاون اس وقت شدید طور پر ضروری ہو، اس کے بغیر نہ تو پست حال ملکوں میں مکمل روزگار پیدا کیا جاسکتا ہو اور نہ ترقی یافتہ ملکوں میں۔ بہ قول ابراہم لنکولن، جسے جدید جمہوریت کا باوا آدم قرار دیا گیا ہو، اس حالت میں کبھی بھی امن نہیں برقرار رکھا جاسکتا کہ آدھی دنیا بھوک اور مفلسی کا شکار ہو اور آدھی دنیا خوش حال رہے۔ اگر خوش حالی آئے گی تو سب کے لیے ورنہ کسی کے لیے تحفظ نہیں ہو۔

معاشی صورتِ حال

۱۔ ریلوے بجٹ
۲۔ مالک اور مزدور
۳۔ بیرونی سکّے کے خرچ پر سرکاری نگرانی
۴۔ برطانیہ میں کوئلے کی کمی
۵۔ جمہوریہ آذربائے جان کی معاشی ترقّی
۶۔ وسط ایشیا کے گرم علاقے
۷۔ مرکزی ایشیا میں ایک نئی ریل کھل رہی ہے
وغیرہ وغیرہ

ریلوے بجٹ

پچھلے نومبر میں انڈین ریلوے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے سابق ریلوے ممبر مسٹر آصف علی نے ملک کو متنبہ کیا تھا کہ ریلوے کی مالی ضروریات کے پیشِ نظر غالباً کرایوں میں اضافہ کرنا ناگزیر ہوگا۔ کانفرنس کے صدر مسٹر رینالڈز نے اعداد و شمار پیش کیے تھے اور اس چیز کو لابدی ثابت کیا تھا۔ اپنا پہلا بجٹ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر جان متھائی نے ان اندیشوں کو صحیح ثابت کر دیا۔ مسافروں اور اشیا دونوں ہی کی شرحِ کرایہ میں اضافہ ان کے بجٹ کا اہم ترین جزو ہے۔ کرایوں میں کوئی ۶ ¼ فی صدی اضافہ ہوگا۔ اسپیشل اور ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک اشیا کی نقل و حمل پر جو کرایہ ادا کرنا ہوتا تھا اس میں بھی اضافہ ہوگا۔ خام اشیا اس اضافے سے متاثر نہیں ہوں گی کیوں کہ کرایوں میں اس اضافے کا اثر عموماً ضروریاتِ زندگی سے متعلق اشیا کے لیے ہی تجویز کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر متھائی نے کوشش کی ہے کہ ان موخر الذکر اضافوں کو بہت کم اور ہلکا ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ چناں چہ انھوں نے بتایا ہے کہ ایک سیب غلّے یا ایک گز کپڑے پر ایک پائی کا اضافہ ہوگا۔ اور اس لیے انھوں نے کہا ہے کہ اس اضافے سے خردہ قیمتوں میں کوئی اضافہ جائز

نہیں ہوگا۔ منشا یہ ہی کہ اس اضافے کا بوجھ معمولی صارف دولت پر نہیں بلکہ تاجروں پر ہوگا۔ شاید نظری طور پر یہ توقع صحیح ہو۔ عملاً تو یہ بات انتہائی وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہی کہ تاجر اس اضافے سے نہ صرف قیمتوں میں اتنا اضافہ کریں گے جو بڑھے ہوئے کرایے کی تلافی کردے بلکہ شاید اس طرح کچھ مزید نفع بھی کما سکیں گے۔ وفاق ایوان ہائے تجارت و صنعت نے ریلوے بجٹ پر جس رائے کا اظہار کیا ہی اس میں اس بات پر زور دیا ہی کہ ان اضافوں سے افراطِ زر کے رجحان کو تقویت پہنچے گی۔ یہ کاروباری طبقے کی شاید سب سے بڑی انجمن ہی۔ اور اسے تاجروں کی نفسیات اور ان کے عمل کا اتنا اندازہ تو ہوگا ہی کہ وہ حکومت کے اس اقدام کے نتائج کا صحیح اندازہ کرسکے! اضافہ پسنجر کرایوں میں یکم مارچ سے اور اشیا کی نقل وحمل کے کرایوں میں یکم اپریل سے نافذ ہوگا۔ بجٹ پر بحث کے دوران میں سردار منگل سنگھ کی ایک تحریک تخفیف پر ریلوے ممبر نے ایک ذرا سی مزید عنایت کردی ہی اور وہ یہ ہی کہ آٹھ آنے تک کے کرایوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ توقع یہ تھی کہ مسافروں سے اضافۂ کرایہ کی بہ دولت کوئی پونے پانچ کروڑ (۴ ¾) کی مزید آمدنی ہوگی۔ اس رعایت سے اس میں تقریباً ۸۰ لاکھ کی اور کمی ہوجائے گی۔ اشیا کی نقل وحمل کے کرایوں میں اضافے سے ریلوے کی آمدنی میں ½ ۵ کروڑ کا اضافہ ہوگا۔ ریلوے بجٹ پر بحث کے دوران میں سیٹھ گووند داس نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ ہر کلاس کے مسافروں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی بجائے کیوں نہ اس طرح اضافہ کیا جائے کہ ہر ایک کو اپنی صلاحیت کے لحاظ سے اس کا بوجھ اُٹھانا پڑے۔ تجویز یہ تھی کہ سیکنڈ اور فرسٹ کلاس کے کرایوں میں اضافے کا تناسب بڑھا کر علی الترتیب ½ ۱۲ فی صدی اور ۲۵ فی صدی کردیا جائے۔ بہ ظاہر تو یہ تجویز بہت معقول معلوم ہوتی ہی لیکن حکومت نے نہ جانے کیوں اس کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اس سے قطع نظر ایک اور بنیادی سوال رہا جاتا ہی۔ کیا یہ اضافے مناسب ہیں۔ ڈاکٹر متھائی نے اس کے جواز میں دلیل یہ پیش کی تھی کہ عام مالیات کو ریلوے سے ½ ۷ کروڑ کی آمدنی کی توقع ہی۔ بہتری فنڈ اور ریلوے ریزرو میں ۵ کروڑ سالانہ کی رقم جمع ہونی چاہیے۔ ریلوے ریزرو فنڈ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس لیے اس ارادے پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ اگلے سات سال میں اسے بڑھا کر ۵۰ کروڑ تک پہنچا دیا جائے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اگلے سال کی متوقع آمدنی (½ ۷ کروڑ) میں سے ان تینوں مدوں میں ایک رقم فراہم کردی جاتی۔ لیکن متھائی صاحب نے اپنے سامنے ایک نصب العین رکھا ہی۔ اور اس نصب العین کو مدِنظر رکھ کر اضافے تجویز کیے ہیں۔ رزرو فنڈ میں پانچ کروڑ اور بٹرمنٹ فنڈ میں ۵ کروڑ جمع کردینے کے بعد اور حکومت ہند کی عام مالیات میں ½ ۷ کروڑ کا اضافہ کرنے کی خاطر یہ اضافے عمل میں لائے گئے ہیں۔ بٹرمنٹ فنڈ میں فی الحال (مارچ سنہ ۱۹۴۷ء) ۸۰ر۱۳ کروڑ رُپے موجود ہیں۔ اس میں سے کوئی ۵ کروڑ اسٹاف کی فلاح و بہبود کے لیے اور کوئی ۲ کروڑ تیسرے درجے کے مسافروں کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ گویا کُل خرچ تقریباً ۷ کروڑ ہوگا۔ اس فنڈ میں اگر اس سال پانچ کروڑ کا اضافہ نہ بھی ہو تو اس میں آیندہ سال تقریباً ۷ کروڑ رُپے رہ جائیں گے۔ پچھلے سال عام سرکاری آمدنی میں ریلوں سے ۶۱ر۵ کروڑ کا اضافہ ہوا تھا۔

اس سال اسے بڑھانے کی کوئی اتنی شدید ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

اس سلسلے میں ایک بات یہ یاد رکھنی چاہیے کہ بجٹ میں آمدنی اور خرچ کے جو اندازے کیے جاتے ہیں ان میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ آمدنی کے تخمینے عموماً کم ہوتے ہیں، خرچ کا اندازہ بڑھا چڑھا کر کیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء کے حقیقی اعداد کو دیکھیے تو پتا چلتا ہے کہ آمدنی میں بجٹ کے اندازے کے مقابلے میں تقریباً ۷۵ لاکھ کا اضافہ ہوا اور خرچ اندازے سے تقریباً ۸ر۴ کروڑ کم نکلا۔ نظرثانی کیے ہوئے اندازوں کے لحاظ سے بچت کی مقدار محض ۷ر۲۳ کروڑ تھی۔ درحقیقت بچت ۲۰ر۲۸ کروڑ کی ہوئی۔

قیاس یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء کے بجٹ کے اندازے بھی اسی طرح کے ہوں گے اور جہاں تک آمدنی کا تعلق ہے حقیقتاً وہ اندازوں سے زیادہ ہوگی۔ اگلے سال ٹریفک خرچ ملا کر کُل آمدنی ۱۸۳ کروڑ کی ہوگی۔ اس میں شرح ہائے کرایہ سے آمدنی میں جو اضافہ ہوگا وہ شامل نہیں ہے۔ یہ سنہ ۱۹۴۷ء کے نظرثانی کیے ہوئے اعداد سے کوئی ۲۳ کروڑ کم ہے۔ اس کمی کا سبب یہ ہے کہ آمدنی میں تقریباً ۱۴ کروڑ کی کمی ہو جائے گی۔ پارسلوں کی آمدنی میں ۳ کروڑ روپوں کی کمی کا اندیشہ ہے۔ عام مصارف کی مقدار ۵ر۱۳۵ کروڑ ہوگی۔ یہ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء کے مصارف سے بہ قدر ۵ر۳۴ کروڑ کم ہے۔ عارضی امداد اور مہنگائی بھتہ کے اخراجات ۵ر۳ کروڑ ہوں گے۔ فرسودگی فنڈ میں ۴۴ر۱۵ کروڑ کی رقم جمع ہوگی۔ مختلف مدوں سے ۹۵ر۲ کروڑ کی آمدنی ہوگی، سود کی مدمیں ۵۸ر۲۶ کروڑ خرچ ہوں گے۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے ۷ کروڑ کی بچت ہوگی۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں یہ اندازے بہت محتاط ہیں۔ اور یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ بچت کی مقدار اس سے کافی زیادہ ہوگی۔ اس لیے یہ بات قطعی طور پر ثابت نہیں ہو جاتی کہ یہ اضافے ناگزیر ہیں لیکن ڈاکٹر جان متھائی نے یہ بھی دھمکی دی ہے کہ تنخواہ کے کمیشن اور ثالث کے فیصلے پر عمل کرنا پڑا تو ہو سکتا ہے کہ حکومت ریلوں کے لیے مزید رقم کا مطالبہ کرے۔ یہ کہنے میں ہمیں کوئی پس و پیش نہیں کہ اس طرح کے کسی مزید اضافے کی تجویز صد درجہ نامناسب ہوگی۔ ہم نے اوپر کی سطروں میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ آمدنی کے متعلق جو اندازے کیے گئے ہیں وہ کم ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ غیر فوجی آمد و رفت میں اضافے کے وہی رجحانات اس سال بھی کارفرما ہوں گے جو پچھلے سال دیکھے گئے اور فوجی آمد و رفت میں کمی کا لحاظ رکھ لیا جائے تو بھی یہ توقع صحیح ہوگی کہ گراس آمدنی میں بھی بجٹ کے اندازوں کے مقابلے میں ۱۵ — ۲۰ کروڑ کا اضافہ ہوگا۔ اس میں بڑھتے ہوئے کرایوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو بلاشبہ تنخواہوں کے کمیشن کی سفارشات اسی میں سے پوری ہو سکتی ہیں۔ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر ان۔ دی گیڈگل نے جو خود اس کمیشن کے ممبر ہیں کہا تھا کہ کمیشن کی سفارشات سے ۱۵ کروڑ کے قریب مزید صرف کی توقع رکھنی چاہیے۔

لیکن ایک قومی حکومت کے مزید رقم فراہم کرنے میں کسی شہری کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شرط یہ ہو کہ اس طرح کی حاصل شدہ آمدنی سے جو کام کیے جائیں ان کی افادیت مشتبہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں ضروری ہو کہ ریلوں کے انتظام کی طرف توجہ دی جائے۔ مدتوں سے ریلوے کے بڑے افسروں کی تنخواہوں کے بہت زیادہ ہونے پر اعتراض کیا جا رہا ہو۔ یہ صحیح ہو کہ اس طرح کوئی بہت بڑی رقم اکٹھا ہوجانے کی توقع نادانی ہوگی۔ لیکن سوال اصول کا ہو۔ ہندستان کی فاقہ مست اکثریت سے جب اور کبھی مزید رقم طلب کی جائے تو یہ ثابت کرنا ضروری ہو کہ یہ ناگزیر ہو۔ اور یہ اصلاح ضروری ہو۔ مصارف میں زیادہ سے زیادہ کمی اور مصارف پر مکمل نگرانی دونوں بہت اہم مسائل ہیں اور ان پر ریلوے کے اربابِ حل و عقد کو پوری طرح دھیان دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ خبر خوش کن ہو کہ اس سال اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ریلوں کی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جانے والی ہو جس کا کام یہ ہوگا کہ مصارف میں زیادہ سے زیادہ کمی کی صورتیں نکالے اور آمدنی کی نئی شکلیں تجویز کرے۔ مصارف کی نگرانی کے لیے ایک نئی تکنیک کی ترقی اور اس طرح کی کچھ اور اصلاحیں بھی جو اس بجٹ میں تجویز کی گئی ہیں خوش آیند ہیں ریلوں کی از سرِ نو گروپ بندی کا مطالبہ خاصا پرانا ہو۔ اور بہت ہی صحیح۔ ہندستان میں ریلوے کی کوئی ۴۴ کمپنیاں قائم ہیں۔ ان کا الگ الگ انتظام کیا جاتا ہو۔ عہدے دار اور اس طرح کے دوسرے مصارف میں خواہ مخواہ اضافہ ہوجاتا ہو۔ اب کہ تقریباً ساری ریلوے کمپنیاں حکومت کے تحت آچکی ہیں اس انتظام کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہو۔ اس صورتِ حال کی اصلاح سے مصارف میں خاصی کمی کی امید کی جاسکتی ہو۔ ریلوے بورڈ نے اس اصلاح کے اصول کو تسلیم کرلیا ہو اور یہ امید کی جاسکتی ہو کہ مستقبل قریب میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔　　(ابوسالم ایم۔اے (علیگ)

مالک اور مزدور

حکومتِ ہند کے لیبر وزیر آنریبل جگ جیون رام نے مرکزی اسمبلی میں صنعتی مالکوں اور مزدوروں کے جھگڑے سے متعلق ایک بل پیش کیا تھا جو ۱۲ فروری ۱۹۴۷ء کو ۳۳ بر خلاف ۳ کی اکثریت سے پاس ہوگیا۔ منظور ہونے سے پہلے یہ بل ایک سلیکٹ کمیٹی کی نظر سے گزر چکا تھا جس نے مسودۂ قانون میں کافی ردّ و بدل کیا تھا۔ اس قانون کا مقصد یہ ہو کہ مالک اور مزدور کے جھگڑوں کی تحقیق و تفتیش کی جائے اور ان کو پُر امن طریقے سے چکانے کا انتظام کیا جائے۔

اس قانون سے متعلق خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں:-

اس قانون کی رو سے بغیر نوٹس کے نہ تو مزدور ہڑتال کرسکتے ہیں اور نہ مالک کارخانہ بند کرسکتا ہو۔ اختلاف اور

جھگڑے کی صورت میں مالک اور مزدور دونوں کے لیے ضروری ہوگا کہ ثالث کے ذریعے فیصلہ کرائے۔ مفادِ عامّہ کی سروسوں میں (مثلاً ریل، تار، ڈاک وغیرہ میں) سمجھوتے کی بات چیت کے دوران میں اگر ہڑتال ہوئی تو غیر قانونی سمجھی جائے گی اور اگر کسی خا مدت کے لیے کوئی فیصلہ ہوا ہو، چاہے وہ مالک اور مزدور کی خود اپنی رضامندی سے ہوا ہو یا ثالث کے ذریعے تو اس مدت کے ان ہڑتال غیر قانونی ہوگی۔ اگر حکومت چاہے تو کسی صنعت کے "مفادِ عامّہ کی سروس" ہونے کا اعلان کر سکتی ہے، جس کے بعد اُس خاص صنعت میں بھی مالک اور مزدور کے جھگڑوں پر وہی قانون لاگو ہو جائے گا جو ریل، ڈاک یا تار وغیرہ کے لیے بنایا گیا ہے۔ جن صنعتوں کو حکومت مفادِ عامّہ کی سروس قرار دے سکتی ہے وہ یہ ہیں:- کوئلہ، سوتی کپڑا، غذائی اشیا، لوہا اور اسٹیل اور ریل کے علاوہ دوسرے بری بحری اور فضائی ذرائع نقل و حمل۔ اس قانون میں یہ ترمیم بھی منظور کر لی گئی ہے کہ کسی صنعت کو صرف ۶ ماہ کے عرصے کے لیے مفادِ عامّہ سروس قرار دیا جا سکتا ہے، اس سے زیادہ کے لیے نہیں لیکن اس مدت میں تازہ اعلان کے ذریعے اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کبھی اعلان کیا جائے گا تو چھ ماہ سے زیادہ عرصے تک کے لیے نہیں۔ بل میں پہلے یہ تھا کہ کسی کارخانے کے مزدور اگر دوسرے کارخ کے مزدوروں کی ہڑتال کی ہمدردی میں خود ہڑتال کریں تو وہ سزا کے مستوجب سمجھے جائیں گے لیکن اب بل سے یہ پابندی ہٹا گئی ہے۔

سلیکٹ کمیٹی نے مسودۂ قانون میں کافی ردّ و بدل کیا ہے، مثلاً پہلے یہ رکھا گیا تھا کہ اگر کسی ثالثی فیصلے میں حکومت خود ا فریق کی حیثیت رکھتی ہے اور فیصلہ اس کے لیے ناقابلِ قبول ہے تو وہ اُسے رد کر سکتی ہے لیکن اب یہ ہو گیا ہے کہ حکومت اسے رد نہیں کر سکتی بلکہ مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کر سکتی ہے۔ اگر مالک اور مزدور کے جھگڑے سے متعلق کسی فیصلے کو حکومت نے لاز قرار دیا ہے لیکن کوئی فریق حکومت کے سامنے اگر یہ ثابت کر دے کہ جن حالات نے یہ مخصوص فیصلہ کرایا تھا وہ اب باقی نہیں ر تو وہ فیصلہ منسوخ ہو سکتا ہے۔ مالک اور مزدور کے درمیان صلح کی فضا پیدا کرنے اور جھگڑوں کو ابتدا ہی میں چکانے اور رو کی غرض سے قانون میں "ورکس کمیٹی" بنانے کی تجویز ہے جس میں مزدور اور مالک کے نمایندے شامل ہوں گے۔ یہ قانون ہر اُس یا مِل پر لاگو ہوگا جہاں سو سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں۔ اس کمیٹی کے نمایندوں کا انتخاب عام مزدور کریں گے اور کچھ ایسے نمایندے ہوں گے جو مزدوروں کی انجمن کے نامزد کیے ہوئے لوگوں میں سے چُنے جائیں گے۔

مباحثے کے دوران میں اس قانون کی حمایت اور مخالفت میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا وہ مختصراً یہ ہیں۔

اس قانون سے مزدور اور مالک کے درمیان اچھے اور خوش گوار تعلقات پیدا ہوں گے، صحیح قسم کی مزدور تحریک جنم اور جھگڑے زیادہ نقصان دہ اور خطرناک شکل نہیں اختیار کر سکیں گے۔ بہت سے جھگڑے پُرامن طریقے سے طے پا جائیں۔ ہندستان کے مزدور اِس وقت اپنی تنظیم کی جس منزل پر ہیں اس لحاظ سے یہ قانون بہت موزوں اور مناسب ہے۔ مالک ا

کے جھگڑوں میں حکومت کا دخل انداز ہونا بہت ضروری ہے اور یہ قانون اس چیز کو ممکن بناتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ یہ قانون مزدوروں سے ہڑتال کا حق چھین لیتا ہے، یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ خود مزدوروں کے حق میں ہڑتال پر تھوڑی سی پابندی عائد کردی گئی ہے

لیکن مرکزی اسمبلی میں خود مزدوروں کے نمایندوں نے اس قانون کی سخت مخالفت کی۔ یہ مخالفت صرف چند دفعات تک محدود نہیں تھی بلکہ اس بنیادی پالیسی سے بھی ٹکراتی تھی جو اس قانون کی روح رواں ہے۔ سب سے بڑا اعتراض تو یہ ہے کہ مزدوروں کے لیے اقل ترین تنخواہ کو مقرر کرنے اور کام کرنے کے حالات اور شرائط متعین کرنے سے پہلے ہی اُن کے ابتدائی حقوق چھینے جارہے ہیں۔ حال آں کہ ہونا پہلے یہ چاہیے تھا کہ پہلے مزدوری اور حالاتِ کارکردگی سے متعلق قانون پاس کیا جاتا اس کے بعد یہ طے کیا جاتا کہ مزدور ہڑتال نہ کریں، اس لیے کہ آخر انھی چیزوں کے لیے تو وہ ہڑتال کرتے ہیں۔ اس بہت ہی اہم اور مناسب اعتراض پر لیبر وزیر نے یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ مزدوری اور سماجی تحفظ کے سلسلے میں بھی عنقریب قانون پیش کیا جائے گا۔ مزدوروں کے نمایندے مسٹر جوشی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ غذائی اشیا کی صنعت کو چھوڑ کر اس قانون کا اطلاق صرف ایسی صنعتوں پر ہو جن کو قومی ملکیت بنایا جائے لیکن اُن کی یہ خواہش تسلیم نہیں کی گئی۔ اس قانون کی مخالفت میں جو خیالات اور رائیں پیش کی گئیں وہ مختصراً یہ ہیں:-

ثالثی طریقے کو لازمی کردینے سے مزدوروں کا سراسر نقصان ہوگا اور مالک اور مزدور کے تعلقات اچھے ہونے کی بجائے اور خراب ہوجائیں گے۔ مزدور کے ہاتھ میں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کے واسطے صرف ایک ہتھیار ہے اور وہ ہے ہڑتال موجودہ حالات میں جب کہ انھیں ایک مناسب معیارِ زندگی کے لیے سرمایہ داروں سے بہت جدوجہد کرنی ہے اُن سے یہ ہتھیار چھین لینا اُن پر ظلم کے مرادف ہے۔ اس سے سرمایہ داروں کو ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ عدالتی اور ثالثی فیصلے میں مہینوں لگ جائیں گے، اس دوران میں مزدوروں کا اعتماد اُٹھ جائے گا اور جھگڑے اور بڑھیں گے۔ جرمانے کے سلسلے میں قانون میں مالک اور مزدور دونوں کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانکا گیا ہے، بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ مالک کے لیے جرمانہ کوئی خاص نقصان کا باعث نہیں ہوسکتا لیکن مزدور کے لیے وہ تباہ کن ہوسکتا ہے۔ اس طرح مساوات اور انصاف کے پردے میں دراصل مزدور کے ساتھ بے انصافی کی گئی ہے۔ پھر قانون کے ذریعے بغیر نوٹس کے ہڑتال کرنا یا کارخانہ بند کرنا دونوں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اس میں بھی بہ ظاہر انصاف کیا گیا ہے لیکن دراصل اس میں مزدوروں کے حقوق پر چھاپہ مارا گیا ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ مزدور کے پاس اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کا صرف ایک ہتھیار ہے اور وہ ہے ہڑتال، یہ ہتھیار تو اس سے چھین لیا گیا۔ لیکن مالک کے پاس مزدوروں کے حقوق غصب کرنے کا طریقہ صرف کارخانہ بند کرنا نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ اس لیے اس قانون کے باوجود وہ دوسرے طریقوں سے اپنے منافع کے لیے مزدوروں کے مفاد پر حملہ کرسکتے ہیں، مثلاً مزدوری گھٹادینا یا کام کے گھنٹے بڑھادینا۔ اس لیے مسٹر جوشی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ نہ صرف یہ کہ

کارخانہ بند کرنا غیر قانونی قرار دیا جائے بلکہ یہ بھی قانون بنا دیا جائے کہ مالک کام کرنے کے حالات اور شرائط میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کرسکتا جو مزدوروں کے مفاد کو نقصان پہنچائے۔

جہاں تک "ورکس کمیٹی" کا تعلق ہے، مزدوروں کے نمایندوں اور لیبر وزیر میں یہ اختلاف تھا کہ اوّل الذکر خاص کر مسٹر جوشی یہ چاہتے تھے کہ ورکس کمیٹی، مزدور یونین کی رضامندی سے مقرر کی جائے ورنہ مزدور یونین اور ورکس کمیٹی میں جھگڑا پیدا ہوگا اور اصلی مقصد فوت ہوجائے گا۔ لیبر وزیر نے کہا کہ ممکن ہے کسی مزدور انجمن میں صرف دس فی صدی مزدور ہوں تو ایسی حالت میں ورکس کمیٹی کو مزدور یونین کے لیڈروں کا دُم چھلا بنا دینا ٹھیک نہیں ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ ورکس کمیٹی کو راست طور پر مزدور منتخب کریں۔

غرض مزدوروں کے نمایندوں کی رائے یہ تھی کہ یہ قانون خود حکومت کے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر ہے اور اس سے مزدوروں کو اخلاقی اور مادّی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

بیرونی سکّے کے خرچ پر سرکاری نگرانی

۱۰ فروری سنہ ۱۹۴۷ء کو مرکزی اسمبلی میں ایک قانون پاس ہوا جس کا مقصد یہ ہے کہ بیرونی سکّے کے خرچ پر سرکاری نگرانی قائم کی جائے۔ اس مسودۂ قانون کو وزیر مالیات حکومت ہند آنریبل لیاقت علی خاں صاحب نے پیش کیا تھا۔ اس سے پہلے اُس پر سلیکٹ کمیٹی غور و خوض کر چکی تھی۔ قانون کی غرض و غایت مختصراً یہ ہے کہ چوں کہ ہندستان کے پاس بیرونی سکّہ حاصل کرنے کے ذرائع بہت محدود ہیں اس لیے اس کے خرچ پر سرکاری نگرانی بٹھا دی جائے۔ تاکہ بیرونی سکّے کی فضول بربادی نہ ہو، ان کا استعمال احتیاط اور ہوشیاری سے ہو اور ایسی صورتِ حال نہ پیدا ہو کہ مشینوں اور کلوں کی خریداری کے لیے ہمارے پاس کافی غیر ملکی سکّہ نہ رہے۔ ملک کی صنعتی ترقی کے پیشِ نظر اشیائے اصل کی خریداری بہت ضروری ہے۔

لیکن یہ واضح رہے کہ بیرونی سکّے کے استعمال کی متعدد صورتیں ہیں، حکومت ان تمام پر پابندی عائد کرنا نہیں چاہتی حکومت صرف یہ چاہتی ہے کہ عظیم سرمایوں کی شکل میں بیرونی سکّے کے لیے جو خرچ ہوتا ہے اُس پر پابندی عائد ہو۔ باقی رہیں اور چیزیں جن پر بیرونی سکّہ خرچ ہوتا ہے جیسے بیرونی مال کی درآمد، سود، منافع، کمیشن، بیمے کی قسطیں وغیرہ وغیرہ، اُن پر یقیناً کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ ایک اور بات یہ ہے کہ اُن ملکوں سے تجارت کے سلسلے میں یہ پابندی نہیں ہوگی جو اسٹرلنگ حلقے میں ہیں جیسے آسٹریلیا، کنیڈا، جنوبی افریقہ وغیرہ۔

بیرونی سکّے کی فضول خرچی ہی کو روکنے کی غرض سے درآمد اور برآمد پر بھی ابھی سرکاری نگرانی قائم رکھی جائے گی۔ اس چیز سے متعلق ایک علاحدہ بل وزیر تجارت آنریبل چندریگر صاحب نے پیش کیا جو پاس ہوگیا۔

درآمد کی بھرمار کو روکنے کے لیے، ضروری اشیا کی بجائے عیش و عشرت کی چیزوں کی درآمد پر پابندی لگانے کے لیے، بیرونی سکّے کی فضول بربادی کی روک تھام کے لیے اور ہندستان کو بین اقوامی مالیاتی فنڈ کی رکنیت کا اہل بنانے کے لیے اس قانون کو عمل میں آنا ضروری تھا۔

برطانیہ میں کوئلے کی کمی

برطانیہ اِس وقت کوئلے کی شدید کمی کا سامنا کر رہی ہے، گزشتہ ہفتے اِس کمی نے سردی کی زیادتی کے ساتھ مِل کر اہلِ برطانیہ کے لیے بہت تکلیف دہ صورت پیدا کردی تھی۔ کوئلے کی یہ کمی اِس لیے نہیں ہوئی کہ پیداوار کم ہے۔ اعداد و شمار سے واضح طور پر پتا چلتا ہے کہ پیداوار ۱۹۴۵ء سے جب کہ لیبر وزارت نے حکومت سنبھالی برابر بڑھتی رہی ہے، باوجود اِس حقیقت کے کہ کوئلے کی صنعت میں کام کرنے والوں کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ کمی کا اصلی سبب یہ ہے کہ کوئلے کا خرچ خاص کر صنعتوں میں بہت بڑھ گیا ہے۔ گزشتہ جنوری میں سر اسٹفورڈ کرپس نے اعلان کیا کہ جتنے کوئلے کی ضرورت ہے اُس سے تین لاکھ ٹن کم اس وقت دست یاب ہے۔ ۲۰ جنوری سے صنعتوں میں کوئلے کی تقسیم سے متعلق ایک اسکیم نافذ کی گئی جس کی رُو سے صنعتوں میں کوئلے کا خرچ ۵ فی صدی کم کردیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود اتنی کمی واقع ہوگئی کہ دسویں فروری کو برطانیہ کی تمام صنعتوں میں کام رُک گیا، آٹو موبائل کی صنعت بالکل بند ہوگئی، لنکاشائر کی کپڑے کی صنعت میں دس روز کے اندر اندر ۷۳ ہزار لوگ بے روزگار ہوگئے۔

یہ تمام مصیبتیں اس حقیقت کے باوجود نازل ہوئیں کہ کوئلے کی مجموعی پیداوار بڑھتی ہی رہی ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں فی ہفتہ جتنا کوئلہ نکالا گیا اُس سے اکتوبر ۱۹۴۶ء میں فی ہفتہ ایک لاکھ بیس ہزار ٹن زیادہ نکالا گیا، حال آں کہ کوئلے کھودنے والوں کی تعداد میں ۶۳۰۰ نفوس کی کمی واقع ہوگئی تھی۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں اور بھی زیادہ کوئلہ نکالا گیا۔ کام کرنے والوں کی تعداد گھٹ جانے کے باوجود پیداوار میں اضافہ کیوں ہوا؟ اس کا اصلی سبب مزدوروں کا سیاسی شعور ہے۔ لیبر وزارت کے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد ہی انھوں نے محسوس کرلیا کہ اگر حکومت کی اسکیم میں تعاون کرکے کوئلے کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تو کوئلے کی صنعت کو قومی ملکیت بنانے میں رُکاوٹ پیدا ہوگی اور رجعت پرست سرمایہ داروں اور اُن کی کنزرویٹو پارٹی کے ہاتھ مضبوط ہوں گے، چناں چہ کوئلہ مزدوروں نے جی جان سے محنت کی، اُن کی ٹریڈ یونین نے بھی پیداوار میں اضافے کے لیے بڑی سرگرمی دکھائی اور کوئی بیس ہزار پونڈ زیادہ کوئلہ پیدا کرنے کی تحریک میں صرف کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ جاڑے کے موسم میں ایندھن اور برقی قوّت کی وزارت نے جتنا اندازہ لگایا تھا اُس سے ۲۰ لاکھ ٹن زیادہ کوئلہ ۶ ماہ کے اندر پیدا ہوا۔ لیکن اس اضافے کے باوجود صنعتوں میں کوئلے کا خرچ اتنا بڑھ رہا ہے کہ کمی کسی طرح دُور نہیں ہوتی۔

جمہوریہ آذر بائے جان کی معاشی ترقی

پورے سوویت یونین کی طرح آذر بائے جان میں بھی ۱۹۴۶ء سے نئے پنج سالہ معاشی منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا اور پہلے ہی سال آذر بائے جان کی قومی معیشت نے ترقی کی کئی منزلیں طے کرلیں آذر بائے جان کی صنعت میں بہ حیثیت مجموعی مقررہ مقدار سے زیادہ پیداوار ہوئی ہو۔ ۱۹۴۵ء میں جتنا پٹرول نکالا گیا تھا اس سے ۵ لاکھ ٹن زیادہ نکالا گیا۔ پلان میں جتنا مقرر کیا گیا تھا اس سے ۹۵ ٹن زیادہ گیسولین نکالا گیا جو ہوائی جہاز اور موٹر کے کام آتا ہی۔ چکنا کرنے والا تیل بھی پلان سے ۳۵ ہزار ٹن زیادہ نکالا گیا۔ مشین سازی کے کارخانوں میں اور ملکی صنعتوں میں پیداوار تقریباً دوگنی ہوئی۔ پلان میں سال بھر کے لیے روئی کی جو پیداوار مقرر کی گئی تھی اُس سے ۲ کروڑ ۰۶ لاکھ ۸۰ ہزار کیلوگرام زیادہ پیدا کی گئی۔ غلّے کی پیداوار بھی ۱۹۴۵ء کے مقابلے میں ایک کروڑ ۰۶ لاکھ کیلوگرام بڑھ گئی۔

وسط ایشیا کے گرم علاقے

وسط ایشیا کے گرم علاقوں کو معاشی لحاظ سے ترقی دینے کا جو کام سوویت حکومت کی نگرانی میں ہو رہا ہی اس سلسلے میں گزشتہ سال کافی کام ہوا ہی۔ ۱۹۴۶ء میں لیموں اور نارنگی کے پھلوں کی فصل توقع سے زیادہ اچھی ہوئی اور پھلوں کی تعداد ۵۰ کروڑ سے زیادہ تک پہنچ گئی۔ سالہا سال سے اتنی اچھی فصل نہیں آئی تھی۔ گزشتہ سال سوویت جارجیا میں ایک ہزار ۵۵ ہیکٹر مزید زمین لیموں اور نارنگی پیدا کرنے کے لیے زیرِ کاشت لائی گئی۔ اور لیمو اور نارنگی کے نئے قسم کے پھلوں کی کاشت بحیرۂ اسود کے ساحل پر شروع کی گئی۔

ان نئے قسم کے پھلوں میں نو دوگری زنسکی کا لیمو خاص طور پر اہم ہی جو کم درجۂ حرارت میں بھی پیدا کیا جاسکتا ہی چکی سنترا اور نارنگی کا قلم ملا کر ایک نئی قسم کی نارنگی پیدا کی گئی ہی۔ گزشتہ سال کافی بڑے علاقے میں اس خاص قسم کی نارنگی کی کاشت کی گئی۔ جارجیا میں چائے کی فصل اور کاشت میں بھی بہت اضافہ ہوا ہی۔ گزشتہ سال ۲ کروڑ ۰۳ لاکھ کیلوگرام چائے پیدا ہوئی جو پلان کی مقرر کردہ مقدار سے ۳۰ لاکھ کیلوگرام زیادہ تھی۔ اس سال مرکزی ایشیا کے گرم اور بنجر علاقوں میں زیتون، 'تنگ' اور یوکے لپٹس کے درختوں کی کاشت کو اور بھی پھیلایا جائے گا۔ اس وقت یوکے لپٹس کے ۰۷ لاکھ درخت ہیں، ۵ سال کے اندر اندر اِس تعداد کو ۴ کروڑ تک پہنچا دیا جائے گا۔

پس اندازی کے لیے وزیرِ مالیات کی اپیل

" ابھی تک ملک کی معاشی حالت ایسی ہی کہ جس شخص کے بھی امکان میں ہو اسے ضرور پس انداز کرنا چاہیے۔ مجھے یہ معلوم کرکے

مسرت ہوئی کہ حکومت ہند کے محکموں نے چھوٹی بچتوں کی اسکیم میں اس قدر دلچسپی لی ہے نیز ان کمپنی نے اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ چھوٹی بچتوں کی اسکیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ کم آمدنی والوں کو فائدہ پہنچے۔ سرکاری ملازمین کی اکثریت اسی زمرے میں آتی ہے اور چوں کہ ان کی آمدنی معین ہوتی ہے اس لیے ان پر معاشی حالات کی تبدیلیوں سے ان لوگوں کی بہ نسبت زیادہ اثر پڑتا ہے جن کی آمدنی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

کم اور معین آمدنی کے آدمی کے واسطے ضروری ہے کہ وقت ضرورت کے لیے کچھ نہ کچھ پس انداز کرے اور پس انداز کر سکنے کے وقت وہ جو کچھ بھی پس انداز کر سکے گا وہ اس وقت کے لیے اس کے تحفظ اور بہبود کی ضمانت ہوگا جب پس انداز کرنے کا موقع باقی نہ ہوگا۔ ابھی تک ملک کی معاشی حالت ایسی ہے کہ جس شخص کے بھی امکان میں ہو اسے ضرور پس انداز کرنا چاہیے۔ جس طرح صحت کے لیے باقاعدہ ورزش ضروری ہے اسی طرح مستقبل کے تحفظ کے واسطے پس انداز کرنا ضروری ہے اور تمام اچھی عادتوں کی طرح پس اندازی کی عادت کے لیے بھی باقاعدگی اور ضبطِ نفس کی ضرورت ہے۔ قومی بچتوں کی اسکیم کم آمدنی والے اشخاص کی ضروریات کے لیے بہت ہی موزوں ہے۔

اس اسکیم کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ لاکھوں آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی بچتیں مل کر بہت بڑی رقم ہو جاتی ہے جسے ملک کی ترقی میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے چھوٹی چھوٹی رقمیں پس انداز کرنے والے افراد صرف اپنے ہی کو نہیں بلکہ اپنے ملک کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔"

یوپی میں چھوٹی صنعتوں کی ترقی

چھوٹی صنعتوں کی ترقی و توسیع کے لیے حکومتِ یوپی نے حال ہی میں ۱۹ لاکھ روپے خرچ کرنا منظور کیا ہے یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ آیندہ سال کے بجٹ میں اس مد کے لیے ۵ لاکھ روپے نکالے جائیں۔ ماہرین کی ایک کمیٹی چھوٹی صنعتوں کے موجودہ حالات کی تحقیقات کا کام انجام دے رہی ہے۔ یوپی کی تین چھوٹی صنعتیں خاص طور پر اہم اور مشہور ہیں۔ کھنڈ ساری شکر کی صنعت، کھدر کی صنعت اور ہاتھ سے کاغذ بنانے کی صنعت۔ کاغذ کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے اگرچہ حکومت نے کافی آسانیاں مہیا کی ہیں اور اس فن کی تربیت و تعلیم کا انتظام کیا ہے، پھر بھی اس صنعت کا مستقبل کچھ زیادہ اچھا نہیں نظر آتا۔ کھدر کی صنعت میں دقت یہ ہے کہ سوت دستیاب نہیں ہے یہ دقت جنگ کے شروع ہی سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اب حکومت کنٹرول کے دام پر سوت مہیا کر رہی ہے لیکن ساتھ ہی خاص خاص قسم کا کپڑا تیار کرنے پر بھی زور دے رہی ہے۔ اس صنعت کو مستحکم بنانے کے لیے تین چیزوں پر زور دیا گیا ہے۔ طاقت سے چلنے والے راچھ کا استعمال کیا جائے۔ صنعتی کوآپریٹو قائم کی جائیں اور ہاتھ سے کپڑا بننے والوں کی سنڈیکیٹ بنائی جائیں۔ کھنڈ سازی شکر کی پیدائش میں مل کی تیار کی ہوئی شکر سے زیادہ اخراجات ہوتے ہیں حکومت یوپی نے اس شکر کی اقل ترین قیمت بھی مقرر کر دی ہے اور اس کی پیدائش اور تقسیم پر کنٹرول لگا دیا ہے۔ مل والے جب مقابلہ شروع کریں گے تو اس صنعت کے لیے عظیم خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ دوسری صنعتوں میں شیشہ، ریشم، چمڑا اور موزہ وغیرہ بننے کی صنعتیں ترقی کر رہی ہیں اگرچہ ان میں بھی مشینوں کی قلت، کام کرنے والوں

کمی اور بازار کی دقتیں موجود ہیں۔

(انڈین فنانس)

مرکزی ایشیا میں ایک نئی ریل کھل رہی ہے

مرکزی ایشیا میں ۴۲۰ کیلومیٹر لمبی ایک نئی ریلوے لائن کی تعمیر شروع ہوگئی ہے۔ یہ ریلوے لائن کاراگندا کے کوئلہ پیدا کرنے والے علاقے سے شروع ہوگی اور تحصیل بلخش کے مغرب کی طرف شہر فرونز تک جائے گی۔ اس نئی ریلوے سے یہ فائدہ ہوگا کہ کاراگندا کے کوئلے کی کانوں اور ازبکستان کے لوہے اور اسٹیل کے کارخانوں کے درمیان جو طویل فاصلہ ہے اس میں ایک ہزار کیلومیٹر کی کمی واقع ہو جائے گی۔ اور کوئلے کی کانوں سے اسٹیل کے کارخانوں تک کوئلہ جلدی اور بہ آسانی پہنچایا جاسکے گا۔ یہ ریل یورال کے صنعتی مرکزوں کو مرکزی ایشیا سے راست طور پر ملحق کر دے گی۔ اس لائن پر صرف ڈائی سل انجن کام میں لائے جائیں گے۔ ۱۹۴۸ء تک اس لائن کی تعمیر پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گی۔

علی گڑھ میں تالے کی صنعت

اب سے کوئی پچھتر برس پہلے علی گڑھ میں ریلوے اسٹیشن سے دکھن کی جانب تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک کارخانہ قائم ہوا اس کا نام تھا "گورمنٹ سٹل ورکس"۔ اس کارخانے میں پہلے پہل ڈاک خانوں کی وہ مہریں تیار ہوتی تھیں جو خطوط پر تاریخ یا اور دوسری علامات ڈالنے میں اب بھی استعمال ہوتی ہیں۔ کچھ عرصے بعد یہاں کے کام میں ترقی ہوئی اور ضروریات بڑھنے لگیں، اب یہاں ایک نئے کام کی ابتدا ہوئی؛ تالوں کے پرزے ولایت سے ڈھل کر آتے تھے اور یہاں انھیں جوڑکر تالا مکمل کیا جاتا تھا، اس وقت اس کارخانے کا نام بدل گیا اور اُسے "گورمنٹ ورک شاپ" کہا جانے لگا۔ اسی ورک شاپ میں ایک صاحب کام کرتے تھے، ان کا نام عبداللہ تھا اور ذات کے آہن گر تھے۔ علی گڑھ میں تالوں کی صنعت کی اجارہ داری انھی صاحب کی رہین منت ہے۔ عبداللہ صاحب ایک تالہ اس کارخانے سے لے آئے اور کسی طرح انھوں نے اس کی نقل اپنے گھر پر بنالی! کرم الٰہی نبی بخش صاحبان نے دوسرا قدم اٹھایا اور کارخانہ قائم کردینے کے منصوبے گانٹھنے لگے۔ وہ لوگ تو چل بسے لیکن اپنے قیمتی راز چھوڑ گئے جنھیں اُن کے پوتے محمد شفیع صاحب نے اپنایا، محمد شفیع صاحب نے اپنے دادا مرحوم نبی بخش صاحب کے کارخانے کا نام "اسٹار لاک ورکس" رکھا، جو ایک لاکھ تیس ہزار روپے کے صرفے سے شروع کیا گیا تھا۔ یہی علی گڑھ میں تالوں کا سب سے پہلا کارخانہ ہے اور اب بھی قائم ہے۔ صرف چند ہی باہمت اور ماہر کاری گر ہیں جو علی گڑھ کی اس صنعت کو روشن کیے ہوئے ہیں۔

آہستہ آہستہ یہاں بہت سے کارخانے قائم ہوگئے، کچھ لوگوں کو تو یہ صنعت آبا و اجداد سے ترکے میں ملی اور کچھ لوگوں نے

اس بڑھتی ہوئی صنعت کے کثیر منافع کو دیکھ کر نئے نئے کارخانے شروع کیے۔ یہ سب ترقیاں دراصل ۱۹۱۶ء کے بعد ہوئیں اس لیے کہ پہلی جنگِ عظیم ختم ہوگئی تھی اور تاجر پیشہ لوگ صنعتی ترقیوں کے امکانات دیکھ دیکھ کر ہی کام کرنا چاہتے تھے۔

یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ علی گڑھ میں تالوں کی صنعت کا سبب خام اشیا کی نزدیکی یا کوئی اور اسی قسم کی آسانی ہے۔ بس اتفاقاً یہاں اس کی ابتدا ہوئی اور علی گڑھ نے اجارہ داری کر لی۔

ایک کارخانے میں اوسطاً پچاس درجن تالے ہر روز تیار ہو جاتے ہیں۔ علی گڑھ کے تمام کارخانے مل جل کر اوسطاً دو لاکھ روپے کا مال روزانہ تیار کر لیتے ہیں، یہ آج کل کی بات ہے، لیکن جنگ سے پہلے کُل تالے جو روزانہ علی گڑھ میں تیار ہو جاتے تھے اوسطاً پچیس ہزار روپے کی قیمت کے ہوتے تھے۔ تالوں کی قیمت چوگنی ہوگئی ہے اس لیے کہ ان کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے اور لڑائی سے قبل جتنے تالے بنتے تھے، اس کے دوگنے اب بننے لگے ہیں۔ لڑائی کے ختم ہو جانے سے تالوں کے بننے کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی۔

ان کارخانوں کے مالک اپنے ایجنٹوں کے ذریعے باہر سے آرڈر حاصل کرتے ہیں۔ ایجنٹوں کو زیادہ سے زیادہ کمیشن سوا چھ روپے سیکڑہ دیا جاتا ہے اور کم سے کم تین روپے دو آنے سیکڑہ۔ کمیشن کو اگر مالک کارخانہ کے منافع میں شامل کر لیا جائے تو تقریباً بیس سے پچیس روپے فی صدی انھیں منافع ملتا ہے۔

پیتل کو یہ لوگ احمد آباد اور حیدر آباد (سندھ) سے منگاتے ہیں۔ عام طور پر یہ پیتل پرانے اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کی شکل میں آتا ہے۔ اکثر اینٹوں اور چھڑوں کی شکل میں بھی پیتل انھیں ملتا ہے۔ آج کل پھٹے ہوئے کارتوس بھی پیتل کی خرید میں آتے ہیں۔ لڑائی سے پہلے پیتل کو یہ لوگ سترہ یا اٹھارہ روپے فی من کے حساب سے خریدتے تھے، لیکن لڑائی کے زمانے میں جب پیتل کی مانگ بڑھ گئی تو ڈیڑھ سو روپے فی من اس کی قیمت ان لوگوں کو دینا پڑی، اور اب آج کل بھی یہی بھاؤ ہے۔ یہ پیتل ٹوٹے ہوئے برتن وغیرہ کی شکل میں تو ہوتا ہی ہے، اس لیے اسے پگھلا کر صاف کرنا پڑتا ہے، اور آخر میں خالص پیتل کا وزن تقریباً نصف رہ جاتا ہے۔ اس طرح آجکل تو پیتل بہت ہی مہنگا پڑتا ہے یعنی خالص پیتل کی قیمت تقریباً تین سو روپے فی من پڑتا ہے۔

جو لوگ پیتل پگھلاتے ہیں انھیں یہاں "کولی" کہتے ہیں۔ چوں کہ اس کام میں صحت اور بینائی پر بہت خراب اثر پڑتا ہے اس لیے مزدوری زیادہ ہے۔ ایک کولی کی ایک روز کی مزدوری اوسطاً پچیس روپے ہوتی ہے۔ تالوں کے کارخانے بس انھی لوگوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ یہی لوگ تالوں کی اصل چیز لیور یا کھٹکا ڈھالتے ہیں۔

پیتل کو پگھلانے میں پتھر کا کوئلہ استعمال ہوتا ہے۔ پیتل کو پگھلانے کے لیے ایک خاص قسم کے بنے ہوئے مٹی کے برتن میں رکھا جاتا ہے، اس برتن کو عام طور پر "گھڑیا" کہتے ہیں۔ گھڑیا میں پیتل ڈال کر اُسے بھٹی کے اندر ڈال دیتے ہیں اس کو کسی

اور چیز سے ڈھکتے نہیں تاکہ بھٹی کی آگ گھڑیا کو چاروں طرف سے گھیر لے۔ پھر بھٹی کو ہوا دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب پیتل پگھل جاتا ہے تو گھڑیا میں سے سفید رنگ کی چمک دار آنچ نکلتی ہے۔

ڈھلے ہوئے پرزوں کو جوڑنے کا کام بھی کافی محنت کا ہے، جو لوگ ان پرزوں کو جوڑ کر تالا مکمل کرتے ہیں وہ بھی علی گڑھ میں زیادہ تعداد میں نہیں ہیں یہاں کے ایک محلے "کالا نمل" میں یہ لوگ رہتے ہیں اور اپنے فن کے ماہر ہیں۔ مزدوری کا بھاؤ تالوں کے سائز کی مناسبت سے ہوتا ہے، مثلاً بڑے تالے کو عام طور پر دو روپے فی درجن، اس سے چھوٹے کو ایک روپے فی درجن، اور چھوٹے کو آٹھ آنے یا چھ آنے فی درجن بناتے ہیں۔ ان کو مزدوری زیادہ سے زیادہ بیس روپے فی درجن تک بھی چند خاص قسم کے تالوں کی تیاری میں دی جاتی ہے۔

لڑائی سے پہلے ان کی مزدوری زیادہ سے زیادہ بارہ آنے درجن ہوتی تھی پھر جیسے جیسے لڑائی کی شورش بڑھتی گئی ویسے ویسے ان کی مزدوری بھی بڑھتی گئی۔

عام طور پر ایک کاریگر ایک درجن تالوں کو ایک دن کی محنت میں جوڑ لیتا ہے۔ چھوٹا تالا ایک دن میں چھ درجن تک ایک ہی مستری تیار کر لیتا ہے۔ کام کے اوقات عام طور پر صبح سات بجے سے شام کے پانچ بجے تک ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک روز میں اوسطاً نو گھنٹے کام ہوتا ہے۔ اسی نو گھنٹے کے عرصے میں ایک کارخانہ عام طور پر پچاس درجن تالے تیار کر لیتا ہے۔

تالوں پر پالش کرنا، ان پر نمبر اور مہر وغیرہ کھودنا، چابی تیار کرنا، یا اور اسی قسم کے چند کام مثلاً تالوں کو بنڈلوں میں باندھنا اور اپنے خریداروں کے نام پارسل وغیرہ بھیجنا بھی اسی کارخانے میں انجام پا جاتے ہیں۔ ہاں اتنا تو بہرحال ہوتا ہے کہ ہر کام کے لیے ایک علاحدہ شعبہ ہوتا ہے۔ صرف چابی بنانے کا کام وہی شخص کرتا ہے جو تالا بناتا ہے۔

تالوں اور چابیوں یا دوسرے پرزوں کو جب ریتی سے گھس کر صاف اور ہموار کیا جاتا ہے تو بہت سا برادہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس برادے کو یہ لوگ بیچ دیتے ہیں، زیادہ تر مرادآباد کے لوگ خرید لے جاتے ہیں لیکن اس کی قیمت پیتل کی قیمت سے تقریباً دس روپے فی من کم ہوتی ہے۔

علی گڑھ کے تالوں کے بازار الہ آباد، بمبئی، مدراس وغیرہ ہیں، وہاں سے غیر ممالک کو بھی جاتے ہیں۔ لڑائی سے پہلے تالوں کا ایک اچھا بازار رنگون بھی تھا۔

(ابرارالرحمان قدوائی)

نئی حکومت نیا بجٹ

(بقیہ صفحہ ۵)

خاص خسارے کا ڈر نہیں ہے۔ بجٹ کا سب سے قابلِ ذکر وصف یہ ہے کہ خسارے کو پورا کرنے کے لیے جتنے طریقے اختیار کیے گئے ہیں اُن سے غریب اور پست حال طبقے کے لوگوں پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا۔ اس لحاظ سے بجٹ کو موجودہ معاشی نظام کے تحت ترقی پسند قرار دیا جاسکتا ہے اور یقیناً وزیرِ مالیات اس کے لیے قابلِ مبارک باد ہیں۔ جنگ کے دوران میں سرمایہ داروں نے چور بازاری اور دوسرے ناجائز طریقوں سے کروڑوں انسانوں کو ننگا بھوکا رکھ کر سرکاری حکام کی اعانت اور ملی بھگت سے ناجائز منافعوں کا انبار جمع کرلیا اور ٹیکس سے اُن کے منافعوں کا بہت بڑا حصہ بچ نکلا۔ اس آمدنی کو تحقیق و تفتیش کے لیے کمیشن کے تقرر کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ دراصل یہ مطالبہ ہندستان کے کروڑوں عوام کا مطالبہ ہے اور وزیرِ مالیات نے اُس کو تسلیم کرکے اپنی عوام دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

یہ سوال بہت اہم ہے کہ ملک کی صنعت اور پیدائشِ اشیا پر اِس بجٹ کا کیا اثر پڑے گا۔ منافع خور سرمایہ داروں کی طرف سے شور مچایا جارہا ہے کہ کاروبار میں قابلِ تقسیم منافعوں کی رقم بہت گھٹ جائے گی اور کوئی کمپنی گزشتہ سال کے منافع کا چھبیسواں حصہ بھی ادا کرنے کے قابل نہ رہے گی، کاروبار میں سرمایہ کا لگنا بند ہوجائے گا، صنعت کا پھیلاؤ رُک جائے گا اور برطانوی ہند سے صنعتیں ہٹ کر ریاستوں میں قدم جمائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اِس کا بہترین جواب اگر حکومت دے سکتی ہے تو وہ اس طرح کہ جلد از جلد سرکاری ملکیت کے تحت صنعتوں کا اجرا کردے۔ دراصل وزیرِ مالیات نے اپنی محصولات کی تجویزوں سے جو چیز پیدا کی ہے اس کا منطقی نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ایسی بنیادی اور دیگر صنعتیں بڑے پیمانے پر جاری کی جائیں جو قومی ملکیت کے تحت اور سرکاری نگرانی میں رہیں۔ اگر یہ نہیں کیا گیا تو سرمایہ دار اپنی سازش سے پیدائشِ اشیا کی رفتار کو گھٹا کر بجٹ کے اثرات کو ناکام یاب بنانے کی کوشش کریں گے اور ساتھ ہی ملک کو قلّت کا شکار بنادیں گے۔

———— •✲•(•✲•)•✲• ————

رجسٹرڈ نمبر ———— ایل ۵۱۳۸

اعلان

ہندوستان بھر کے مصنّفین اور اشاعت خانوں کے نام

اُردو رسائل و اخبارات میں عام طور پر یہ افسوس ناک طریقہ رائج ہے کہ وہ کتابوں کا مطالعہ کیے بغیر ان پر ریویو کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسرت کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اپنے رسائل و جرائد میں اُردو نیز انگریزی کتابوں پر ریویو کا از سرِ نو باقاعدہ اور باضابطہ انتظام کیا ہے۔ اس سلسلے میں مُلک کے بہترین مبصروں اور عالموں کی مستقل خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔

مصنّفین، مدیران اور اشاعت خانوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تصانیف، منتخبات، ترجمے اور دیگر مطبوعات چاہے وہ کسی بھی موضوع پر ہوں، مسلسل طور پر انجمن ترقی اُردو (ہند) میں ریویو کے لیے بھیجتے رہیں۔

دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند)، نمبر (۱)، دریا گنج دہلی

اخلاق دہلوی نے دیال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) کا ماہانہ معاشی رسالہ

اڈیٹر

طفیل احمد خاں، ایم اے

ہماری زبان

انجمن ترقیِ اردو (ہند) دہلی کا پندرہ روزہ اخبار

ہر ماہ کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہی

سالانہ چندہ دو رپے قیمت فی پرچہ دو آنے

ہندستان بھر میں اردو سے متعلق تمام واقعات اور خبریں، اردو کے دوستوں کی کارروائیاں اردو کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں سب بہ یک وقت اس اخبار میں مل جاتی ہیں۔ ہر اس شخص کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہی جسے اردو کی ترقی اور ترویج سے دل چسپی ہی۔

-: ملنے کا پتا :-

منیجر اخبار "ہماری زبان" لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی دروازہ دہلی

معاشیات

جلد ۲ | اپریل ۱۹۴۷ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱	برِاعظم ایشیا کے معاشی مسائل	اڈیٹر	۲
۲	پنچایتی کھیتی	طاس	۶
۳	قدر کیا ہے؟	شیر جنگ	۱۲
۴	بنگال کا مسئلۂ آبادی اور زراعت	شفیق الرحمان	۲۰
۵	لارڈ کینز	م - د	۲۹
۶	زر اور تجارتِ خارجہ	رمیش نرائن ماتھر	۳۵
۷	معاشی صورتِ حال	ادارہ	۳۹
۸	اُردو کا تازہ ترین معاشیاتی اور معاشرتی ادب	ادارہ	۴۶

اداریہ

برّاعظم ایشیا کے معاشی مسائل

از: ——— اڈیٹر

ایشیائی کانفرنس جس کے اجلاس اب تقریباً اختتام کو پہنچ چکے ہیں ایشیائی ممالک کے مشترکہ مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے منعقد کی گئی ہے۔ اگرچہ سیاسی مسائل اس کے دائرہ بحث سے خارج ہیں اس لیے کہ اس سے اندرونی اور بیرونی اختلافات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، پھر بھی اس کانفرنس میں ان تمام مسائل پر غور و خوض کیا گیا ہے جو دراصل ہر سیاست کا مقصد ہیں، یعنی تہذیبی، معاشی اور معاشرتی مسائل۔ زیر بحث موضوعات کو آٹھ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) ایشیائی ممالک کی آزادی کی تحریکیں (۲) نسلی مسائل (۳) بین الیشیائی ہجرت اور مہاجرین کے ساتھ حکومتوں کا سلوک۔ (۴) نوآبادیاتی معیشت کو قومی معیشت میں بدلنا۔ (۵) ایشیائی ملکوں کی زرعی اور صنعتی تعمیر و ترقی (۶) مزدوروں کے مسائل اور سماجی سروسیں (۷) تہذیبی مسائل تعلیم، فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر، سائنسی تحقیقات اور ادبیات۔ (۸) سماج میں عورت کا درجہ اور ایشیائی ملکوں میں عورتوں کی تحریکیں۔

ابتدائی اور تعارفی جلسوں کے بعد کانفرنس مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ نوآبادیاتی معیشت کو قومی معیشت میں بدلے جانے کا مسئلہ گروہ نمبر ۳ کے حوالے کیا گیا تھا جو ایشیائی ملکوں کا سب سے اہم اور مرکزی معاشی مسئلہ ہے۔ ۲۹ مارچ کو زرعی تنظیم، صنعتی ترقی اور قومی معیشت کے قیام کے مسائل پر کانفرنس کے مکمل اجلاس میں رپورٹیں پیش کی گئیں اور محض غیرملکی سرمایہ کاری پر خفیف سی بحث کے بعد انھیں منظور کرلیا گیا۔

صدیوں کی معاشی اور سیاسی محکومی نے اشتراکی ملکوں کو چھوڑ کر دیگر تمام ایشیائی ملکوں کے معاشی مسائل میں ایک بنیادی یکسانیت اور یک رنگی پیدا کر دی ہے۔ ایشیا کے تقریباً تمام ممالک معاشی لحاظ سے مغربی سرمایہ داری کے غلام رہ چکے ہیں اور کم و بیش اب بھی ہیں۔ بعض ملکوں میں معاشی محکومی کو مستحکم بنانے کے لیے سیاسی محکومی کی بھی ضرورت پیش آئی مثلاً ہندوستان، انڈونیشیا اور انڈوچین میں۔ اور بعض ممالک میں سیاسی محکومی کے بغیر ہی مغرب کے سرمایہ دار اور سامراجی ممالک معاشی استحصال کرتے رہے جیسے سیام، چین اور مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک میں۔ سنہ ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد مرکزی ایشیا کے ملکوں نے تو روسی سامراجی استحصال کا جوا اتار پھینکا لیکن ایشیا کے بقیہ ممالک، سوائے جاپان کے، بدستور مغربی سامراج سے بندھے رہے، اور ان کا معاشی استحصال جاری رہا۔ سامراج نے ان کا خون چوسنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان کی نوعیت بنیادی طور پر یکساں تھی۔ مغربی سرمایہ داری کے داخل ہونے سے پہلے ایشیائی ملکوں کا معاشی ارتقاء بھی کچھ یکساں سا تھا، چنانچہ سوائے جاپان کے جو نہایت سرعت کے ساتھ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اختیار کر کے خود ہی سامراجی ملک بن بیٹھا، اور تمام ممالک کچھ اس بُری طرح مغربی یورپ کے سرمایہ دار ممالک کے سیاسی اور معاشی چنگل میں پھنس گئے کہ اُن کی معاشی ترقی بالکل رُک سی گئی۔ اب جب کہ دوسری جنگ عظیم نے دنیا بھر میں سامراجی نظام کی چولیں ڈھیلی کر دی ہیں، ایشیائی ملکوں کو کچھ کچھ آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا ہے، اور اب وہ اپنے معاشی حالات کی اصلاح کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ ایشیا کے دو سب سے بڑے ملک چین اور ہندوستان میں غیر ملکی اثرات اور تسلط اور اندرونی اختلاف اور خانہ جنگی کی بہ دولت سیاسی مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے اور دوسری طرف پورے ایشیا پر امریکی سرمایہ داری اور سامراج کا بھیانک خطرہ منڈلا رہا ہے۔ برطانوی سامراج بھی ابھی ہندوستان میں اپنے سیاسی اور معاشی تسلط کو قائم رکھنے کے لیے نئے نئے سیاسی طریقۂ کار استعمال کر رہا ہے۔ پھر بھی ایشیائی ملکوں کے عوام اپنی قسمت کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھ میں سنبھالنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ بالکل فطری امر ہے کہ ایشیا کے تمام ممالک کے نمائندے یک جا جمع ہو کر اپنے مشترکہ معاشی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اُن کا حل تلاش کریں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ تاریخی حالات کے تحت ایشیا کے بیش تر ممالک کے معاشی مسائل تفصیلات کے فرق کے باوجود بنیادی طور پر ایک سے ہی ہیں، اسی حقیقت نے اُن کے باہمی اشتراک عمل کو آج ممکن اور ضروری بنا دیا ہے۔

ایشیا کے نو آبادیاتی ممالک کی مشترکہ معاشی خصوصیات کیا رہی ہیں؟ مغربی ممالک کو کم قیمت پر صنعتی اور زرعی خام مال بھیجنا اور بڑے پیمانے پر اُن کی مصنوعات خریدنا۔ مغربی ممالک نے اسی ایک بنیادی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایشیائی ممالک کی معیشت کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا اور اپنے پورے سیاسی اور معاشی طرز عمل کو اسی ایک مقصد کے تابع کر دیا۔

ایشیائی ملکوں میں نقل وحمل اور رسل ورسائل کے جدید ذرائع جاری کرنا ۔ غلّے کی بجائے تجارتی اشیا کی فصلیں پیدا کرنا ، بیرونی تجارتی محصولات اور کروڑگیری ، زر اور سکّہ جات ، شرح مبادلہ وغیرہ سے متعلق سرمایہ دار ملکوں کے حسب حال پالیسی کا اختیار کیا جانا ، مقامی دست کاری کی صنعتوں کی تباہی وبربادی ، ایشیائی ملکوں میں غیر ملکی سرمایہ سے کارخانوں کا کھلنا ، یہ تمام چیزیں بیشتر ایشیائی ممالک کی معاشی خصوصیات رہی ہیں اور اُن کا مقصد وہی تھا جس کا اوپر تذکرہ آچکا ہے یعنی ایشیا کے پچھڑے ہوئے زرعی ممالک میں یورپ اور امریکہ کی مصنوعات کے لئے بازار پیدا کرنا۔

کانفرنس نے اپنی رپورٹ میں اس نوآبادیاتی معیشت کو قومی معیشت میں بدلنے کے لیے جن چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے یقین ہے کہ ایشیا کے تمام ممالک اُن کا خیر مقدم کریں گے اس لیے کہ اُن کے بغیر وہ معاشی ترقی اور خوش حالی کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتے۔

نوآبادیاتی معیشت کی خصوصیات دور کرنے اور قومی معیشت قائم کرنے کے بارے میں جو رپورٹ پیش کی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل تجویزوں کو ضروری قرار دیتی ہے :-

سب سے پہلے تو ضروری یہ ہے کہ ایشیا کے تمام ممالک سے غیر ملکی سیاسی اثرات ، غیر ملکی سرمایہ اور غیر ملکی عملے ہٹا دیے جائیں زرعی پیدائش میں تنوع اور جدت پیدا کی جائے ۔ دست کاری کی اور حرفتی صنعتوں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی جائے ۔ زراعت ، چھوٹے پیمانے کی صنعت اور اندرونی تجارت میں امداد باہمی Co-operative سے کام لیا جائے۔ اندرونی ذرائع اور مواقع کا خیال کرتے ہوئے جدید صنعتوں کو فروغ دیا جائے ۔ قرضہ دینے والی انجمنیں ، بیمہ ، تجارت خارجہ اور جہازرانی کی انجمنیں قائم کی جائیں ، عوام کے مالی اور معاشی تحفظ کا انتظام کیا جائے ، لوکل سلف گورنمنٹ کو بہتر اور کارآمد بنانے کی کوشش کی جائے۔

رپورٹ میں اُن خاص مشکلات سے بھی بحث کی گئی ہے جو عبوری دور میں پیدا ہوسکتی ہیں مثلاً غذائی اعتبار سے خود کفیل ہونے کے لیے ممکن ہے ایشیائی ممالک اپنی اپنی غذائی فصلیں بڑھادیں اور اس طرح تجارتی فصلوں کی برآمد میں کمی ہوجائے ۔ جدید صنعتوں کی ترقی سے چھوٹی صنعتوں کا زوال ہوسکتا ہے جس سے عارضی طور پر بے روزگاری بڑھ جائے گی ۔ موجودہ سماجی نظام کے تحت جدید صنعتوں کی ترقی سے یہ ہوسکتا ہے کہ دولت کا زیادہ حصہ چند لوگوں کے پاس جمع ہوجائے اور بقیہ لوگ اس سے محروم رہ جائیں وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ ہر ملک خود اپنے منصوبے کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی معاشی حالت درست کرنے کی کوشش کرے گا ، پھر بھی اُن کے درمیان تبادلۂ خیالات اور باہمی مشورے کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

زراعت کی از سرِ نو تنظیم کے سلسلے میں اصل مسئلہ یہ قرار دیا گیا کہ زراعت پیشہ عوام کے معیارِ زندگی کو کس طرح بلند کیا جائے اس میں دو باتوں پر زور دیا گیا، ایک تو یہ کہ زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ دوسرے کاشت کے رقبے کو بڑھایا جائے۔ کسانوں کو سرکاری امداد دی جائے۔ زراعت کے ساتھ ساتھ چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو خاص طور پر ترقی دی جائے۔ ہندستانی زرعی پیداوار جو دوسرے ممالک کو بھیجی جاتی ہی اُس کی قیمت اب تک بہت غیر مناسب ملتی رہی ہی۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہی کہ ذرائع نقل و حمل خاص کر جہاز رانی پر ہندستانی نگرانی ہو جاگیرداری اور زمیں داری اُٹھا کر بندوبست اراضی میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ زرعی آمدنی کا زیادہ حصّہ آج کل تاجر اور زمیں دار کے پاس چلا جاتا ہی۔ اس صورتِ حال کو جلد از جلد ختم کیا جائے۔ امدادِ باہمی کے اصولوں پر زرعی پیداوار کی خرید و فروخت کا انتظام کیا جائے۔ بے زمین کے مزدوروں کو زمین دی جائے۔ رپوٹ میں ایشیا کے اشتراکی ملکوں کی پنچایتی کھیتی کی تعریف کی گئی ہی۔ اس وقت پورے ایشیا میں غذائی پیداوار کو بڑھانے کی شدید ضرورت ہی، ورنہ غیر ملکی سکّے کا زیادہ حصّہ مشینوں اور کلوں کی خریداری کی بجائے غلّے کی درآمد پر خرچ ہو جائے گا کانفرنس کے بہت سے مندوبین نے بالکل بجا طور پر اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اگرچہ چاول کی ۹۵ فی صدی سے زیادہ پیداوار ایشیا میں ہوتی ہی اور یہیں اس کی زیادہ تر تجارت اور کھپت بھی ہوتی ہی لیکن اس وقت چاول کی تقسیم واشنگٹن سے ہو رہی ہی جنوبی مشرقی ایشیا میں ایک چاول بورڈ قائم کرنے کی بھی تجویز پیش کی گئی۔ زراعت کی تنظیم و ترقی کے کام میں ایشیائی ملکوں کے تعاون اور باہمی مشورے کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا۔

صنعتی ترقی کے سلسلے میں رپوٹ میں بتایا گیا ہی کہ اشتراکی ممالک، ترکی اور فلسطین و مشرقِ وسطیٰ کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر ایشیا کے تمام ممالک صنعتی لحاظ سے بہت پچھڑے ہوئے ہیں۔ ان ایشیائی ممالک میں جاپان کو چھوڑ کر ہندستان ہی کو ایک حد تک صنعت والا ملک کہا جا سکتا ہی۔ ہندستان میں بھی بنیادی صنعتوں کا فقدان پایا جاتا ہی چین میں تھوڑی بہت ملکی صنعتیں ہیں، بقیہ ایشیائی ممالک میں وہ بھی نہیں ہیں۔ ایشیا کا بڑا حصّہ ایسا ہی جو یورپ اور امریکہ کو خام مال بھیجتا ہی اور وہاں سے مصنوعات درآمد کرتا ہی۔ لیکن ایشیا کے مستقبل کا بیش تر انحصار اس بات پر ہی کہ وہ جلد از جلد صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ بن جائے، ورنہ اس کا آزاد یا غلام رہنا برابر ہوگا۔ اس سلسلے میں اہم ترین مسئلہ مشینوں اور کلوں کا ہی جو صرف امریکہ اور یورپ سے دست یاب ہو سکتی ہیں اور خام مال کے عوض میں۔ لیکن جنگ کے دوران میں ایشیا میں موخر الذکر کی بہت کمی پڑ گئی ہی۔

دوسرا مسئلہ اس سلسلے میں غیر ملکی سرمائے کا ہی۔ بہت سے ایسے ایشیائی ممالک ہیں جو اپنی صنعتی ترقی کے لیے غیر ملکی سرمائے کی درآمد پر مجبور ہیں، رپوٹ نے اس بات پر زور دیا کہ ایسی شرطوں پر (باقی صفحہ ۱۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

مسائل حاضرہ (غیر ممالک)

پنچایتی کھیتی

از: ــــــــــــ طاس

ذیل میں ہم یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ سوویت یونین کی پنچایتی کھیتی کیا چیز ہوتی ہے، اُس کی خصوصیات کیا ہیں اور وہ کس طرح کی جاتی ہے لیکن اس سے پہلے اُن حالات پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے وہاں پائے جاتے تھے۔

زار کے زمانے میں ۱۶ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ زمین ۲۸ ہزار زمیں داروں کی ملکیت میں تھی، اور ایک کروڑ کسان گھرانوں کے پاس صرف ۱۹ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ زمین تھی اس طرح فی زمیں دار تقریباً ۵ ہزار ایکڑ بلکہ اس سے زیادہ ہی زمین پڑتی تھی، اور ہر کسان گھرانے کے حصے میں (فرد نہیں بلکہ گھرانا جس میں متعدد افراد ہوتے ہیں) صرف بیس ایکڑ زمین۔ زمین دار پوری آبادی کا ۱۳ فی صدی حصہ تھے، لیکن قابل فروخت غلّے کا ۱۷٫۶ فی صدی حصہ اُن کے پاس چلا جاتا تھا کسان بہت غریب تھے، کاشت کاری کے طریقے پُرانے اور دقیانوسی طرز کے تھے جن سے پیداوار بہت کم ہوتی تھی۔

لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد بڑی بڑی زمیں داریاں محنت کش طبقے کے حوالے کر دی گئیں۔ کسانوں نے چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو ملا کر بڑے بڑے کھیت بنائے اور اُن میں بڑے پیمانے پر پنچایتی کھیتی شروع کی۔ زمین اب اشتراکی ریاست کی ملکیت بن گئی اور انفرادی اور ذاتی ملکیت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۳ کروڑ ایکڑ زمین جو پہلے زمیں داروں اور زار کے خاندان والوں کی ملکیت میں تھی کسانوں کے حوالے کر دی گئی۔ یہ اُس زمین کے علاوہ تھی جو پہلے ہی سے اُن کے

قبضہ وملکیت میں تھی۔ زار کے زمانے میں کسان ہر سال ۵۰ کروڑ طلائی روبل سے زیادہ کی رقم مال گزاری کے طور پر زمین داروں کو ادا کرتے تھے لیکن انقلاب کے بعد کسانوں پر سے اتنی بڑی رقم کا بوجھ بالکل ہٹ گیا۔ مویشی اور کھیتی باڑی کے بھی بہت سے سامان اُن کو ہاتھ آئے۔

کسانوں کے کھیتوں کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ سے زیادہ تھی، اُن کو ملا کر بڑے بڑے پنچایتی کھیت بنانا آسان نہیں تھا۔ حکومت کے لیے سب سے پہلے ضروری یہ تھا کہ پورے مُلک میں صنعتوں کا جال بچھا دے، ایسی صنعتوں کو بڑے پیمانے پر جاری کرے جو جدید طرز کی زراعتی مشینیں وکلیں اور کیمیائی کھاد تیار کر سکیں۔ زراعت کی توسیع و ترقّی کے لیے یہ ضروری تھا۔ لیکن کسان جس قسم کی کاشت کاری کے عادی تھے اُس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر کوئی چھوٹے چھوٹے کھیت میں علاحدہ علاحدہ طور پر کاشت کاری کرتا تھا اور جو اناج پیدا ہوتا تھا وہ زیادہ تر اُسی کے نجی استعمال میں آتا تھا۔ چناں چہ سوویت حکومت کا یہ بھی فرض تھا کہ وسیع پیمانے کی پنچایتی کھیتی کے فوائد کسانوں کو بتائے اور سمجھائے۔ سوویت حکومت نے کئی سال تک مسلسل یہ کام انجام دیا اور زبردست کامیابی حاصل کی۔ کسانوں کو سرکاری قرضے دیے اور اُن کی تنظیم میں مدد پہنچائی۔ صنعت بھی اس درمیان میں تیزی سے ترقّی کر رہی تھی اور زراعتی کلیں اور مشینیں بن بن کر دیہی اضلاع اور علاقوں میں پہنچ رہی تھیں۔ اس وقت سوویت یونین میں ایک ارب ۲۰ کروڑ ۵۸ لاکھ ۴۸ ہزار ایکڑ زمین میں پنچایتی کھیتی کی جاتی ہی۔ دن بہ دن پنچایتی کھیتوں کی حالت بہتر سے بہتر ہوتی گئی، پیداوار بڑھتی گئی اور کسان خوش حال ہوتے گئے۔ ہر پنچایتی کھیت کے فنڈ کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو کسانوں میں اُن کی محنت کے معاوضے کے طور پر تقسیم ہوتا ہی اور دوسرا وہ جو جمع رہتا ہی یا حکومت کو دیا جاتا ہی۔ جنگ سے پہلے ان اجتماعی کھیتوں کے پاس مجموعی طور پر اس ناقابلِ تقسیم فنڈ میں ۱۲ ارب روبل سے زیادہ کی رقم جمع تھی اور اس رقم کا ۹۰ فی صدی حصّہ خود پنچایتی کھیتوں کی آمدنی سے جمع ہوا تھا۔

پنچایتی کھیتی کا طریقہ

پنچایتی کھیت ایک قسم کی انجمن امدادِ باہمی ہوتا ہی جس میں کسان خود اپنی خواہش سے شامل ہوتے ہیں۔ وہ جب شامل ہوتے ہیں تو اپنی زمین اس انجمن امدادِ باہمی کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ مشترکہ ملکیت میں شامل ہو جاتی ہی۔ پنچایتی کھیت کی زمین، سامان، مشینیں اور فارم کی عمارتیں وغیرہ سب مشترکہ ملکیت شمار کی جاتی ہیں۔ ہر پنچایتی کھیت کو یہ حق حاصل ہی کہ وہ زیرِ کاشت زمین کو غیر معین عرصے کے لیے یا ہمیشہ کے لیے اپنے استعمال میں رکھے۔ زمین چوں کہ ریاست کی ملکیت ہوتی ہی اس لیے نہ تو وہ فروخت کی جاسکتی ہی اور نہ کرایے پر اُٹھائی جاسکتی ہی۔ جو چیزیں پنچایتی کھیت میں کام کرنے والوں کی ذاتی ملکیت سمجھی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:۔ رہنے کا مکان، گھر کے سامان و اسباب، چھوٹے چھوٹے آلے اور اوزار، گھر کا مودی خانہ جس میں اشیائے خوردنی وغیرہ ہوتی ہیں، تھوڑے سے مویشی اور مرغے

مرغیاں وغیرہ، اور مکان کے سامنے یا آس پاس زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا جس میں وہ نجی استعمال کے لیے اگر چاہیں تو پھل یا ترکاریوں وغیرہ کی کاشت کرسکتے ہیں۔ اس چھوٹی سی کاشت سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ کسان کی ذاتی ملکیت سمجھی جاتی ہے، اور وہ اُس پیداوار کو جس طرح چاہے کام میں لاسکتا ہے، اگر چاہے تو فروخت کرسکتا ہے۔ اس خرید و فروخت میں قیمت کا تعین طلب اور رسد کے عام قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

سوائے چند اہم امور کے (جیسے دیہی معاشیات یا فنِ حیوانات سے متعلقہ امور) جن کو صرف ماہرین ہی انجام دے سکتے ہیں اپنے اپنے پنچایتی کھیت کے اور تمام کام خود کسان ہی انجام دیتے ہیں۔ خاص خاص حالتوں میں البتہ معاوضے پر باہر سے کام کرنے والے بُلائے جاسکتے ہیں، جیسے اگر فصل کے خراب ہوجانے کا اندیشہ ہو اور اُس کو سنبھالنے کے لیے مزید کارکنوں کی ضرورت ہو تو معاوضے پر دوسرے کھیتوں کے کام کرنے والوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔

کام کس طرح ہوتا ہے؟ ہر اجتماعی کھیت میں کارکنوں کے مختلف گروہ ہوتے ہیں۔ فصل بھر کے لیے ہر گروہ کو زمین کا ایک خاص حصہ دے دیا جاتا ہے۔ ہر گروہ کی تشکیل کام کی نوعیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ جیسے ایک گروہ ہوتا ہے کھیت میں کام کرنے کے لیے، دوسرا مویشی کی دیکھ بھال کے لیے، تیسرا عمارتوں کی تعمیر اور درستگی کے لیے۔ اس قسم کی تقسیم سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر مرد یا عورت کو کسی خاص کام میں مہارت حاصل ہوجاتی ہے، اُسی کام میں جس کی طرف اُس کے اندر میلان یا صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ہر کام کا تھوڑا تھوڑا علم ہو لیکن مہارت کسی میں بھی نہیں۔ ہر گروہ میں سو یا اُس سے زیادہ کارکن ہوتے ہیں۔ پھر ہر گروہ کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ ہر چھوٹا گروہ چھ یا سات یا آٹھ افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ بڑے گروہ کے لیڈر کام کے لیے تجویزیں اور منصوبے تیار کرتے ہیں اور کام کی نگرانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ اجتماعی کھیت کے ہر کارکن کو، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان کام کی مقدار اور نوعیت کے مطابق معاوضہ دیا جاتا ہے۔

کام کی مقدار کا تعیّن چوں کہ انجمن امدادِ باہمی کے تمام ارکان سوویت قانون کی رُو سے بالکل یکساں حقوق کے مالک ہوتے ہیں اور کام بھی مشترکہ طور پر ہوتا ہے، اس لیے اجتماعی کھیت (جو ایک قسم کی انجمن امدادِ باہمی ہے) کی آمدنی محنت اور کام کی مقدار کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے۔ کام کی مقدار کا اندازہ لگانے اور معاوضے کا تعیّن کرنے کے لیے ایک عام معیار مقرر کیا گیا ہے۔ اس معیار کو "یومِ محنت کی اکائی" Work day unit کہتے ہیں۔ اس سے مراد ہے وہ اوسط محنت جو پنچایتی کھیت کا کارکن ایک روز میں کرسکتا ہے۔ اس اوسط محنت کی مقدار کام کی نوعیت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، اور ہر کام کا جو معیاری کوٹا ہوتا ہے اُس سے متعین ہوتی ہے۔ تمام پنچایتی کھیتوں کے

لیے کام کا معیاری کوٹا ایک ہی نہیں ہوتا بلکہ خاص حالات کے تحت مختلف ہوتا ہے۔ کام کا کوٹا مقرر کرنے میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جو مشین استعمال کی جا رہی ہے وہ کس قسم اور نوعیت کی ہے، زمین کیسی ہے، کام مشکل ہے یا آسان، کام میں کتنی مہارت کی ضرورت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جب کارکن مقررہ کوٹا پورا کر لیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے "یوم محنت" کی ایک اکائی پوری کرلی۔ اگر ایک ہی روز میں اس نے کوٹے سے زیادہ کام کیا تو کہا جاتا ہے کہ اس نے یوم محنت کی ایک اکائی سے زیادہ کام کیا اور اسی کے مطابق اسے مزید معاوضہ دیا جاتا ہے، ______ جیسے اناج کے متعدد گٹھے باندھنا ایک "یوم محنت" سمجھا جاتا ہے۔ گٹھوں کی تعداد ہر اجتماعی کھیت میں مختلف ہوسکتی ہے۔ ایک اچھا ٹریکٹر ڈرائیور دن بھر میں جتنا کام کرتا ہے اسے دو یوم محنت قرار دیا جاتا ہے۔ جو لوگ مقررہ کام سے زیادہ کرتے ہیں انھیں اشیا کی شکل میں مزید معاوضہ دیا جاتا ہے۔ جیسے اگر فالتو محنت کے باعث مقرر کردہ تعداد سے زیادہ چوزے پیدا ہوئے ہیں تو ان چوزوں کا نصف حصہ فالتو محنت کرنے والوں کو دیا جائے گا۔ اسی طرح فالتو انڈوں کا ایک چھٹا حصہ فالتو محنت کرنے والوں کو دیا جاتا ہے۔ پیداوار اور آمدنی کو اس طرح تقسیم کرنے سے اجتماعی کھیت کے کام میں تنظیم اور باضابطگی پیدا ہوتی ہے، اور لوگ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے کہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ ہم جتنی زیادہ محنت کریں گے اتنا ہی زیادہ معاوضہ اور چیزیں ملیں گی۔ جب محنت زیادہ ہوتی ہے تو پیداوار بھی بڑھتی ہے۔ اس کا اندازہ ایک مثال سے ہوسکتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں سوویت یونین کے اجتماعی کھیتوں کی مجموعی آمدنی (زر کی شکل میں) ۵ ارب ۶۶ کروڑ ۱۹ لاکھ روبل ہوئی تھی، اور ۱۹۳۷ء میں ۱۴ ارب ۱۸ کروڑ ایک لاکھ روبل گویا چار سال کے مختصر سے عرصے میں اجتماعی کھیتوں کی سالانہ آمدنی ۸ ارب ۵۱ کروڑ ۸۲ لاکھ زیادہ ہوگئی۔

اجتماعی کھیت کا انتظام

اجتماعی کھیت کا سارا انتظام کارکنوں کی مجلس عامہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، جس میں تمام کارکن شامل رہتے ہیں۔ کارکنوں کے جلسے میں ایک صدر اور منیجروں کا ایک بورڈ رائے دہندگی کے ذریعے چنا جاتا ہے۔ آڈیٹر یعنی حساب کی تنقیح کرنے والوں کا بھی رائے دہندگی ہی کے ذریعے انتخاب ہوتا ہے۔

اس جلسے میں کھیت جوتنے اور کاٹنے، مکانات تعمیر کرنے، نالی کے ذریعے دلدلی زمین سے پانی نکالنے اور دوسرے امور سے متعلق منصوبے پیش کیے جاتے ہیں اور ان کی تصدیق کی جاتی ہے۔ یہ جلسہ اگر چاہے تو اجتماعی کھیت میں نئے لوگوں کو داخل کرسکتا ہے اور کسی پرانے ممبر کو نکال سکتا ہے۔ اسی جلسے میں آمدنی کی تقسیم کا بھی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ "ماڈل پنچایتی کھیت" میں جو قاعدے درج ہیں انھی کے مطابق یہ تقسیم عمل میں لائی جاتی ہے۔ آمدنی کا زیادہ حصہ پنچایتی کھیت کے ممبروں میں "یوم محنت" کے حساب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اس سے بھی کم حصہ کھیت کے انتظامی امور میں خرچ ہونے کے لیے رکھ لیا جاتا ہے، جیسے یوکرین کے "اسٹالن پنچایتی کھیت" میں آمدنی کا ۳ر۴ فی صد حصہ حکومت کو ادا کیا گیا اور ۰ر۸ فی صد انتظامی امور کے لیے رکھا گیا اور بقیہ کوئی ۹۵ فی صد

حصّہ کام کرنے والوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ انتظامی امور کے لیے جتنی رقم رکھی گئی تھی اُس سے ۸ پاور انجن اور ۹ ٹرک خریدے گئے۔

فصل کی تقسیم

سال بھر کا حساب تیار کرنے اور فصل تقسیم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ فصل کا ایک حصّہ ٹیکس کے طور پر حکومت کو دیا جاتا ہے۔ عام طور سے یہ ٹیکس اشیا کی شکل میں دیا جاتا ہے، جیسے غلّہ، السی اور گوشت وغیرہ۔ ان کی قیمت کم رکھی جاتی ہے۔ پھر فصل یا پیداوار کا ایک حصّہ اشیا ہی کی شکل میں "مشین ٹریکٹر اسٹیشن" کے حوالے کیا جاتا ہے تاکہ دانہ نکالنے، کھیت کاٹنے، اور کھیت جوتنے بونے کی مشینوں اور ٹرک پر صرف ہو۔ اس کے بعد اجتماعی کھیت کے لیے پیداوار کا ½ حصّہ بچ رہتا ہے۔ آنے والے سال کے لیے اس میں سے بیج اور مویشی کے چارے کے لیے رکھ کر یا کھیت کی حالت درست کرنے اور مزید سامان خریدنے کے لیے رکھ کر بقیہ کارکنوں میں یومِ محنت کے حساب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس حساب سے، اگر کوئی خاندان متعدد افراد پر مشتمل ہو تو اُسے ۲۷ من سے زیادہ ہی اناج ملتا ہے۔ اناج کے علاوہ آلو، گوشت، مکھن اور اون الگ سے ملتا ہے۔ جمہوریہ یوکرین کے اسٹالن پنچایتی کھیت میں ہر کارکن کو ہر "یومِ محنت" کے عوض میں ۱۰ پونڈ غلّہ اور ۵ روبل ۱۰ کوپیک کی رقم دی گئی۔ پورے خاندان کے معاوضے کا اندازہ لگانے کے لیے یہ معلومات کافی ہیں کہ بوادِن نامی کسان کے خاندان کو ۷ر۹ ٹن غلّہ (ایک ٹن برابر ہے ۲۷ تا ۲۸ من کے) اور ۶۹۳۲ روبل کی رقم سال بھر کے لیے ملی اور پونو یزنکو کے خاندان کو ۲ر۶ ٹن غلّہ اور ۶۲۳۷ روبل کی رقم۔

مشین ٹریکٹر کے اسٹیشن

یہ اسٹیشن یا مرکز حکومت کی ملک ہوتے ہیں اور حکومت ہی اُن کو چلاتی بھی ہے۔ پورے ملک میں کوئی سات ہزار اس قسم کے مرکز قائم ہیں۔ ہر مرکز کئی کئی اجتماعی کھیتوں کو زراعتی مشینیں اور فنی ماہرین مہیا کرتا ہے۔ یہ ماہرین کسانوں کو مشینوں کا استعمال سکھاتے ہیں، مرکز کے حساب داں کسانوں کو اجتماعی کھیت کا حساب کتاب تیار کرنا اور درست رکھنا سکھلاتے ہیں اور ماہرینِ زراعت باری باری سے فصل اُگانا، رطوبت اور کھاد کی حفاظت کرنا اور اُن کو استعمال کرنا وغیرہ اور دیگر ضروری امور کی تربیت دیتے ہیں۔ بعض پنچایتی کھیتوں میں اتنا اعلا انتظام ہوتا ہے کہ اُن کو ٹریکٹر اسٹیشنوں کی مدد کی ضرورت نہیں رہتی۔ بعض کھیتوں کو صرف خاص خاص حالتوں میں اُن سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے جیسے بعض کھیتوں کو صرف کمبائن یا آلو کھودنے کی مشین یا بڑے بڑے ٹرک کی ضرورت پڑتی ہے "مشین ٹریکٹر اسٹیشن" سے بہ آسانی یہ چیزیں مل سکتی ہیں۔

ریاست کے کھیت

پنچایتی کھیتوں کے علاوہ ریاستی کھیت بھی ہوتے ہیں جن میں بہ راہِ راست ریاست کی نگرانی اور خرچ پر بالکل صنعتی کاروبار کی طرح بڑے پیمانے پر کاشت کاری کی جاتی ہے۔ سوویت یونین کے وسیع و عریض علاقے کے ہر حصّے میں اس قسم کے ریاستی کھیت موجود ہیں۔ ان کھیتوں میں بالکل نئی طرز کی مشینیں استعمال ہوتی ہیں چناں چہ ان ریاستی کھیتوں سے اجتماعی کاشت کاری کو پھیلانے میں بڑی مدد ملی ہے۔ گزشتہ جنگ سے پہلے ریاستی کھیتوں کی

تعداد ۳۹۵۷ تھی اور ان کے تحت ۱۶ کروڑ، ۸۰ لاکھ ایکڑ زمین میں کاشت ہوتی تھی۔ اِن کھیتوں میں نہ صرف غذائی چیزیں پیدا کی جاتی ہیں بلکہ صنعتوں کے کام آنے والی خام اشیا بھی، جیسے روئی، السی، شکر، چقندر، ترکاریوں کا تیل وغیرہ۔ جنگ سے پہلے ریاستی کھیتوں کا مجموعی زیرِ کاشت رقبہ ۳ کروڑ ۲۶ لاکھ ۸ ہزار ایکڑ تھا۔ ان کھیتوں کا انتظام اور دیکھ بھال بڑے بڑے انجنیر، ماہرینِ زراعت اور زرعی کارکنوں کے سپرد ہے جن کو اس کام کی بڑے بڑے اسکولوں اور کالجوں میں ماہرانہ تعلیم دی گئی ہے۔

———>•※(•※•)※•<———

نظری معاشیات

قدر کیا ہی؟

از: ــــــ شیر جنگ

کسی جنس کی قدر کس بات پر منحصر ہوتی ہی؟ کچھ جنسیں مہنگی ہوتی ہیں اور کچھ سستی، قدر کے اس اختلاف کی کیا وجہ ہی؟ جنسوں کی افادی قدریں آپس میں اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ مقداریں ان کا ایک دوسری کے ساتھ کوئی بھی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر، لوہے کے ایک ٹکڑے کا بھنے ہوئے کباب سے کیا جوڑ ہی؟ کچھ بھی نہیں! اس لیے قدر کا راز معلوم کرنے کے لیے ہمیں افادی قدر کی طرف نہیں بلکہ کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

جنس کی قدر انسانی محنت کی اُس مقدار پر مقرر ہوتی ہی جو اُس کی پیداوار میں صرف کی گئی ہو۔ اُس دور میں جب کہ تبادلہ کبھی کبھی اور اتفاقی طور پر ہوتا تھا، اس تبادلے کے تناسب میں کوئی ترتیب نہ ہوتی تھی بلکہ یونہی وقتی طور پر بے ہنگم پن سے ہوجاتا تھا۔ جب کبھی جنگلی سماج کا کوئی شکاری، گلہ بان قبیلے کے کسی فرد سے ملتا تھا، اور کچھ گوشت کا اناج سے تبادلہ کرتا تھا تو تبادلے کا یہ تناسب بلا کسی اصول کے ہنگامی حالات مقرر کرتے تھے۔ لیکن مبادلے کے ارتقا نے ان حالات میں زمین و آسمان کا فرق پیدا کردیا۔

فطری یعنی ابتدائی معیشت کا دور ختم ہوجانے کے بعد سے مبادلے کے تناسب کا رُخ ہمیشہ یہ رہا ہی کہ وہ تبدیل ہونے والی چیز پر خرچ کی ہوئی محنت کے نزدیک تر ہوتی گئی ہی جب 'سادہ پیداوار' Simple production کے دور میں ایک کسان ایک دست کار سے اُس کے بنائے ہوئے کلہاڑے کو، کچھ اناج دے کر خریدتا تھا، تو وہ دست کار کو تقریباً اُتنا ہی اناج دیتا تھا

جتنا کہ اُس کلہاڑے پر صرف کی ہوئی محنت کے برابر محنت صرف کرنے سے پیدا ہوتا تھا۔

بے شمار شہادتیں، اس سچائی کے ثبوت میں ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتی ہیں کہ ہر جنس اپنے پر صرف شدہ انسانی محنت کے تناسب سے، دوسری جنس کے ساتھ تبدیل ہوتی ہے۔ بہت ساری جنسیں جو کبھی بہت گراں تھیں، آج نہایت سستے داموں بازار میں بک رہی ہیں کیوں کہ موجودہ حرفتی ارتقا Technical Development کی وجہ سے آج اُن کی پیداوار میں بہت کم محنت صرف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر المینیم دھات کو لے لیجیے جس سے آج برتن وغیرہ بنائے جاتے ہیں، کچھ زمانہ پہلے یہ دھات چاندی کی نسبت آٹھ دس گنا زیادہ گراں تھی۔ لیکن برقیاتی سائنس Electro Technical Science کی ترقی کے بعد المینیم بہت تھوڑی محنت سے پیدا کی جانے لگی، حتیٰ کہ ۱۹۱۴ء کی عالمگیر سامراجی جنگ سے پہلے اس کی قیمت ۴۰ سنٹ Cent فی کلوگرام Kilogram تک گر گئی تھی جب کہ ابتدا میں اس کی قیمت ۵۰۰ سنٹ فی کلوگرام تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ دھات ہزار گنا سستی ہو گئی تھی۔ اس کے اس قدر سستے ہونے کا راز محض یہی ہے کہ اب اس کی پیداوار میں بہت کم محنت صرف ہونے لگی تھی۔ تھوڑی سی محنت سے یہ بہت زیادہ پیدا ہونے لگی تھی۔

پس کسی بھی جنس کی قدر اُس محنت کی مقدار پر منحصر ہے جو اُس کو پیدا کرنے میں صرف ہوئی ہو۔ اگر محنت کی اُسی مقدار سے، جس کو صرف کر کے ہم پہلے تھوڑی چیزیں پیدا کر سکتے تھے، اب زیادہ چیزیں پیدا کر لیں، تو کہا جائے گا کہ محنت کی پیداوار بڑھ گئی ہے اور اگر اس سے اُلٹا ہو تو کہا جائے گا کہ محنت کی پیداوار گھٹ گئی ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ بڑھی ہوئی پیداوار کے معنی ہیں کہ محنت کی وہ مقدار جو کسی ایک جنس پر خرچ آنی چاہیے تھی گھٹ گئی ہے۔ نتیجے کے طور پر اُس جنس کی قدر بھی گھٹ جائے گی، اور اب اس قسم کی ہر جنس سستے داموں بکنے لگے گی۔ اس کے برخلاف اگر پیداوار گھٹ جائے تو جنس مہنگی ہو جائے گی۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ محنت کی پیداواری طاقت اور پیدا کی ہوئی جنسوں میں سے ہر اکائی کی قدر آپس میں تناسب معکوس Inverse proportion رکھتی ہیں (یعنی جب ان میں سے ایک بڑھتی ہے تو دوسری گھٹ جاتی ہے، جب پیداواری طاقتیں گھٹتی ہیں تو قدر بڑھ جاتی ہے)۔

جتنی محنت کسی جنس کی پیداوار میں خرچ آتی ہے اُسی کے حساب سے اُس کی قدر بھی مقرر ہوتی ہے۔ جنس کی قدر اصل میں محنت کے وقت کی وہ مقدار ہے جو اُس جنس کے پیدا کرنے میں اُس پر لگی ہو، دوسرے لفظوں میں اُس میں شامل کی گئی ہو۔ لیکن یہ قدر اپنے آپ کو اُسی وقت ظاہر کرتی ہے جب ایک جنس دوسری جنس کے مقابلے میں آتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک من لوہا حاصل کرنے میں اتنی ہی محنت لگی ہے جتنی کہ ایک چھٹانک چاندی میں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک من لوہے کی قدر اُتنی ہی ہوگی جتنی کہ ایک چھٹانک چاندی کی۔ جنس کی جو قدر دوسری جنس کی قدر کے مقابلے میں ظاہر ہوتی ہے وہی اس کی قدر مبادلہ Exchange Value

کہلاتی ہے۔ "قدر مبادلہ" اصل میں وہ شکل ہے جس میں کہ کسی جنس کی قدر اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جنس کی اس شکل میں (یعنی قدر مبادلہ میں) ہمارے پاس جنس کی وہی قدر ہے جو اس جنس میں لگائی ہوئی محنت کے وقت کا اظہار کرتی ہے۔

پیداوار کے ترقی یافتہ دور میں جب کہ جنسوں کا تبادلہ زر کے توسط سے ہونے لگتا ہے تو ہر جنس کا توازن۔ زر کی ایک خاص مقدار سے کیا جاتا ہے۔ اب جنس کی قدر، زر کی شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہے اور قدر مبادلہ، جنس کی قیمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ قیمت کیا ہے؟ جنس کی قدر، زر کے تلازمے میں ظاہر کرتا ہے اس جنس کی قیمت کہلاتا ہے۔

خاص اور عام محنت | جنس کے اندر حقیقی طور پر جو تناقض (تضاد) ہے اس کو سمجھنے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ خود محنت کی اقسام کو سمجھ لیا جائے، جس سے کہ جنسیں پیدا ہوتی ہیں۔

جنسوں کو آپس میں تبدیل کرتے ہوئے لوگ مختلف قسم کی محنتوں کو ایک دوسرے کے متوازی کرتے ہیں۔ ایک موچی کی محنت، اس آدمی کی محنت سے بالکل مختلف ہے جو صفار خانے Foundry میں کام کرتا ہے۔ ایک درزی اور کان میں کام کرنے والے مزدور کی محنت میں کچھ بھی مطابقت نہیں ہے۔ ہر ایک جنس میں، کسی خاص پیشے یا دست کاری کی کسی خاص شاخ کی محنت شامل ہوتی ہے مثلاً کرسی میں وہ محنت شامل ہے جو بڑھئی کے پیشے میں سدھائی گئی ہے۔ اور آئینے میں وہ شامل ہے جو شیشہ گری کے پیشے میں سدھائی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے عام انسانی محنت۔ مختلف جنسوں میں، محنت کی مختلف قسمیں، مختلف پیشوں کے مختلف اسلوب اور مختلف قسم کی کاری گری ہوتے ہوئے بھی، عام انسانی محنت سب کے اندر مشترک ہے۔ کیوں کہ دنیا کی تمام جنسیں، انسانی دماغ کی اور انسانی پٹھوں کو پھیلانے اور سکیڑنے کے ایک عام عمل کی پیداوار ہیں۔ اس مشترک عام محنت کو 'تجریدی محنت' Abstract Labour بھی کہا جاتا ہے تاکہ اس مخصوص انسانی محنت سے، یعنی ہر علاحدہ پیشے کی خاص محنت Concrete Labour سے جو ہر جنس کو اس کی مخصوص شکل دیتی ہے امتیاز کرنے میں آسانی ہو سکے۔

ہر ایک جنس عام انسانی محنت کی ایک مخصوص مقدار کو ہی ظاہر کرتی ہے اور کچھ نہیں۔ خاص محنت Concrete Labour جنس کے اندر افادی قدر پیدا کرتی ہے، موچی کی خاص محنت جوتے پیدا کرتی ہے، بڑھئی کی خاص محنت کرسی وغیرہ، اور کان مزدور کی خاص محنت لوہا کوئلہ وغیرہ۔ ان جنسوں کی قدر، جنسی پیداوار کے دور میں محض اس عام انسانی محنت کی مقدار کو ہی ظاہر کرتی ہے کہ جو ان کے پیدا کرنے میں لگی ہے۔

جنسی پیداوار کے دور میں، ہر محنت بہ یک وقت عام بھی ہے اور خاص بھی۔ عام اس لحاظ سے کہ یہ جنسوں کے اندر قدر پیدا

کرتی ہے، اور خاص اس لحاظ سے کہ یہ ان کے اندر قدرِ افادہ پیدا کرتی ہے۔ ایک طرف تو ہر پیدا کنندہ جوتے، کپڑے، کرسیاں، لوہا، کوئلہ وغیرہ افادی قدریں پیدا کرتا ہے جو کہ موچی، درزی، بڑھئی اور کان مزدور وغیرہ کی خاص محنت کو ظاہر کرتی ہیں اور دوسری طرف وہی موچی، درزی، بڑھئی اور کان مزدور جوتے، کپڑے، کرسیاں، لوہے کوئلے وغیرہ میں اپنی عام محنت سے قدر پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان چیزوں کو اپنے استعمال کے لیے نہیں بلکہ منڈی میں تبادلے کے لیے پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ تبادلہ اس لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ جوتے، کپڑے، کرسیاں وغیرہ ایسی جنسیں پیدا کرتے ہیں جن کے اندر قدر ہوتی ہے اور یہ قدر عام عالمگیر انسانی محنت کی پیدا کردہ چیز ہے۔

ابتداء سے ہی ہر جنس اپنی یہ دوہری خاصیت یعنی افادی قدر کا اور قدر کا اظہار کرتی ہے۔ اب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو محنت ان جنسوں کی پیداوار میں، یعنی جو محنت سرمایہ دارانہ پیداوار میں لگتی ہے، اس کی بھی یہی دو خاصیتیں ہوتی ہیں۔ خاص اور عام محنت کا یہ فرق، جنسوں کے اندر افادی قدر اور قدر کے باہمی تناقص کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ خاص محنت افادی قدر پیدا کرتی ہے اور عام محنت قدر اصل پیدا کرتی ہے۔

محنت کی یہ خاص اور عام وصفی تقسیم محض جنسی پیداوار Commodity Production کے دور میں ہی ہوتی ہے۔ محنت کی یہ دوگانہ خاصیت، جنسی پیداوار کے بنیادی تناقص کا اظہار کرتی ہے۔ جنسی پیداوار کے دور میں سماج کے ایک فرد کا کام (عام محنت) ایک طرف تو سماج کی مجموعی محنت کے سمندر میں گویا ایک قطرہ ہے اور دوسری طرف یہی کام مختلف انفرادی مزدوروں کی خاص محنت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے یہ بات صاف ہے کہ خاص اور عام محنت کا باہمی تناقص جنسی پیداوار کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اس کے خاتمے پر ختم ہو جاتا ہے۔

جنسی پیداوار میں اکیلے اکیلے مزدور کا کام، سماج کی مجموعی محنت کے سمندر میں محض ایک قطرہ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر کان کن، لوہار، درزی کی محنت، سماجی پیداوار کی عام زنجیر میں ایک کڑی بن جاتی ہے۔ ہر کام اس زنجیر کی ایک کڑی تو ضرور ہوتا ہے، لیکن جنسی پیداوار میں، ہر کام اپنی اپنی جگہ آزاد بھی ہوتا ہے۔ انفرادی محنت، ایک طرف تو ان معنوں میں سماجی محنت ہو جاتی ہے کہ ہر پیدا کنندہ اپنے کام کے ذریعے ہزاروں دوسرے لوگوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے، لیکن دوسری طرف، الگ الگ مزدوروں کی یہی محنت وسیع سماجی پیمانے پر منظم نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے خلاف انفرادی طور پر مزدوروں کی یہ محنت الگ الگ اور بکھری ہوئی رہتی ہے۔

الگ الگ آزاد مزدوروں کی انفرادی محنت اور اس کی سماجی ہیئت کے مابین یہ تناقص جنسی پیداوار کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اس کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

سماجی طور پر لازمی محنت | اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ ہر ایک جنس کی قدر، اس کی پیداوار میں لگی ہوئی محنت کی مقدار کے مطابق

مقرر ہوتی ہے تو یہ دھوکا پیدا ہو سکتا ہے کہ مزدور جتنا ہی سست اور انجان اور اناڑی ہوگا اُس کی پیداوار اُتنی ہی گراں قدر ہوگی۔ بات ایسی نہیں ہے۔

مان لیجیے کہ دو موچی آمنے سامنے بیٹھے کام کر رہے ہیں، ان میں سے ایک ہُنرمند ہے اور پھرتی سے کام کر کے ایک دن میں ایک جوڑا تیار کر لیتا ہے۔ دوسرا شرابی اور سست ہے، اُسے ایک جوڑہ بنانے میں ایک ہفتہ لگ جاتا ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سست موچی کے جوڑے کی قدر پہلے موچی کے جوڑے کی نسبت زیادہ ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں!

دستی کرگھے پر کام کرنے والا جولاہا پہلے آٹھ یا دس گھنٹے کام کیا کرتا تھا، اور اب، یعنی مشینی کرگھے کی ایجاد کے بعد، اُس کو اپنے دستی کرگھے پر اٹھارہ سے بیس گھنٹے تک کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اُس کے بیس گھنٹے کا کام اب محض دس گھنٹے کی سماجی محنت کے برابر رہ گیا ہے۔ یعنی ایسے دس گھنٹے جو نئے حالات میں سوت کی ایک خاص مقدار کو کپڑے کی شکل میں تبدیل کرنے کے لیے سماجی طور پر لازمی ہیں۔ مطلب یہ کہ جس پیداوار پر وہ بیس گھنٹے خرچ کرتا ہے اُس کی قدر اب مشینی کرگھے کے عام ہو جانے کی وجہ سے اُتنی ہی رہ جاتی ہے، جتنی کہ مشینی کرگھے سے پہلے دس گھنٹے کی ہوتی تھی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنس کی قدر اُس محنت پر منحصر نہیں ہے جو اُس اکیلی جنس کی پیداوار پر خرچ ہوئی ہے بلکہ اُس محنت پر منحصر ہے جو اُس کی پیداوار کے لیے سماجی طور پر اوسطاً ضروری ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اُس کی قدر سماجی اوسط کے لحاظ سے، یا سماجی حالات کے مطابق معیاری سماجی محنت پر منحصر ہے۔

سادہ اور ہُنرمند محنت

ہمارے لیے سادہ اور ہُنرمند محنت کا فرق دیکھنا بھی لازمی ہے۔ ایک ٹوکری ڈھونے والے راج مزدور اور ایک گھڑی بنانے والے (مرمّت کرنے والے سے مراد نہیں ہے) کاری گر کی مثال لے لیجیے۔ راج کی محنت کا ایک گھنٹہ، گھڑی بنانے والے کاری گر کی محنت کے ایک گھنٹے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ راج کا کام سیکھنے کے لیے کسی لمبی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ سادہ محنت ہے اور تھوڑے عرصے میں آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ ہر ایک انسان بلا کسی دقّت کے آسانی کے ساتھ راج مزدور بن سکتا ہے لیکن اگر گھڑی بنانے والا کاری گر (یا کیمسٹ) بننا ہو تو یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ گھڑی بنانے کا فن سیکھنے کے لیے کم از کم تین سال تک اس ہُنر کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ جو لوگ گھڑی ساز بننے کے لیے ایک لمبا عرصہ اس ہُنر کی تعلیم حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں، وہ اسی امّید میں تو کرتے ہیں کہ اُن کی اس محنت کا معاوضہ انھیں بعد میں مل جائے گا۔ کس طرح؟ یوں کہ بیس گھنٹے میں ایک گھڑی تیار کر کے وہ اُس کے تبادلے میں اتنی جنسیں حاصل کرے گا جن کو سادہ محنت کے تیس گھنٹوں نے تیار کیا ہو۔ اس طرح ہُنرمند محنت کا جسے "مرکّب محنت" بھی کہا جاتا ہے، ایک گھنٹہ منڈی میں سادہ یا غیر مرکّب محنت کے ڈیڑھ گھنٹے کے برابر ہو جاتا ہے۔

اگر ہنرمند اور سادہ محنت کے ایک گھنٹے کو برابر سمجھ لیا جائے، یعنی منڈی میں، دونوں محنتوں کی ایک مقررہ وقت میں پیدا کی ہوئی جنسوں کا تبادلہ برابری کے درجے سے ہونے لگے تو اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہنرمند محنت ملنی مشکل ہو جائے گی۔ گھڑی سازوں، کیمسٹوں اور دوسرے ہنرمندوں کی تعداد گھٹتی جائے گی۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ گھڑیاں، ادویات وغیرہ چیزیں منڈی میں نہایت کم یاب ہو جائیں گی، جس سے ان کی قیمت بہت چڑھ جائے گی۔ اس کا نتیجہ پھر یہی ہوگا کہ گھڑی ساز کی مرکب محنت کا ایک گھنٹہ، سادہ محنت کے ڈیڑھ یا دو گھنٹے کے برابر ہو جائے گی اور ہنرمند محنت کا سیکھنا پھر منفعت بخش ہو جائے گا۔

منڈی اور مقابلہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنس کی قدر کا انحصار اس سماجی طور پر لازمی محنت پر ہے جو کہ اس کی تیاری میں خرچ ہوئی ہو۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ جنسی پیداوار کے نظام میں ہر ایک جنس ہمیشہ اپنی پوری قدر پاکر تبدیل ہوتی ہو؟ ہرگز نہیں! یہ تو اسی حالت میں ممکن ہوسکتا ہو کہ جب اس جنس کا جو کہ پیدا کی گئی ہے، فوراً ہی خریدار مل جائے۔ یعنی جنس کی رسد اور طلب برابر رہے۔ کیا یہ ممکن ہو؟

پیداوار کے نظام میں ایسا کوئی بھی ادارہ نہیں ہو جو انفرادی طور پر پیدا کرنے والے کو یہ بتا سکے کہ ان کو کون سی شے اور کتنی مقدار میں پیدا کرنی چاہیے۔ جب تک پیداوار کا بہت بڑا حصہ محض فوری استعمال کے لیے ہی تیار ہوتا ہو اور منڈی میں محض تھوڑا سا فاضل حصہ جاتا ہو اس وقت تک منڈی کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی، مگر جنسی پیداوار کی ترقی اور وسعت کے ساتھ منڈی بہت بڑی اہمیت حاصل کرجاتی ہو، حتیٰ کہ اخیر میں اس کے قوانین ہمہ گیر قوانین بن جاتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو جداگانہ اور انفرادی طور پر جنسیں تیار کرتا ہو، اپنی جوکھم پر ہی ایسا کرتا ہو کیونکہ جنس کے تیار ہو جانے کے بعد ہی اور اس کے منڈی میں پہنچ جانے پر ہی اسے معلوم ہوتا ہو کہ بازار میں اس کی جنس کی مانگ ہو یا نہیں۔

قیمت کیا ہو؟ قیمت جنس کی قدر کے اس روپ کا نام ہو جو اپنے آپ کو زر کی شکل میں ظاہر کرتا ہو۔ یعنی قدر کی مالی Monetary شکل کو قیمت کہتے ہیں اور یہ یعنی قیمت، منڈی کی حالت کے مطابق، رسد و طلب کے مطابق، ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہو۔ منڈی میں جنس کی قیمت کے متعلق خریدار اور بیچنے والے کے درمیان ہمیشہ ایک کش مکش چلا کرتی ہو ایک طرف آپس میں بیچنے والوں کے درمیان اور دوسری طرف خریدنے والوں کے درمیان آپس کا مقابلہ اس کش مکش کا فیصلہ کرتا ہو۔ یعنی جنس کس قیمت پر بکنی چاہیے اس کا فیصلہ فریقین کی باہمی اور اپنی اپنی جد و جہد کیا کرتی ہو۔ اس لیے جنس کی قیمت، ہمیشہ ہی، اس کی قدر کے برابر نہیں رہ پاتی کبھی یہ قدر سے زیادہ ہوتی ہو اور کبھی کم۔ لیکن اس کی یہ قدر ہمیشہ وہ مرکز یا محور بنی رہتی ہو جس کے گرد، جس کے آس پاس اس جنس کی قیمت گھوما کرتی ہو۔

اگر جنسیں مانگ سے زیادہ تیار ہو جائیں اور چیزوں کی رسد، طلب سے بڑھ جائے تو ان کی قیمت اُن کی قدر سے کم رہ جاتی ہے۔ جب قیمت، قدر کی نسبت کم رہ جاتی ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیدا کنندہ کو اُس جنس پر خرچ کی ہوئی محنت کا پورا ثمر حاصل نہیں ہوتا۔ اب اس کے لیے، اس جنس کو چھوڑ کر کوئی دوسری ایسی جنس پیدا کرنا سودمند ہوگا، جس کی منڈی میں زیادہ مانگ ہو۔ چناں چہ پہلی جنس کی پیداوار گھٹا دی جاتی ہے۔ اس جنس کی پیداوار گھٹانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسد و طلب کا باہمی توازن اس گھٹی ہوئی جنس کے حق میں جھک جاتا ہے۔ اور کچھ عرصہ بعد اس کی قیمت پھر قدر کے برابر ہو جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو قدر سے بھی اوپر بڑھ جاتی ہے۔

صرف اسی ایک طریقے سے، یعنی اُتار چڑھاؤ کے مسلسل عمل سے، قدر کا قانون کام کرتا ہے۔ جنسیں محض اُسی حالت میں اپنی قدر کے برابر قیمت پا سکتی ہیں جب اُن کی رسد اور طلب بالکل متوازن ہو۔ لیکن یہ شاذ ہی ہوتا ہے۔

قدر کا قانون، منڈی کی اندھی طاقت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہر منفرد پیدا کنندہ کو اس اندھی طاقت کے ماتحت ہو کر چلنا پڑتا ہے۔ مارکس کے لفظوں میں، یہ طاقت اُسی طرح کام کرتی ہے جس طرح کہ اچانک کوئی مکان بیٹھ جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منفرد پیدا کنندہ کو کبھی بھی پہلے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ منڈی اُس سے کیا چاہتی ہے۔ قدر کا قانون الگ الگ اور آزاد پیدا کنندگان سے بے پروا ہو کر بالا بالا ہی کام کرتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نراج جنسی پیداوار کی ایک خصوصیت ہے یعنی جنسی پیداوار میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ سماج میں پیداوار کا عمل کسی منصوبے Plan کے مطابق نہیں ہوتا۔ جس سماج میں پیداوار کے اندر نراج ہو، وہاں قدر کا قانون ایک اندھے، غیر شعوری اور لاشخصی Impersonal قانون کی طرح کام کیا کرتا ہے۔

جنسی پیداوار کا طریقہ، اپنی ابتدا سے ہی ترقی یافتہ شکل میں نمودار نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے سے پہلے کے معاشی ڈھانچے کو ـــــ قدرتی معاشی ڈھانچے کو ـــــ آہستہ آہستہ کمزور کرتا ہوا اور آخر میں ختم کر کے ہی نمودار ہوا تھا۔ یہ عمل، یعنی 'قدرتی معاشی ڈھانچہ' سے 'جنسی معاشی ڈھانچہ' میں تبدیل ہونے کا عمل ایک لمبے عرصے کا یعنی صدیوں کا عمل ہے۔ مارکس نے اس تاریخی دور کا بہ تفصیل اور عمیق مطالعہ کیا، اور اس مطالعے کی بنا پر، قدر کی شکلوں کا اور زر کا نہایت تفصیل کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیے میں اُس نے دکھایا کہ قدر نے کب، کس طرح اور کس توسط سے اپنے آپ کو زر کی شکل میں ظاہر کیا۔ اس کے لیے اُس نے مبادلے کے عمل کا تاریخی پس منظر میں مطالعہ کیا اور اس مطالعے کے دوران میں اس نے ابتدا کے اتفاقی مبادلہ سے لے کر زرِ مبادلہ کی مختلف شکلوں کا یعنی مویشی سے شروع کر کے، قیمتی دھات سونا وغیرہ اور سکّہ تک کی تمام شکلوں کا نہایت عالمانہ تجزیہ کیا ہے۔ آخر میں اُس نے دکھایا کہ جنسی مبادلے کے انتہائی ترقی یافتہ دور میں، زرِ مسکوکہ (یعنی رُپیہ وغیرہ) کس طرح

انفرادی محنت کی سماجی شکل کو چھپادیتا ہے اور کس طرح اُن مختلف جنسوں کو پیدا کرنے والوں کے سماجی تعلقات پر، جو منڈی میں ایک دوسرے سے دوچار ہوتے ہیں، نقاب ڈال دیتا ہے مارکس نے نہایت تفصیل کے ساتھ، اُن تمام امور کا تجزیہ کیا ہے جو کہ زرسماج کے اندر، مختلف شکلوں میں اور مختلف طریقوں سے پورا کرتا ہے، اور اس تجزیے کے دوران میں، تاریخی مواد کا ایک بے پناہ اور وسیع خزانہ اُس نے اپنی کتاب "سرمایہ" کے صفحوں پر بکھیر دیا ہے۔

قدر کا قانون جنسوں کے سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کا حرکتی قانون ہے۔

جنسی پیداوار کے سرمایہ دارانہ نظام میں، پیداکنندگان کا باہمی سماجی رشتہ ایک دبیز پردے میں چھپا ہوا رہتا ہے۔ یہ سماجی رشتہ جنسوں کے مبادلے میں ظاہر ہوتا ہے۔ جنسی پیداوار کے نظام میں، محنت، قدر کی شکل اختیار کرجاتی ہے۔ جنسیں، اپنی قدر کے لحاظ سے آپس میں تبدیل ہوتی ہیں، یعنی اُس عام محنت کی مقدار کے مطابق جو کہ اُن کی پیداوار میں سماجی طور پر لازماً لگائی گئی ہو۔ وہ تمام تناقض جو کہ سرمایہ دارانہ جنسی پیداوار کے اندر خلقی طور پر پائے جاتے ہیں۔ یہ سب جنسوں میں، اُن کی قدر میں، اُن کے مبادلے میں، اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔

قدر کا قانون، سرمایہ دارانہ جنسی پیداوار کا حرکتی قانون ہے۔ یہ حرکت تناقضوں اور تضادوں کی مزید ترقی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، جن کے جراثیم خلقی طور پر قدر کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ یہ تناقض معاشی بحران کے زمانے میں اور بھی خطرناک صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ پیداوار کا انراج، جو جنسوں کے سرمایہ دارانہ پیداواری نظام کی خصوصیت ہے۔ معاشی بحرانوں کے زمانے میں برہنہ ہوکر سامنے آجاتا ہے۔ موجودہ عہد کا معاشی بحران اس کی بیّن مثال ہے۔ پیداواری طاقتوں اور پیداواری تعلقات کے درمیان جو تضاد ہیں، یعنی وہ تضاد جو سرمایہ دارانہ نظام کو اُس کی یقینی موت کی طرف گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں معاشی بحرانوں کے دور میں بے نقاب ہو کر صاف نظر آنے لگتے ہیں۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

بنگال کا مسئلہ آبادی اور زراعت

از : ——————— شفیق الرحمان

بنگال کا مجموعی رقبہ ۸۲ ہزار ۸۷۷ مربع میل ہے اور اوسطِ آبادی ۷۴۲ نفوس فی مربع میل۔ برطانوی ہند میں سب سے زیادہ اوسط آبادی یہیں ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں اوسط آبادی کا شمار ۶۲۷ فی مربع میل تھا۔ دنیا میں اس وقت سب سے گھنی آبادی بنگال ہی میں ہے۔ کچھ اضلاع میں جہاں زراعت خاص ذریعۂ آمدنی ہے آبادی حد سے زیادہ گھنی ہے اور اس کے بڑھنے کی رفتار بیسیوں سال سے یکساں رہی ہے۔ اس وقت بھی اس میں کسی قسم کی کمی نہیں نظر آتی۔ ضلع ڈھاکہ میں فی مربع میل آبادی ۱۵۴۷ ہے، تپیرا میں ۱۵۲۵ اور بقیہ گیارہ اضلاع میں ۸۰۰ فی مربع میل۔ ان اضلاع میں صنعت یا تو بالکل نہیں پائی جاتی یا اگر ہے بھی تو محض برائے نام۔ اب اُن اضلاع کو لیجیے جہاں آبادی نسبتاً کم ہے۔ ان میں بھی دراجلنگ، جلپائی گوڑی، ریاست تری پورا اور چٹ گانو کے پہاڑی علاقوں کو چھوڑ کر بقیہ اضلاع میں کافی آبادی ہے یعنی کوئی ۵۰۰ فی مربع میل۔

سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری سے پتا چلتا ہے کہ سنہ ۱۹۳۱ء کے مقابلے میں آبادی بڑھ گئی ہے۔ بڑھنے کی رفتار یہ رہی ہے، ۹ء۱۵ فی صدی سے کم نہیں اور ۹ء۲۹ سے زیادہ نہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۳۱ء کے درمیانی عرصے میں یہ رفتار ۹ء۱۵ سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ لیکن معاملہ یہیں پر آکر ختم نہیں ہو جاتا، سنہ ۱۹۴۱ء کے مردم شماری کے کمشنر نے بتایا تھا کہ آبادی اور بڑھے گی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"جنوب کی بہ نسبت شمال میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار زیادہ تیز ہے۔ بالکل مغرب اور بالکل مشرق میں یہ رفتار

سب سے تیز ہی۔ آبادی کے لحاظ سے سب سے قابلِ توجہ علاقے پنجاب اور بنگال کے ہیں اور یہ دونوں نسبتاً نئی آبادیوں کے علاقے ہیں"

بنگال کے زراعت پیشہ اضلاع کی فی مربع میل آبادی اور اُس کے بڑھنے کی رفتار کے لحاظ سے مندرجہ بالا الفاظ پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ مشرقی بنگال میں آبادی کے گھٹنے کا ذرہ برابر بھی امکان نہیں ہی۔ پورے بنگال میں یہی صورتِ حال ہی اگرچہ مغربی بنگال میں اضافے کی رفتار نسبتاً کم ہی۔ چناں چہ یہ کہا جا سکتا ہی کہ سنہ ۱۹۴۷ء اور سنہ ۱۹۵۰ء کے درمیانی عرصے میں وہاں بھی آج کے مشرقی بنگال کے برابر آبادی ہوجائے گی۔ یہ امکان صرف اس صورت میں ختم ہوسکتا ہی کہ کوئی بہت بڑی آفتِ سماوی نازل ہوجائے جس میں کثیر لوگ ختم ہوجائیں۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی صورت نہیں ہی۔

یہ تو آبادی کے بڑھنے کی رفتار رہی ہی، اب آیئے دیکھیں کہ گزشتہ چند سال میں بنگال کی زرعی پیداوار میں کتنا اضافہ ہوا ہی بنگال کی خاص غذائی پیداوار چاول ہی اس لیے چاول سے متعلق اعداد و شمار سے پوری زرعی پیداوار کے بڑھنے یا گھٹنے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہی۔

چاول کی پیداوار

سال	مقدار
سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	۷۳ لاکھ ٹن
سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء	۶۴ لاکھ ٹن
سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	۹۶ 〃
سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	۸۲ 〃
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۹۲ 〃
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۹۴ 〃
سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	۹۳ 〃
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۸۶ 〃
سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء	۸۲ 〃
سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۷۲ 〃
سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء	۱۰۶ 〃
سنہ ۱۹۳۷-۳۸ء	۹۰ 〃

اوپر کے جدول سے اندازہ ہوگا کہ چاول کی پیداوار سال بہ سال بڑھتی نہیں رہی ہی، بلکہ سنہ ۱۹۳۳ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک مسلسل

گھٹتی رہی ہے۔ اوسط نکال کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک پیداوار اپنی جگہ پر قائم رہی ہے، یعنی نہ تو بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے۔ پورے ہندستان میں غلّے کی پیداوار کی یہی حالت رہی ہے۔

اب ہم اس بات کی تحقیقات کریں کہ کسان کی آمدنی اور خرچ کی اس دوران میں کیا کیفیت رہی ہے، آیا موجودہ آمدنی سے وہ اپنا خرچ پورا کر لیتا ہے یا اُس کی حالت کو درست کرنے کے لیے کاشت کاری کے طریقے کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ پھر اس کے بعد ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ آیا اس طرح آبادی کے اضافے سے زراعت پر جو مزید بوجھ پڑنے لگا ہے اُس کو وہ برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں۔

۱۹۲۸ء میں بنگال میں ایک بینک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی بٹھائی گئی تھی۔ اس نے جو رپوٹ پیش کی اُس سے اندازہ ہوا کہ ۵ء۱۵ نفوس پر مشتمل کسان خاندان کی آمدنی ۵ء۲۱ ایکڑ زمین سے مندرجہ ذیل ہوتی ہے:-

آمدنی:-

خاندان کی آمدنی صرف زراعت سے ——————	مبلغ ۴۰۶ رُپے سالانہ
زراعت سے ملحقہ دوسرے پیشوں سے	مبلغ ۴۴ رُپے سالانہ
میزان ——————	مبلغ ۴۵۰ رُپے سالانہ

اخراجات:-

کھانے پینے کا خرچ ——————	مبلغ ۲۲۵ رُپے سالانہ
کپڑے کا خرچ	مبلغ ۳۵ رُپے سالانہ
کاشت کاری کا خرچ	مبلغ ۶۵ رُپے ۲ آنے سالانہ
مال گزاری ٹیکس وغیرہ	مبلغ ۲۸ رُپے ۶ آنے سالانہ
متفرقات	مبلغ ۶۲ رُپے ۸ آنے سالانہ
میزان ——————	۴۲۰ رُپے سالانہ

اس طرح سال بھر کا خرچ پورا کرنے کے بعد کسان کی جیب میں صرف ۳۰ رُپے رہ جاتے ہیں۔ یہ تو کمیٹی کا اندازہ ہے لیکن ہماری رائے میں یہ اندازہ حالات کا بالکل حقیقی اور صحیح نقشہ نہیں پیش کرتا۔ اس لیے کہ اخراجات کی فہرست میں مندرجہ ذیل مدّوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے، حال آں کہ اِن مدوں پر کسانوں کو یا تو ایک ہی بار یا بار بار رقم خرچ کرنی پڑتی ہے:-

(۱) رہایش کا مکان۔ مکان بنوانے کا اور اس کی مرمّت کا خرچ

(۲) عورتوں کی آرائش اور سنگار جیسے تیل وغیرہ یا کپڑے دھونے کا خرچ۔

(۳) بچوں کی ابتدائی تعلیم کا خرچ۔

(۴) علاج معالجے خاص کر کونین وغیرہ کا خرچ۔

(۵) ایندھن کا خرچ۔

(۶) کشتی یا بیل گاڑی پر سفر کرنے کا خرچ، خاص کر عورتوں کے سلسلے میں۔

(۷) کسان اور اُس کے بچوں کی تفریح اور کھیل تماشے کا خرچ۔

ان مدوں پر کتنا خرچ آتا ہے اُس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلے میں اگر دس فی صدی کے اضافے کا اندازہ لگایا جائے تو کوئی زیادہ غلط نہیں ہوگا۔ کُل ملا کر کوئی ۱۷۴ روپے سالانہ کا خرچ بیٹھتا ہے۔ آمدنی کا تخمینہ ۱۵۹ روپے ہے تو اس طرح ۱۲ روپے کا خسارہ ہوتا ہے۔

لیکن تحقیقاتی کمیٹی نے جس طریقے سے یہ اندازہ لگایا ہے اُس میں ایک غلطی ہے اور وہ یہ ہے کہ ۵ ایکڑ فی خاندان کے اوسط کے حساب سے تخمینہ پیش کیا گیا ہے۔ حالاں کہ واقعی زمین کی تقسیم کیا ہے وہ میمن سنگھ کے بندوبست کی رپوٹ سے ظاہر ہوجاتا ہے:۔ صرف چار فی صدی ایسے لوگ ہیں جن کے پاس ۱۲ ایکڑ زمین ہے۔ ۳۶ فی صدی کے پاس ۵ ایکڑ اور ۶۰ فی صدی لوگوں کے پاس صرف دو ایکڑ زمین ہے۔

اگر تسلیم کر لیں کہ میمن سنگھ میں زمین کی جو تقسیم ہے وہی کم و بیش دوسرے اضلاع میں بھی ہوگی تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ زیادہ تر کسانوں کے پاس فی خاندان صرف دو ایکڑ زمین ہے اور اگر کسی خاندان میں ۵ افراد ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اتنی تھوڑی زمین کی تنہا پیداوار سے اپنے اخراجات نہیں پورے کر سکتا۔ بنگال کے محصولات آراضی کی کمیشن نے بتایا ہے کہ کاشت کاری کو مالی سہارا بنانے کے لیے کم سے کم ۵ ایکڑ زمین ہونی چاہیے اور اگر سال بھر میں صرف ایک ہی فصل بوئی جاتی ہے تو اور زیادہ زمین کی ضرورت ہوگی۔ چھے یا سات یا آٹھ ایکڑ۔

ایک اور بات ہے جس کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کسان کے پاس ۵ ایکڑ زمین ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ پانچوں ایکڑ ایک ہی جگہ ہے۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایکڑ گھر کے پاس ہے تو دو ایکڑ کہیں اور۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ زمین اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹتی جارہی ہے۔ کیا مجموعی رقبے کو اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ ہر کسان گھرانے کو جس میں پانچ افراد ہوں کم سے کم ۵ اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ایکڑ زمین مل جائے اور وہ بھی اس طرح کہ پوری زمین ایک ہی جگہ پر ہو۔

چوں کہ بنگال میں زیادہ تر کسان گھرانوں کے پاس اتنی تھوڑی زمین ہوتی ہے کہ وہ اپنے اخراجات نہیں پورے کر سکتے

اس لیے کاشت کاروں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے اور کھیت مزدوروں کی بڑھتی جا رہی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار کا موازنہ کیجیے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں کاشت کاروں کی تعداد ۹۰ لاکھ ۲۰ ہزار ۳۰۷ تھی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں اُن کی تعداد گھٹ کر ۶۲ لاکھ ۳۰ ہزار ۸۵ ہو گئی۔ ۲۸ لاکھ ۷۰ ہزار ۸۷ کی کمی واقع ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں کھیت مزدوروں کی تعداد ۱۷ لاکھ ۸۹ ہزار ۴۸۴ تھی سنہ ۱۹۳۱ء میں بڑھ کر ۲۸ لاکھ ۴۷ ہزار ۴۰۰ تک پہنچ گئی۔ دس لاکھ ۵۸ ہزار ۸۲۰ کا اضافہ ہوا۔ جن کاشت کاروں کے پاس کھیت نہیں رہے یا بہت قلیل رہ گئے وہ سب کے سب کھیت مزدور ہی نہیں بن گئے، بلکہ اُن میں سے بہتوں نے گھریلو نوکری اختیار کر لی، یا چھوٹی موٹی چیزوں کی دُکان کھول لی یا خوانچہ لگانا شروع کیا۔ اسی دوران میں ایسے لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا جو زمین خود کاشت نہیں کرتے بلکہ ٹھیکے پر لگا دیتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ایسے لوگوں کی تعداد ۴ لاکھ ۸۵ ہزار ۱۷۰ تھی، سنہ ۱۹۳۱ء میں ۷ لاکھ ۸۳ ہزار ۵۰۷ ہو گئی۔

بنگال کے محصولات آراضی کی کمیشن نے ۱۹ ہزار ۵۹۹ کسان خاندانوں کی معاشی اور مالی حالت کی تحقیقات کرنے کے بعد پتا لگایا کہ ان میں ۲۱ فی صدی ایسے ہیں جن کا ذریعۂ معاش یا تو برگ داری کے علاوہ اور کچھ نہیں یا زیادہ تر برگ داری ہی ہے۔ اسی کمیشن نے انتقالِ آراضی کی بھی تحقیقات کی اور اس کام کے لیے ۴۰،۷۰۴ ۸۵ ایکڑ زمین کا ایک علاقہ چُن لیا تحقیقات کے بعد پتا چلا کہ ۱۲ سال میں ۵ ہزار ۲۹۳ ایکڑ زمین چھوٹے کاشت کاروں کے قبضے سے نکل گئی۔

ان تمام باتوں سے پتا چلتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں کے ہاتھ سے زمین نکلتی جا رہی ہے، کاشت کاری پر بہت زیادہ بوجھ پڑ رہا ہے اور اتنی بڑی آبادی کا اُس پر گزارا نہیں ہو سکتا۔

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ موجودہ قیمتوں کے لحاظ سے ایک معمولی کاشت کار کی آمدنی اور خرچ کی کیا حالت ہے اور آیا زرعی اشیا کی قیمتوں کے بڑھنے یا پیداوار میں اضافے سے کسان کی حالت اتنی اچھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے اخراجات بہ آسانی پورے کر سکے۔ جاپانیوں کے اعلانِ جنگ کے بعد سے ہر چیز کی قیمت میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ کلکتہ میں قیمتوں کا انڈکس نمبر سنہ ۱۹۱۴ء میں ۱۰۰ تھا اور سنہ ۱۹۳۸ء میں ۹۵۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں یہ بڑھنا شروع ہوا۔ شروع میں ۱۰۸، اس کے بعد سنہ ۱۹۴۰ء میں ۱۲۰، سنہ ۱۹۴۲ء کے جنوری میں ۱۵۵ ہوا اور مارچ سنہ ۱۹۴۳ء میں ۲۷۲ تک پہنچ گیا۔ غرض کسی بھی چیز کی قیمت ۳ گنی سے کم نہیں بڑھی ہے۔ مختلف اشیا کی قیمتوں کے اضافے میں یکسانیت نہیں رہی ہے۔ حکومت ہند کے معاشی مشورے کار نے جو اعداد مرتب کیے ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ ستمبر سنہ ۱۹۴۳ء میں غذائی اشیا کی قیمت آٹھ گنی بڑھ گئی، لیکن کپڑے کی صرف پانچ گنی۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ قیمتوں کے بڑھنے سے زیادہ فائدہ کاشت کاروں کو ہوا ہے اور دوسری اشیا پیدا کرنے والوں کو کم۔ خاص طور پر اس لیے کہ کسان کے اور اخراجات میں جنگ کی وجہ سے اضافہ نہیں ہوا، جیسے مال گزاری ٹیکس، کمیشن اور شرح وغیرہ۔

اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب کسانوں کی حالت اچھی ہے اور وہ کاشت کاری کے حالات اور طریقوں کو بہتر بنانے کے لیے رقم بچا سکتے ہیں یا آیندہ کے لیے کچھ پسماندہ کر سکتے ہیں۔

یہ تو کتابی قسم کا اندازہ ہوا۔ لیکن حقیقت کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو کسانوں کی حالت دورانِ جنگ میں بجائے بہتر ہونے کے اور بدتر ہوگئی ہے۔ جیسا کہ اوپر ہم بتا چکے ہیں زیادہ تر کسان گھرانوں کے پاس دو یا تین ایکڑ زمین ہے اس لیے زرعی پیداوار کی قیمت کے بڑھ جانے سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ مان لیا جائے کہ زیادہ تر کسان ایسے ہیں جن کے پاس دو ایکڑ زمین ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ اس دو ایکڑ میں کتنی پیداوار ہوتی ہے۔ فی ایکڑ ۸ء۱۸ من دھان کے حساب سے سال بھر میں ۶ء۳۷ من دھان پیدا ہوا۔ لیکن غذا کا خرچ فی بالغ ۹ من سالانہ اگر رکھ لیجیے اور مان لیجیے کہ گھر میں ۳ بالغ آدمی ہیں تو ۲۷ من تو یوں خرچ ہوگئے اگر دو بچے ہیں تو ۴½ من فی بچّہ کے حساب سے ۹ من اور جوڑ لیجیے۔ کل ملا کر ۳۶ من ہوتے ہیں۔ باقی بچا ۶ء۱ من۔

اس طرح ایک اوسط خاندان کے پاس جس میں ۵ افراد ہیں اگر دو ایکڑ زمین ہے تو نجی استعمال سے جتنا غلّہ بچ رہتا ہے وہ بہت تھوڑا ہوتا ہے اور اُسی کو فروخت کرکے وہ ضرورت کی دوسری چیزیں خرید سکتا ہے۔ اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ بنگال کی بینک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی کے اعداد و شمار کے مطابق ۵ افراد کے خاندان کا مجموعی خرچ ۲۰ء۴ رُپے سالانہ ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں سنہ ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں قیمتیں دوگنی ہوگئیں، اس لحاظ سے اخراجات بھی دوگنے ہوگئے سوائے مال گزاری، سیس اور شرحوں کے جن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس طرح سنہ ۱۹۴۳ء میں اخراجات کُل ملا کر ۸۱۱ رُپے ۱۰ رہ جاتے ہیں۔ اس میں سے کھانے کا خرچ یعنی ۴۵۰ رُپے گھٹا دیجیے اس لیے کہ غذائی اشیا کسان خود پیدا کرتا ہے۔ اس طرح دوسرے اخراجات کے لیے ۳۶۱ رُپے ۱۰ بچ جاتے ہیں۔ یہ اخراجات صرف فاضل غلّہ بیچ کر ہی پورے کیے جا سکتے ہیں۔ فاضل غلّے کی مقدار صرف ۶ء۱ من ہے۔ اگر اس غلّے کو ۱۶ رُپے فی من کے حساب سے بیچا جائے جو سنہ ۱۹۴۳ء کی سب سے اونچی شرح ہے تو کوئی ۲۵ رُپے ہوتے ہیں۔ اگر زراعت سے ملحقہ ذرائع آمدنی کو لیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ جنگ کے زمانے میں وہ بھی دوگنے ہوگئے ہیں تو ۸۸ رُپے ہوتے ہیں۔ اس طرح دوسرے اخراجات کے لیے کسان گھرانے کے پاس کُل ملا کر ۱۱۳ رُپے رہ جاتے ہیں ۲۴۸ رُپے ۱۰ آنے کا خسارہ رہ جاتا ہے۔ اسی خسارے کو پورا کرنے کے لیے کسان اپنی زمین کسی بڑے کسان کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، یا ساہوکاروں، جنگی ٹھیکے داروں، زمیں داروں کے چنگل میں پھنس جاتا ہے، زمین اُس کے قبضے اور ملکیت سے نکل جاتی ہے اور بھک منگوں اور بے زمین کے مزدوروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔

قیمتوں کے بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے اور ضروریات سے مجبور ہو کر کسانوں نے فصل کے فوراً ہی بعد اپنا غلّہ بیچ دیا، اس کے بعد آہستہ آہستہ انھوں نے اپنی زمین بھی فروخت کردی یا زمین کو رہن رکھ کر قرضے لیے، آخر میں اُن کی بھی

حالت کھیت مزدوروں اور بھیک منگوں کی سی ہوئی۔ اس طرح ۱۹۴۳ء کے قحط میں بنگال کے چھوٹے کاشت کاروں کا تقریباً مکمل صفایا ہوگیا۔

سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ آیا بنگال میں زراعت کی مزید توسیع ہوسکتی ہے یا نہیں اور اگر ہوئی تو اس کا کاشت کار کی حالت پر کیا اثر پڑے گا۔ بنگال کے محصولات اراضی کی کمیشن نے اندازہ لگایا ہے کہ صوبے کا پورا رقبہ ۴۳ کروڑ ۰۷ لاکھ ایکڑ ہے جس میں قابل کاشت زمین کا رقبہ دو کروڑ ۰۸ لاکھ ایکڑ ہے اور ۳۰ لاکھ ایکڑ سے زیادہ ایسی زمین ہے جو قابل کاشت ہے لیکن اس میں کاشت نہیں ہوتی۔ اس طرح پوری زمین کا صرف ۱۰ فی صدی حصہ ایسا ہے جس میں کاشت کاری کی توسیع کی جاسکتی ہے۔

بعض اضلاع ایسے ہیں جہاں غلہ ضرورت سے کم پیدا ہوتا ہے پڑتی زمین بالکل نہیں ہے۔ جن اضلاع میں پڑتی زمین ہے وہاں کاشت کاری کے اخراجات اتنے زیادہ ہوں گے کہ موجودہ حالات کے تحت کسان برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ جس زیر کاشت زمین میں صرف ایک فصل اگائی جاتی ہے اس میں دو دو اور تین تین فصلیں اگائی جائیں۔ آج کل بنگال کی صرف ۲۰ فی صدی قابل کاشت زمین ایسی ہے جہاں دو فصلیں اگائی جاتی ہیں، بقیہ میں صرف ایک ہی فصل ہوتی ہے۔

کاشت کاری کی اس توسیع سے صوبے میں غذائی مسئلے کو ضرور حل کیا جاسکتا ہے لیکن کاشت کاروں کو کوئی خاص فائدہ پہنچنے کی امید نہیں ہے اور نہ ان کی آمدنی اور خرچ میں کوئی توازن پیدا ہوسکتا ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ جب قیمتوں کے گرنے کا عام رجحان پیدا ہوتا ہے تو زرعی اشیا کی قیمت مصنوعات کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے گرتی ہے۔ مصنوعات کی پیدائش میں ایک خاص نظم ہوتا ہے جیسے ہی قیمتوں کے گرنے کی صورت ہوئی، کارخانوں کے مالک مانگ کو گھٹتے دیکھ کر پیداوار بھی گھٹا سکتے ہیں اور اس طرح قیمتیں زیادہ تیزی سے نہیں گرسکتیں۔ لیکن کاشت کار اس طرح مانگ اور پیدائش میں توازن نہیں قائم کرسکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب قیمتیں گرنے لگتی ہیں تو سب سے زیادہ نقصان اسی کو پہنچتا ہے۔

بنگال میں ایک اور بات یہ ہے کہ قلت پیدائش کے زمانے میں بھی چاول اور دھان کی قیمت میں زیادہ اضافہ نہیں ہوتا اور زیادتی پیدائش کے باوجود قیمت زیادہ نہیں گرتی۔ ۱۹۳۵-۳۶ء میں صرف ۷۰ لاکھ ٹن چاول پیدا ہوا تھا۔ لیکن چاول کی قیمت صرف سوا تین روپے من تھی، اور ۱۹۳۶-۳۷ء میں ایک کروڑ ۵ لاکھ ٹن چاول پیدا ہوا تھا اور چاول کی قیمت ساڑھے تین روپے من تھی۔ غرض پیدائش کی زیادتی یا قلت کا قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس طرح کاشت کار کی آمدنی اور خرچ میں توازن کا فقدان بدستور موجود رہتا ہے۔

اگر زراعت کی مکمل اصلاح کی اسکیم بنائی جائے تو اس کے پیش نظر مندرجہ ذیل مقاصد ہونے چاہییں:۔

(۱) مجموعی پیداوار میں اضافہ کرنا۔

(۲) باری باری سے متعدد فصلیں اُگانا۔

(۳) غیر غذائی اشیا کی پیدائش میں اضافہ کرنا

(۴) زرعی اشیا کی خرید و فروخت میں اصلاح کرنا۔

کاشت کار کو اِس سے زیادہ دل چسپی نہیں ہوتی کہ کس قسم کی فصل اگائی جا رہی ہے اور کتنی پیداوار ہوتی ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ زیادہ قیمت پر فروخت ہو۔ اس لیے ہم مندرجہ بالا مقاصد سے الگ الگ بحث کریں گے اور کاشت کار کی آمدنی اور خرچ کی روشنی میں ان کا مطالعہ کریں گے۔

یہ تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ زرعی اشیا کی پیداوار میں زیادتی کا قیمتوں پر (خاص کر چاول کی قیمت پر) کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اگر پیداوار غیر معمولی طور پر زیادہ ہو تب اُس کا اثر پڑنا لازمی ہے۔ فرض کریجیے کہ چاول موجودہ مقدار سے دگنی پیدا ہونے لگے۔ ایسی حالت میں صوبے سے باہر بھیجنے کے لیے کافی چاول بچ رہے گا اِس سے قیمت گھٹ جائے گی پھر زراعت کی حالت کو درست کرنے کے لیے مصنوعی کھاد، بہتر آلات، مویشی، آب پاشی وغیرہ پر جب رُپے خرچ کیے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ خرچ معمولی نہیں ہوگا، تو اس کا قیمت پر یقیناً اثر پڑے گا۔

یہ اصلاحات جن سے کہ پیداوار بڑھ جائے گی صوبے کے لیے اور لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوں گی، اس لیے کہ لوگوں کی قوتِ خرید میں اضافہ ہوگا۔ آج کل تو یہ حال ہے کہ اشیا کی قیمت کتنی ہی کم ہو لیکن کسان اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خریدنے سے معذور رہتا ہے اس لیے کہ اس کی قوتِ خرید اتنی کم ہے کہ وہ کم سے کم دام کی چیزیں بھی نہیں خرید سکتا۔ اگر زیادتی پیدائش کے باعث زرعی اشیا کی قیمت کم رہی تو وہ زرعی اصلاحات کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔ چناں چہ اگر اس نے سرکاری پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر یا کاشت کاری کے طریقوں کے بہتر ہو جانے کے باعث جدید طرز پر کاشت کاری شروع بھی کی تو زیادہ عرصے تک جاری نہیں رکھ سکتا۔ ہاں ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ جو چیزیں پیدا کرے اُن کی مانگ میں اضافہ اور توسیع ہو۔ آیئے اب ہم مجوزہ اصلاحات کی روشنی میں کسان کی آمدنی اور خرچ کا جائزہ لیں۔

ایک کسان خاندان جو ۵ افراد پر مشتمل ہے ۳ ایکڑ کھیت جوتتا ہے، ۱۸ من فی ایکڑ کے حساب سے ۳ ایکڑ میں ۵۴ من پیدا ہوگا۔ لیکن زمین کی از سرِ نو تقسیم اور پڑتی زمین کے زیرِ کاشت آجانے کے بعد پیداوار دگنی بڑھ جائے گی اس لیے ۵۴×۲ = ۱۰۸ من رکھ لیا جائے۔ تین رُپے فی من کے حساب سے ۳۲۴ رُپے کی آمدنی ہوئی۔ خرچ کا اندازہ جو اوپر لگایا گیا ہے ۴۲۰ رُپے ہے۔ دیگر ذرائع سے بھی آمدنی کا تخمینہ دوگنا یعنی ۸۸ رُپے رکھ لیجیے اور کھاد وغیرہ کا خرچ ۴۷۰ رُپے۔ اس طرح تمام اصلاحات اور ترقیوں کے باوجود کسان کی آمدنی اور خرچ میں توازن نہیں پیدا ہوتا۔

زرعی پیداوار کی قیمت کے سلسلے میں ہمیں ایک اور چیز پر غور کرنا ہے۔ گزشتہ ۲۶۱ سال (۱۶۷۵ء تا ۱۹۳۶ء) میں دھان کی جو مختلف قیمتیں رہی ہیں اُن کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم نے پتا چلایا ہے کہ چاول کی فی من قیمت سب سے کم ۱۶۷۵ء میں تھی اور سب سے زیادہ ۱۹۲۹ء میں۔ (۴ روپے ۱۴ آنے من) چناں چہ یہ بہ آسانی کہا جاسکتا ہے کہ اس عرصے میں دھان کی قیمت سب سے زیادہ ۱۹۴۳-۴۴ء میں رہی ہے یعنی ۱۶ روپے من (یہ قیمت پورے بنگال میں نہیں بلکہ کچھ علاقوں میں تھی)۔ اس قیمت کو بے حد غیر معمولی قرار دینا چاہیے جس کا پیداوار کی کمی و بیشی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب موجودہ غیر معمولی حالات ختم ہو جائیں گے تو قیمت یقیناً بہت کم ہو جائے گی۔ برما، سیام اور ہندچین کا چاول بنگال اور دوسرے صوبوں میں بھر جائے گا اور قیمت کے کم ہو جانے سے کسان کے لیے آمدنی اور خرچ میں توازن قائم کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ۱۹۳۷ء میں یہ ممالک ۵۷ لاکھ ٹن چاول برآمد کر رہے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا غیر غذائی اشیا جیسے روئی، گنا اور تیل کے بیج کی پیداوار سے بنگال کے کسانوں کی کفالت ہو سکتی ہے؟ ان اشیا کی پیدائش اور اُن کے مفید ہونے کا انحصار صوبے کی صنعتی ترقی پر ہے۔ آب پاشی اور ذرائع رسل و رسائل کی بھی اس سلسلے میں کچھ کم اہمیت نہیں ہے۔ زیادہ قیمتی اشیا اور باری باری سے متعدد فصلوں کی پیدائش کا تعلق بھی سائنسی طرز کی کاشت کاری سے ہے۔

لیکن کاشت کاری کے نئے طریقوں کا خرچ اور زرعی اشیا کی خرید و فروخت کا بہتر انتظام ـــــ یہ دو چیزیں ہمارے سامنے بہت ہی مشکل مسئلہ پیش کرتی ہیں۔ صوبے کے اندر اشیا کی مانگ اسی وقت بڑھ سکتی ہے کہ کاشت کار کی قوتِ خرید میں اضافہ ہو جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پیداوار چاہے کتنی ہی کم ہو پھر بھی اُس کی قیمت میں اضافہ نہیں ہوتا اور صوبے سے غلّے کی برآمد برابر جاری رہتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال کی رعیت اتنی خوش حال نہیں ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق غذائی اشیا خرید سکے۔

بنگال کی چاول اور دھان کی تحقیقاتی کمیٹی نے بتایا ہے کہ صوبے سے باہر بنگال کی زرعی پیداوار کی مانگ گھٹتی جا رہی ہے اور آیندہ اور کم ہو جائے گی۔ اس لیے مسئلے کا اصلی حل یہ ہے کہ خود صوبے کے اندر مانگ بڑھائی جائے اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے کہ بہت سے کسانوں کو دوسرے مفید پیشوں میں لگا دیا جائے اور اس طرح ان کی قوتِ خرید میں اضافہ کیا جائے۔

لارڈ کینز

از :——— م۔ د

[لارڈ کینز، مشہور و معروف برطانوی معاشی مفکر کو رحلت کیے آج ایک سال ہوگیا۔ معاشیاتی نظریات کی تاریخ میں لارڈ کینز سنگ میل ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزاد کاروبار کے فرسودہ نظریے کا مخالف ہونے کے باوجود وہ سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی مفروضوں سے باہر نہیں جاسکا۔ وہ "ریاستی نگرانی" کو سرمایہ داری کی خرابیوں کا علاج اور نسخہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ زیرِ نظر سطور میں فاضل مقالہ نگار نے نہایت وضاحت کے ساتھ لارڈ کینز کی اہمیت اور اس کے معاشیاتی افکار کی نوعیت بیان کی ہے۔]

لارڈ کینز نے ۲۱ر اپریل سنہ ۱۹۴۶ء کو ۶۲ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ اس کے مرنے پر اخبار "ٹائمز" نے اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ دنیا ایک عظیم ترین ہستی سے خالی ہوگئی، اور یہ سچ ہے کہ عصرِ حاضر میں بہت کم ایسی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جو لارڈ کینز کی طرح جامع صفات کی مالک ہوں یا جن کی دلچسپیاں اور کارنامے اتنے وسیع ہوں جتنے لارڈ کینز کے تھے، وہ بڑی آزاد طبیعت کا آدمی تھا، اُس کے خیالات پر انیسویں صدی کے انگریزی بورژوائی سماج کی گہری چھاپ تھی بلکہ یہ کہنا چاہیے وہ اسی سماج کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ اپنے خیالات انیسویں صدی کی دُنیا میں پیش کرتا تو برِاعظم یورپ کے بعض علمی حلقوں میں وہ بڑا "نظریہ پرست" سمجھا جاتا۔ اُسے نظریات سے لگاؤ تھا بھی۔ اس کا خیال تھا کہ نظریوں کا لوگوں کے ذہن اور عمل پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ دراصل یہ چیز اُسے اٹھارہویں صدی کی "عقلیت پسندی" کی روایات سے ورثے میں

بلی تھی۔ لیکن باوجود اس قدر نظر پسندی کے یہ بتانا بہت مشکل ہو کہ وہ معاشی نظریات کے عالم کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا یا عملی آدمی کی حیثیت سے، اس لیے کہ وہ امورِ عامّہ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد دُنیا میں امن کا انتظام قائم کرنے کے لیے جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اُس میں وہ برطانوی محکمۂ مالیات کے نمایندۂ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا۔ وہاں معاہدۂ ورسائی کے اُس حصّے سے اُس کو اختلاف پیدا ہوا جس کا تعلق تاوانِ جنگ سے تھا، چناں چہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گیا۔ بعد میں اُس نے "امنِ عالم کے معاشی نتائج" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اُس نے دلائل و براہین کے ساتھ اپنے اختلاف کے اسباب بیان کیے۔ اس واقعے نے خاص کر اس کی تصنیف نے اُسے بہت مشہور کر دیا۔ یہ کتاب غیر متوقع طور پر مقبول اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئی، اس کا اثر کافی وسیع ثابت ہوا، یہاں تک کہ انگلستان کی پوری لیبر تحریک اس سے متاثر ہوئی۔ لیبر پارٹی کے محکمۂ تحقیق و تفتیش نے مزدور تحریک میں کام کرنے والوں کے لیے اس کا ایک سستا اڈیشن بھی شائع کیا . . . . اس کتاب میں ویسے اور باتیں تو ہیں ہی، لیکن ایک چیز جس کی وجہ سے یہ اتنی مقبول ہوئی، یہ ہو کہ کانفرنس میں شریک ہونے والی بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں کی بہترین اور واضح قلمی تصویر کھینچی گئی ہو۔ ان خاکوں میں حیرت انگیز ہوشیاری اور حاضر دماغی سے کام لیا گیا ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہو جیسے لارڈ کینز کو صورتِ حالات اور لوگوں کے دماغ کو سمجھنے میں فطری درک حاصل تھا۔ یہ صفت لائڈ جارج میں بھی پائی جاتی تھی جس کی خود لارڈ کینز نے کئی بار تعریف کی تھی حال آں کہ وہ خود بھی اس سے محروم نہیں تھا۔

پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصے میں اُس نے نظریۂ زر پر دو ایسی کتابیں لکھیں جو اس کی تمام تصانیف میں اہم ترین شمار کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے ۱۹۲۳ء کی اصلاحاتِ زر پر بھی ایک کتاب تصنیف کی لیکن وہ اتنی اعلا اور جامع نہیں ہو جتنی پہلی دو کتابیں۔ ۱۹۳۱ء میں مالیات اور صنعت سے متعلق جو میکمیلن کمیٹی بٹھائی گئی تھی اُس کی رپوٹ مرتب کرنے میں لارڈ کینز کا زبردست ہاتھ تھا۔ اس کی پہلی تصنیف کا نام ہو "رسالۂ زر" Treatise on Money جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ اس کے ارتقائے فکر کے ایک عارضی اور گزراں دور کو ظاہر کرتی ہو۔ دوسری تصنیف جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہو کر کافی مشہور ہوئی، اس کا نام تھا "زر، سود اور روزگار کا عام نظریہ" General Theory of Employment Interest and Money اس کتاب پر تمام علمی حلقوں میں گرما گرم بحث ہوئی۔ کتاب کا سرکاری پالیسی پر بھی بہت گہرا اثر پڑا۔ زمانۂ حال میں نظری معاشیات کی کسی بھی کتاب نے سرکاری پالیسی کو اس قدر متاثر نہیں کیا ہو، جتنا کہ اس نے۔ اس تصنیف نے انگلستان اور امریکہ میں ایک نئے مکتبِ خیال کی بنا ڈالی۔ امریکہ میں تو اس کے متعلق کہا جاتا ہو کہ اس نے معاشی افکار میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہو۔ لارڈ کینز

نے یہ کتاب سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء کے عالمگیر معاشی بحران کے تجربات سے متاثر ہوکر لکھی تھی۔ امریکہ میں معاشی بحران کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے صدر روزویلٹ نے جو نئی معاشی پالیسی اختیار کی اُس کے حامیوں کو اس کتاب میں بہت سا مواد مل گیا اور انھوں نے اسی پر اپنی دلائل کی بنیاد رکھی۔ آج دُنیا میں بے کاری کو دُور کرنے اور مکمل روزگار کے حالات پیدا کرنے کے لیے جو مختلف تجویزیں پیش کی جارہی ہیں اور جن پالیسیوں کی حمایت کی جارہی ہے اُن پر بھی اس کا گہرا اثر ہے۔ امریکہ کا "قانونِ روزگار" اور برطانیہ کا "قرطاس ابیض" (سنہ ۱۹۴۴ء) لارڈ کینز ہی کے خیالات پر مبنی ہے۔ سر ولیم بیورج اور پروفیسر ایلون ہینسن نے اپنی تجاویز لارڈ کینز ہی کے نظریوں سے متاثر ہوکر تیار کی تھیں۔

گزشتہ جنگ کی ابتدا میں اُسے "بینک آف انگلینڈ" کا ڈائرکٹر بنادیا گیا جس کی پالیسی پر اُس نے پہلے سخت اعتراضات کیے تھے۔ اُس کے بعد وہ محکمۂ مالیات میں چلا آیا۔ جنگ کے زمانے میں جو ٹیکس لگائے گئے اور قرضے لیے گئے اُن سب کے طے کرنے میں اور بازارِ زر سے متعلق سرکاری پالیسی کے متعین کرنے میں اُس کا زبردست ہاتھ تھا۔ بین اقوامی مالی فنڈ کے قیام کے لیے بریٹن ووڈز میں جو اسکیم تیار ہوئی تھی اس کے مرتب کرنے میں برطانیہ کی طرف سے لارڈ کینز ہی نے سارا کام کیا تھا۔

اُس نے واشنگٹن میں برطانوی نمایندے کی حیثیت سے قرضے کی بات چیت میں حصہ لیا۔ یہ اس کا آخری کارنامہ تھا جس میں اُسے اتنی محنت کرنی پڑی کہ صحت خراب ہوگئی اور آخر وہ مرگیا۔ ہاؤس آف لارڈز میں اُس نے جو آخری تقریر کی وہ برطانیہ اور امریکہ کے قرضہ معاہدہ کی حمایت میں تھی۔

لارڈ کینز صرف ایک ماہرِ معاشیات یا عملی انسان ہی کی حیثیت سے یاد نہیں کیا جائے گا، بلکہ ایک زبردست نثار کی حیثیت سے بھی اس کا شمار صفِ اوّل میں ہے۔ اس کی نثر ادبیات کے وسیع و عریض علم سے بھرپور ہے۔ اس کی یہ قابلیت اپنی اعلیٰ ترین شکل میں اس کی تصنیف "سوانح عمری پر مضامین" Essays in Biography میں ظاہر ہوتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کا بھی وہ بہت بڑا حامی اور سرپرست تھا، اس کا خیال تھا کہ آرٹ کا عوام سے تعلق ہونا چاہیے۔ کیمبرج آرٹس تھیٹر کی بنا اُسی نے ڈالی تھی جسے اُس نے بعد میں میونسپلٹی کے حوالے کردیا۔ سی۔ای۔ام۔اے کے صدر اور سیڈلر ویلز کے ڈائرکٹر ہونے کی حیثیت سے اُس نے ان اداروں کو ایک عوامی طاقت بنانے میں زبردست ہاتھ بٹایا، آج یہ ادارے مُلک کی تہذیبی زندگی میں زبردست اہمیت رکھتے ہیں۔ نوجوانوں کی ہمت افزائی اور تعلیم و تربیت کرنے میں بہت کم لوگ اس کی ہمسری کا دعوا کرسکتے ہیں۔ طالب علموں کے ساتھ اس کا انداز اور برتاؤ ایسا ہوتا تھا کہ اس سے اُن کو فائدہ پہنچنا لازمی تھا۔ بہت سے لوگ جو اُستاد کی حیثیت سے اُس کے مداح نہیں تھے اُس کے طرزِ گفتگو اور اندازِ مباحثہ سے مسحور تھے۔ اُس کے ہمعصروں پر جو اس کا اتنا اثر تھا اُس کا راز بھی بہت حد تک یہی تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جن سے اس کی تربیت یافتہ اور آزاد طبیعت کو نفرت تھی۔ اُس نے بڑی قابلیت اور عمیق خیالی کو راہ دیتے ہوئے انیسویں صدی کے آزاد معاشی کاروبار کی روایات کا پول کھولا اور ان کا غلط ہونا ثابت کیا۔ اُس نے واضح کر دیا کہ آزاد کاروبار کے متعلق یہ جو ڈھول پیٹا جا رہا ہے کہ اس کے اندر ایک فطری ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ سب محض غلط اور بے بنیاد ہے۔ لارڈ کینز ریاستی سرمایہ داری کے نظریے کا پیمبر ہے۔ اگرچہ سماج کے مختلف قسم کے طبقاتی رشتوں اور تعلقات کے مطابق اس کے معنی مختلف ہوسکتے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ لارڈ کینز کی مخصوص لبرل رسم کے ساتھ چند بہت ہی اہم کنزرویٹو Conservative خصوصیات بھی وابستہ تھیں۔ لیکن وہ عام اور غریب انسان کا بھلا ضرور چاہتا تھا اور اُن کے مفاد کو آگے بڑھانے کا حامی تھا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ماسکو اور لینن گراد کی سیر کرنے کے بعد اس نے سوویت نظام کی چند الفاظ میں تعریف بھی کی تھی، (اور وہ بھی ایسے وقت میں جب سوویت یونین کی تعریف کرنا ابھی فیشن میں داخل نہیں ہوا تھا) لیکن یہ تعریف سوویت یونین کے معاشی نظام کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہیں کی گئی تھی بلکہ اسے ایک "نیا مذہب" قرار دیا گیا تھا اور پھر اس کے اس "نئے مذہب" کو سراہا گیا تھا۔ وہ حکومت پر مزدور طبقے کے اقتدار سے بھی اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اقتدار سے۔ اُس کے اندر سرمایہ داری کے کچھ پہلوؤں سے جو اتنی نفرت پائی جاتی تھی وہ زیادہ تر اُسی قسم کی تھی جو کسی پڑھے لکھے اور امیر طبقے کے شخص میں پائی جاتی ہے۔ اپنی تصنیف "آزاد کاروبار کا خاتمہ" میں وہ لکھتا ہے:۔

> "میرا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو اگر عقل مندی اور ہوشیاری سے چلایا جائے تو معاشی مقاصد کو حاصل کرنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا، لیکن سرمایہ داری کا موجودہ نظام کئی پہلوؤں سے انتہائی قابلِ اعتراض چیز ہے۔"

اپنے مندرجہ بالا دعوے کے ثبوت میں اُس نے تشریح کر کے یہ بتایا کہ آزاد کاروبار کی "معاشی ہم آہنگی" کا روایتی نظریہ بالکل ہوائی بات ہے، اُس نے بتایا کہ سرمایہ داری کا عام اور فطری رجحان یہ ہے کہ فالتو پیداوار ہوتی ہے اور بے روزگاری پھیلتی ہے۔ سرمایہ داری کے عروج کے ساتھ یہ مرض خطرناک سے خطرناک ہوتا گیا ہے۔ اُسے بینک کاری اور زر سے متعلق پالیسی میں ردّ و بدل کر کے نہیں مٹایا جاسکتا۔ (اگرچہ وہ شروع شروع میں اس پر اعتقاد رکھتا تھا)۔ اگر اس رجحان کو بدلا جاسکتا ہے تو صرف اس طرح کہ معاشی امور میں ریاست اور حکومت کا مکمل دخل ہو۔ لیکن وہ ریاستی اشتراکیت کا مخالف تھا۔ اُس کے خیال میں ریاستی اشتراکیت اُسی فلسفے کی ایک شکل ہے جو انیسویں صدی کی انفرادیت اور آزاد کاروبار کے تحت کام کر رہا تھا۔ انسانی عقل اور سمجھ بوجھ پر اس کو بڑا بھروسہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سمجھ بوجھ کے ساتھ اگر خیالات پھیلائے جائیں تو کسی نہ

کسی قسم کی "پابند سرمایہ داری" Controlled capitalism وجود میں آجائے گی جو اشتراکیت کا بدل ثابت ہوگی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے اس نے اس عجیب وغریب نظریے کی بھی اشاعت شروع کی کہ بڑے بڑے کاروبار میں سماجی ملکیت بن جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اپنی تصنیف "۔ ۔ ۔ ۔ عام نظریہ" کے آخری جملوں میں وہ اپنے اس خیال کو دوبارہ زور دے کر بیان کرتا ہے کہ نئے خیالات اور نظریوں کی بتدریج بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے سرمایہ داروں کی طاقت نہیں چل سکتی اور یہ کہنا مناسب ہے کہ آگے چل کر سرمایہ دارانہ مفاد نہیں بلکہ نئے نظریے اور خیالات زیادہ خطرناک ہوجائیں گے چاہے اس کا نتیجہ اچھا ہو یا بُرا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں اُس نے جو معاشی نظریے پیش کیے تھے اُن پر اس چھوٹے سے مضمون میں بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے اُن نظریوں کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے پُرانے اور فرسودہ معاشی نظریوں کی بنیادیں ڈھادیں۔ جن لوگوں کا ذہن معاشی نظریوں کی کتابی روایات میں پلا اور بڑھا تھا اُن کو لارڈ کینیز کے نئے نظریوں نے چونکادیا۔ بہت سے ایسے مفروضے جن پر روایاتی نظریوں کی بنیاد قائم تھی اُن کی تفصیلی تشریح کرنے کے بعد لارڈ کینیز نے اُن کے تضاد کو نمایاں کیا۔ اور معاشیین کو اُن کے اثر سے نجات دلائی د سودہ خیالی کی بنیاد جڑ سے کھوکھلی ہوگئی جس کے نتائج بہت ہی دور رس ثابت ہوئے۔ مارکسیوں کو لارڈ کینیز کے یہ تمام نظریے کچھ ایسے معلوم ہوئے جیسے ایک کھُلی اور عام بات کو ضرورت سے زیادہ اہتمام کے ساتھ پیش کیا جارہا ہو، اس لیے کہ اُن کا تو ہمیشہ سے خیال تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں بے روزگاروں کا وجود ہمیشہ رہا ہے اور مانگوں کی کمی سرمایہ دارانہ نظام پیدائش میں ہمیشہ روڑے اٹکاتی رہی ہے۔ بہرحال لارڈ کینیز نے جس اندھا دھند طریقے سے اس خیال کو پیش کیا اور اس کے جو نتائج برآمد ہوئے اُن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

لارڈ کینیز نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اُس نے کوئی نئی چیز نہیں پیش کی ہے بلکہ ایک ایسے نظریے کو نمود اور واضح کردیا ہے جو پہلے سے دبی ہوئی شکل میں موجود تھا لیکن وہ مارکسیوں کے ساتھ دور تک نہیں جاتا۔ ویسے تو وہ بڑی رواداری طبیعت رکھتا تھا لیکن پھر بھی مارکس کی تصانیف سے اُس نے ہمیشہ غیر دلچسپی کا اظہار کیا۔ اُس کی کتاب "عام نظریے" میں کچھ خیالات اور مضمرات ایسے ضرور موجود ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام پر بہت ہی انقلابی قسم کے اعتراضات کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ اس کے انقلابی قسم کے شاگردوں نے اس کی تحریر کے اُن حصوں کو بڑی اہمیت دی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُس کتاب میں ایسے مضمرات بھی ہیں جو نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً اُس نے لکھا ہے کہ اگر حکومت صحیح مالیاتی پالیسی اختیار کرے اور سرمایہ کاری پر تھوڑا سا کنٹرول رکھے تو سرمایہ دارانہ نظام اس جدید شکل میں کامیابی اور ہم آہنگی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس سے عوام کا مفاد پورا ہوسکتا ہے۔

جہاں تک خود لارڈ کینیز کا تعلق ہے اس نے اپنے موخرالذکر خیالات پر زیادہ زور دیا ہے اور اپنے اول الذکر خیالات کو جنھیں

اُس کے بعض زیادہ انقلاب پسند دستوں نے اہمیت دینے کی کوشش کی ہے کچھ یونہی سمجھ کر ٹال دیا ہے۔ جیسے اُس نے اس نظریے کو تو بہت زور دار انداز میں پیش کیا ہے کہ شرح سود کا انحصار زر سے متعلق پالیسی پر اور سرمایہ کاری کی فراوانی پر ہوتا ہے، اور اپنے اس خیال کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی ہے کہ عوام کی قوتِ صرف بڑھانے کے لیے موثر کارروائیاں کرنے کی ضرورت ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں قوتِ خرید قوتِ پیدائش کے ساتھ نہیں بڑھتی۔

زر اور تجارتِ خارجہ

زر اور تجارت خارجہ

از: ——— رمیش نرائن ماتھر

ہم اپنی ضرورتیں دوسرے ملکوں کی مدد کے بغیر پوری نہیں کر سکتے۔ کوئی بھی ملک اکیلا اپنے رہنے والوں کی سب ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔ اس کو کچھ چیزیں ضرور غیر ملکوں سے منگانی پڑتی ہیں۔ امریکہ جیسے مال دار ملک کو بھی باہر سے قہوہ، چائے اور مشین کا بنا ہوا کپڑا وغیرہ منگانا پڑتا ہے۔

انگلستان امریکہ سے بہت کافی مقدار میں غلہ، روئی و گوشت کی بنی ہوئی چیزیں منگواتا ہے۔ اگر یک ملک دوسرے ملک سے چیزیں نہ مول لے تو اس ملک کی ضرورتیں پوری نہ ہوسکیں یہ لین دین کا سلسلہ بہت دنوں سے جاری ہے اور سائنس کی بہ دولت آمد و رفت کی جو سہولت ہوگئی ہے اس کی وجہ سے باہر سے سامان منگانے میں جو بہت سی دقتیں تھیں وہ دور ہوگئی ہیں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک سے منگائے ہوئے سامان کی قیمت کس طرح ادا کرتا ہے۔ یہ ہم کو معلوم ہے کہ دنیا میں طرح طرح کے سکے چلتے ہیں۔ ایک ملک کا سکہ دوسرے ملک میں نہیں چلتا۔ کسی ملک میں سونے کا سکہ چلتا ہے تو دوسرے میں چاندی کا اور کسی میں صرف کاغذی نوٹ چلتے ہیں۔ کوئی ایک سکہ نہیں ہے جسے تمام ممالک تسلیم کرلیں۔ اس حالت میں غیر ملک سے کس طرح لین دین ہوتا ہے اور ایک ملک کے سکے کی قیمت دوسرے ملک کے سکے کی قیمت کے بدلے میں کس طرح سے مقرر ہوتی ہے؟

اگر ہم کو لین دین چکانے کے لیے روپیہ باہر بھیجنا پڑے تو بڑی مشکل ہوگی کیوں کہ پہلے تو روپیہ بھیجنے کا کام ہی کافی دقت

کا ہی، اور دوسری مشکل اس کے حل کرنے میں یہ ہوگی کہ کس حساب سے ایک ملک کے سکّے کی قیمت دوسرے ملک کے سکّے کے بدلے میں مقرر کی جائے۔ یہ ہو سکتا ہی کہ ہر ملک اپنے سکّے کی قیمت دوسرے ملک کے سکّے سے زیادہ بتائے اور دوسرا اس بات کو نہ مانے۔ ان جھگڑوں کو دور کرنے کے لیے دنیا کے ممالک اپنا لین دین ہنڈیوں (Bills of Exchange) کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ اُدھار دینے کا رقعہ ہوتا ہی جس سے ایک سے زیادہ ممالک آپس کا قرضہ چکاتے ہیں۔ اس میں ایک آدمی دوسرے آدمی کو یہ تحریری حکم دیتا ہی کہ وہ مانگنے پر یا ایک خاص مدت کے گزر جانے کے بعد ایک خاص آدمی کو یا اس کے حکم پر یا کسی حاملِ رقعہ کو ایک خاص لکھی ہوئی رقم دے دے۔ دوسرا آدمی جس کے نام وہ خط ہوتا ہی اس ہنڈی پر دو لکیریں ایک دوسرے کے اوپر برابر کھینچ دیتا ہی اور اُن لکیروں کے اندر اپنی منظوری لکھ کر اپنے دستخط کر دیتا ہی۔ اور پھر اس کو ہنڈی لکھنے والے کے پاس بھیج دیتا ہی۔ ہنڈی کا لکھنے والا یا تو اس وقت تک رُپے کی وصولی کا انتظار کرتا ہی یا اگر اس کو رُپے کی سخت ضرورت ہی تو وہ اس ہنڈی کو کسی دلال کے ہاتھ بیچ دیتا ہی جو اس لکھے ہوئے رُپے میں سے ملنے کے وقت تک کا سود کاٹ کر رُپیہ دے دیتا ہی۔ دلال پورا رُپیہ تحریری مدت کے گزر جانے کے بعد دوسرے آدمی سے وصول کر لیتا ہی۔

اب ہم آپ کو مثال دے کر سمجھاتے ہیں کہ کس طرح ہنڈی کے ذریعے ایک ملک دوسرے ملک سے لین دین چکاتا ہی۔ فرض کیجئے الف دہلی کا سوداگر دوسرے سوداگر ب سے جو لندن میں ہی دوائیں منگاتا ہی اور ایک تیسرا سوداگر ج جو لندن میں ہی اُسی قیمت کا سُن کا سامان ایک اور سوداگر د سے خریدتا ہی جو دہلی میں ہی۔ یہ ظاہر ہی کہ لندن کا سوداگر ب الف سے اپنے سامان کی قیمت ہندستانی رُپے کی شکل میں نہیں منظور کرے گا۔ نہ دہلی کا سوداگر د اپنے سامان کی قیمت انگریزی سکّہ اسٹرلنگ میں لینا منظور کرے گا۔ اس لیے الف اور ج دونوں کو سونا خرید کر اور بیمہ کرا کر اس قدر دور بھیجنے کے اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے ان تمام دقتوں سے بچنے کے لیے انگریزی سوداگر ب، الف کے نام اپنے سامان کی قیمت کی ہنڈی لکھ دیتا ہی جس کو الف منظور کر لیتا ہی۔ اب ب کو یہ قانونی حق ہو گیا کہ وہ الف سے رُپیہ وصول کر لے اور وہ یہ حق انگریزی سوداگر ج کو جسے ہندستان میں د کے پاس رُپیہ بھیجنا ہی بیچ دیتا ہی۔ ج سوداگر اس بل کو خریدنے کے بعد دہلی کے سوداگر د کے پاس بھیج دیتا ہی۔ د بنک کے ذریعے الف سے رُپیہ وصول کر سکتا ہی۔ اس طرح بغیر رُپیہ باہر بھیجے ہوئے ایک ہی بل سے لین دین چُک جاتا ہی۔

ہر ملک میں باہر سے مال منگانے والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اور باہر مال بھیجنے والے بھی۔ باہر مال بھیجنے والے اپنے کارخانے داروں کے نام (جو دوسرے ملکوں میں ہوتے ہیں) ہنڈیاں لکھ دیتے ہیں اور انھیں منظور کروا لیتے ہیں۔ انھی ہنڈیوں کو وہ اپنے ملک کے اُن سوداگروں کو جنھوں نے باہر سے مال منگایا ہی اور جن کو باہر رُپیہ بھیجنا ہی بیچ دیتے ہیں۔ یہ سوداگر ہنڈیوں کو خرید کر باہر کے ملکوں کے سوداگروں کو بھیج دیتے ہیں جن سے انھوں نے مال مول لیا ہی۔ غیر ملک کے سوداگر

ہنڈیاں پاکر اپنے ملک کے قرض دار سوداگروں سے (جن کے نام شروع میں ہنڈیاں لکھی گئی تھیں اور جن کو انھوں نے منظور کرلیا تھا) رُپیہ وصول کرلیتے ہیں۔ یہ مثال پیش کرتے ہوئے ہم نے یہ فرض کرلیا تھا کہ مال منگانے والے اور مال بھیجنے والے دونوں ایک ہی رقم کا مال منگاتے ہیں۔ لیکن تجربے سے دیکھا گیا ہو کہ ایسا بہت کم ہوتا ہو۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہو کہ باہر سے مال زیادہ قیمت کا منگایا جاتا ہو اور باہر کم قیمت کا مال بھیجا جاتا ہو۔ مال منگانے والوں کو ہنڈیوں کی ضرورت پڑتی ہو تاکہ انھیں خرید کر وہ اپنا قرضہ چکائیں۔ اس لیے مال منگانے والے، بنکوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے جتنا رُپیہ انھیں باہر بھیجنا ہو اسی قیمت کا بنک ڈرافٹ خرید لیتے ہیں۔ ان ڈرافٹوں میں ایک بنک دوسرے بنک کے نام رقعہ لکھ دیتا ہو کہ وہ لکھا ہوا رُپیہ کسی خاص آدمی یا فرم کو دے دے۔ یہ ڈرافٹ مال منگانے والے دوسرے ملک کے اُن سوداگروں کے پاس جن سے انھوں نے مال منگایا ہو بھیج دیتے ہیں۔ ڈرافٹ کو پاکر دوسرے ملک کے سوداگر اس بنک سے جس کے نام ڈرافٹ لکھا ہوا ہو رُپیہ وصول کرلیتے ہیں۔

اب ہم آپ کو یہ بتاتے ہیں کہ ایک ملک کے سکّے کی قیمت دوسرے ملکوں کے سکّے کے بدلے میں کس حساب سے مقرر ہوتی ہو۔ ہر ملک کا سکّہ مختلف ہوتا ہو۔ کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں کا سکّہ سونے کا ہوتا ہو۔ جیسے انگلستان کا سکّہ سنہ ۱۹۳۱ء تک سونے کا رہا۔ امریکہ کا سکّہ ڈالر سونے کا ہو۔ اس حالت میں ایک سکّے کی قیمت بہ مقابلہ دوسرے سکّے کے جتنا سونا ان سکّوں میں ہوتا ہو اُسی کے حساب سے مقرر ہوتی ہو۔ انگریزی پاؤنڈ اسٹرلنگ کی قیمت اس حساب سے قریب ۸۶ر۴ ڈالر کے برابر ہوئی کیوں کہ جس سکّے میں اتنا ہی گنا سونا ہو۔ اسی طرح ایک پاؤنڈ اسٹرلنگ کے بدلے میں ۴۰ر۲۰ مارک کی ضرورت پڑے گی۔ مارک جرمنی کا طلائی سکّہ ہو۔ ایک سکّے کی قیمت دوسرے سکّے کے بدلے میں جو ہوتی ہو اسے شرح تبادلہ کہتے ہیں۔ یہ شرح تبادلہ بدلتی رہتی ہو اور جس طرح بازار میں چیزوں کی قیمت بدلتی رہتی ہو اسی طرح سکّے کا بھاؤ بھی بدلتا رہتا ہو۔

سونا باہر بھیجنے میں کافی دقت ہوتی ہو۔ اس کو بہت ہوشیاری سے بیمہ کراکر بھیجنا پڑتا ہو۔ اس لیے باہر کے ملکوں سے مال منگانے والے اپنے ملک کے سکّوں سے بنک ڈرافٹ خرید کر اپنا قرضہ چکاتے ہیں اگر باہر سے منگائے ہوئے مال کی قیمت باہر بھیجے ہوئے مال کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ باہر سے مال منگانے والوں کو قرضہ چکانے کے لیے بنک ڈرافٹوں کی زیادہ ضرورت پڑے گی۔ چوں کہ بنک ڈرافٹوں کی مانگ زیادہ ہو اس لیے ان کی قیمت بڑھ جائے گی یعنی دوسرے ملک کے سکّوں کی قیمت گھر کے سکّے کے مقابلے میں زیادہ ہوجائے گی۔

فرض کیجیے کہ امریکہ کے سوداگر نے انگلستان سے ۔۔۔۔۔ ڈالر کا مال خریدا ہو تو اسے اتنی قیمت کا سونا انگلستان بھیجنا پڑے گا اور سونا بھیجنے کا خرچہ بھی اُٹھانا پڑے گا۔

بنک ڈرافٹ کی قیمت سکّے کی قیمت اور بھیجنے کا خرچہ ملاکر جو خرچہ ہوتا ہو اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اگر اس سے زیادہ

اس کی قیمت بڑھی تو مال منگانے والے سونا بھیج کر اپنا قرضہ چکائیں گے۔ اسی طرح اگر امریکہ میں باہر مال بھیجنے والے زیادہ ہیں اور مال منگانے والے کم، تو ہنڈیوں کی مانگ کم ہوگی اور ان کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اس لیے ان کی قیمت گر جائے گی مال منگانے والے اپنی ہنڈیاں امریکہ کے بنک میں بیچیں گے تو بنک والے سکے کی قیمت میں سے بھیجنے کا خرچہ نکال لیں گے۔ اس سے قیمت گر نہیں سکتی۔ کیوں کہ پھر سونا منگانے میں زیادہ کفایت ہوگی اس طرح سکے کا بھاؤ سونے کے بھیجنے کے خرچے کے آس پاس ہی بڑھتا گھٹتا رہے گا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد بہت سے ملکوں نے سونے کا سکہ رکھنا ترک کر دیا اور سونے کا لین دین بند ہو گیا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں انگلستان نے بھی سونے کا سکہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد دنیا کے ملکوں کے سکوں کی قیمت بہت گھٹتی اور بڑھتی رہی جس سے تجارت کو نقصان ہوا۔ بعض ملکوں نے اپنے سکوں کی شرح یکساں رکھنے کے لیے متعدد طریقے اختیار کیے۔ ہمارے ہندستانی سکے رُپے کی قیمت بہ دستور ایک شلنگ ۶ پنس رکھی گئی ہے۔ جب ہندستان ولایت کو مال زیادہ بھیج دیتا ہے اور وہاں سے کم خریدتا ہے تو وزیرِ ہند رُپے کی شرح کو بڑھنے سے روکنے کے لیے جو اسٹرلنگ گورنمنٹ آف انڈیا کے نام ہوتے ہیں اُسے انگریزی سوداگروں کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اُس کو خرید کر انگریزی سوداگر اپنا قرضہ چکا دیتے ہیں۔ اسی طرح جب رُپے کی شرح گھٹنے لگتی ہے تو حکومت اسٹرلنگ بل خریدتی ہے۔ اس طرح رُپے کے سکے کی قیمت ایک سی رہتی ہے۔

(بہ اجازت اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی)

———>•※(•※•)※•<———

معاشی صورت حال

۱۔ ازبکستان
۲۔ تاجکستان
۳۔ کرغیزیہ ، قزاخستان
۴۔ ربڑ بورڈ
۵۔ نکل کاربیہ
۶۔ قانون ریزرو بینک میں ترمیم

مرکزی ایشیا کی مسلم ریاستوں کی معاشی ترقی

از : ——— ادارہ

ازبکستان ازبکستان روئی کی پیداوار کے لحاظ سے سوویت یونین کا سب سے اہم علاقہ ہے ۔ اس وقت ۱۵ لاکھ ٹن روئی کی سالانہ پیداوار ہے۔ پورے سوویت یونین کی روئی کی پیداوار کا ۶۰ فی صدی حصہ ہے۔ سوویت حکومت کے قیام کے بعد سے آبپاشی کے کام کو زبردست فروغ حاصل ہوا ہے۔ روئی کے علاوہ چاول، میٹھا چقندر ، شہتوت ، انگور اور دوسرے پھل، زیتون اور تیل دینے والی اشیا بھی پیدا کی جاتی ہیں ۔ ازبکستان کے منقا اور خوبانی بہت مشہور ہیں ۔

سوویت حکومت کے قیام کے بعد سے زرعی خام اشیا کو نکھارنے کی بڑی بڑی صنعتیں قائم ہوئی ہیں۔ ان صنعتوں میں سوت اور دھاگہ ، ریشمی اشیا، ترکاریوں کا تیل ، شراب اور قراقل بھیڑوں کا چمڑا اور ڈبے کی چیزیں تیار ہوتی ہیں ۔ اعلا قسم کی معدنی کھاد اور زراعتی مشینیں بھی بڑے پیمانے پر بنتی ہیں ۔ ۱۹۳۸ء کی صنعتی پیداوار ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں ۷ گنی زیادہ تھی جنگ کے تین سال میں (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۳ء) صنعتی پیداوار میں ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہوا ۔ جنگ ہی کے زمانے میں یہاں آلاتِ حرب، گولہ بارود، مشینوں کے پرزے اور بجلی کے سامان بننے لگے ۔ مرکزی ایشیا کا پہلا اسٹیل کا کارخانہ ازبکستان ہی میں قائم ہوا تھا ۔ یہاں کوئلہ، پٹرول اور سلفر بھی پیدا ہوتا ہے۔ بڑے پیمانے پر برقابی مرکزوں کی تعمیر ہو رہی ہے اور ہو بھی گئی ہے۔ جنگ کے دوران میں یہاں مرکزی ایشیا کے دو عظیم ترین برقابی مرکزوں کی تعمیر ہوئی ہے۔ ایک تو چرچک کا برقابی مرکز جو تاشقند کے نزدیک ہے اور

دوسرا فرخد کا جو دریائے سیر دریا پر بنایا گیا ہے۔

تاجکستان تاجکستان میں روئی، چاول، خوبانی، سیب اور انگور پیدا ہوتے ہیں۔ جتنے رقبے میں آب پاشی کی مدد سے یہ چیزیں پیدا کی جاتی ہیں اُس میں ۱۹۳۸ء میں انقلاب سے پہلے کی بہ نسبت ۷۶ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ بڑی بڑی نئی نہریں بنائی گئی ہیں جن سے دسیع وعریض خطوں میں پانی پہنچایا جاتا ہے۔ جنوب کی وادیوں میں روئی، بادام، انار اور پستہ پیدا کیا جاتا ہے۔ سوویت حکومت کے قیام کے بعد سے پامیر کی سطح مرتفع پر جو (۱۳ دمیل سے زیادہ اونچا ہے) غلے کی کاشت ہوئی ہے۔ مویشی، بکروں، گھوڑوں اور بڑے بڑے اور موٹے حصار بھیڑوں کی افزائش نسل اور پرورش کے کام میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے حصار بھیڑ قد وقامت کے لحاظ سے دُنیا میں سب سے بڑے سمجھے جاتے ہیں۔

۱۹۱۳ء کے مقابلے میں ۱۹۳۷ء میں صنعتی پیداوار ۷.۵ گنی بڑھ گئی۔ روئی، ریشم، چمڑے کی اشیا، کپاس کے بیج کا تیل اور شراب بنتی ہے۔ ڈبے میں پھل اور ترکاریاں بھری جاتی ہیں۔ کوئلہ، تیل، سونا، غیر آہنی اور نایاب دھات کھودا جاتا ہے۔

۱۹۲۴ء میں تاجکی عوام نے روسی قوم کے تعاون سے اشتراکی جمہوریت کی بنیاد ڈالی، اور اپنی آزاد ریاست قائم کی۔ تاجکستان ہی میں گورنو بدخشاں کا "خود مختار علاقہ" ہے جس کا دار السلطنت خوروگ ہے۔ یہ پامیر کی سطح مرتفع اور اس کے ڈھلوان حصے پر واقع ہے یہاں کرغیزی اور تاجکی قوم کے باشندے آباد ہیں۔

کرغیزیہ کرغیزیہ مویشی کی پرورش اور افزائش نسل کے لیے مشہور ہے۔ الپائن کی زرخیز چراگاہیں کروڑوں مویشی، بھیڑ اور گھوڑوں کے لیے قوت بخش غذا فراہم کرتی ہیں۔ یہ چراگاہیں شروع بہار سے لے کر آخر خزاں تک ہری بھری رہتی ہیں اور صرف جاڑے میں چار ماہ تک کار آمد نہیں رہتیں۔

انقلاب کے بعد سے زراعت نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ۱۹۲۷ء میں دس لاکھ ہیکٹر زمین میں کاشت ہوئی۔ (ایک ہیکٹر = ۲.۴۷۱ ایکڑ کے) زار کے عہد غلامی میں جتنی زمین زیر کاشت تھی اُس سے یہ ۶۰ فی صدی زیادہ ہے۔ دامن کوہ اور ملحقہ وادیوں میں جہاں باقاعدہ آب پاشی کی جاتی ہے، چقندر، زیزفون، تمباکو اور روئی کی اعلا پیمانے پر کاشت ہوتی ہے۔ انگور، شہتوت اور دیگر پھلوں کے باغات کثرت سے ہیں۔ میٹھے چقندر کی کاشت جس سے شکر نکالی جاتی ہے سوویت حکومت کے قیام کے بعد شروع ہوئی۔ لیکن مختصر ہی سے عرصے میں یعنی دوسری جنگ عظیم کے چھڑنے سے پہلے پہلے وہاں پورے سوویت یونین میں سب سے زیادہ چقندر پیدا ہونے لگا، فی ایکڑ ۳۰۰ من سے بھی زیادہ۔

بڑے پیمانے کی صنعت اُس وقت شروع ہوئی جب سوویت حکومت قائم ہوئی، جس کے بعد صنعتی پیداوار سو گنی بڑھ گئی۔ جنگ کے دوران میں صنعتوں کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ تین سال کے مختصر سے عرصے میں یعنی ۱۹۴۰ء سے

۱۹۴۳ء تک غیر آہنی دھات کی پیداوار دوگنی ہوگئی۔ کپڑے کی پیداوار میں ۷۰ فی صدی کا اضافہ ہوا اور گوشت اور دودھ کی بنی ہوئی اشیا کی پیداوار میں ۵۵ فی صدی کا۔ یہاں سوتی اور ریشمی کپڑے تیار ہوتے ہیں، سن کا سوت بنتا ہے، ترکاریوں سے تیل اور جانوروں سے چربی نکالی جاتی ہے۔ ڈبے میں گوشت، پھل اور ترکاریاں بھرنے کا کام ہوتا ہے۔ یہاں تمباکو کی بھی صنعت ہے۔

کرغیزیہ کی معاشی زندگی میں کان کنی کی زبردست اہمیت ہے۔ یہیں سے پورے مرکزی ایشیا میں کوئلہ سپلائی ہوتا ہے۔ پٹرول، ریڈیم، گندھک اور بہت سے نایاب دھات یہاں کھودے جاتے ہیں۔ جنگ کے شروع ہونے کے بعد کحل اور سیماب نکھارنے کا کام اور سیسہ، ٹنگسٹن اور مولب ڈے نم کی کھدائی شروع کی گئی ہے۔

قزاخستان اشتراکی حکومت قائم ہونے کے بعد ۲۵ سال کے اندر اندر قزاخستان سودیت یونین میں غیر آہنی دھات کی کھدائی اور صفائی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ (غیر آہنی دھات سے مراد ہے تانبا، جستہ، سونا، نکل، کحل، رانگا، ٹنگسٹن اور سیسہ) گزشتہ جنگ سے پہلے ہی قزاخستان دھات کی کھدائی اور صفائی کے لحاظ سے کافی ترقی کرچکا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سودیت یونین کا ۸۵ فی صدی سیسہ یہیں سے مہیا ہوتا ہے۔ جنگ کے بعد سے یہاں لوہا اور اسٹیل اور غیر آہنی دھات کے پگھلانے کے بڑے بڑے کارخانے بن گئے ہیں۔ انھی میں کوہستان جنگر کا جستہ کا کارخانہ، اکتوبنسک کا آہن آمیزی کا کارخانہ اور کراگندا کا تلنے کا کارخانہ بھی ہے۔ حال ہی میں ایک مینگنیز کی کان کی کھدائی شروع ہوئی ہے اور ایک اور بہت بڑا لوہے اور اسٹیل کا کارخانہ بن رہا ہے۔

قزاخستان کا کوئلے کی کان کا علاقہ بھی بہت وسیع ہے۔ رقبے کے لحاظ سے پورے سودیت یونین میں اس کا تیسرا نمبر ہے۔ کوئلے کی یہ کان کراگندہ کے نشیبی خطے میں واقع ہے۔ بحیرۂ کیسپین کے شمال مشرق کی طرف تیل کے بہت بڑے ذخیرے کا پتا چلا ہے جس کی کھدائی اب شروع ہورہی ہے۔ یہاں فاس فورسی کھاد بھی بہت بڑے پیمانے پر تیار ہوتی ہے۔

زرعی خام اشیا کو محفوظ کرنے اور تیار کرنے کے بھی بہت سے کارخانے بن گئے ہیں۔ یہاں ڈبے میں گوشت، مچھلی، ترکاری اور پھل وغیرہ بھرے جاتے ہیں۔ شکر، تمباکو اور چمڑا تیار کیا جاتا ہے، اور سوتی اور اونی کپڑے بنتے ہیں۔

زراعت میں بھی قزاخستان نے بہت ترقی کی ہے۔ باکاشت زمین کا رقبہ دوگنا ہوگیا ہے۔ شمال میں گیہوں، باجرا اور سورج مکھی کی کاشت ہوتی ہے۔ جنوب میں جہاں آب پاشی کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا گیا ہے روئی، چاول، چقندر، تمباکو، زیزفون، تیل دینے والی اشیا، اور ربڑ دینے والے پودوں کی کاشت ہوتی ہے۔ قزاخستان مویشی کی پرورش اور افزائشِ نسل کے لحاظ سے بھی خاص اہمیت اور شہرت رکھتا ہے۔ یہاں گھوڑے، گائے، بیل، قراقل بھیڑ، عام بھیڑ اور بکرے پالے جاتے

ہیں اور انیڈس کے پہاڑی علاقے میں ہرن بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔

ترکمانیہ سنہ ۱۹۲۴ء میں ترکمانیہ کی اشتراکی جمہوری ریاست قائم ہوئی۔ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں ترکمانیہ ایک بہت بڑا روئی پیدا کرنے والا ملک بن گیا۔ دسیع وعریض علاقوں میں نہایت اعلا قسم کی لمبے ریشے والی مصری روئی کی کاشت ہوتی ہی اور اعلا درجے کا انگور، خربوزہ، تربوز اور شہتوت پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے پودوں کی بھی کاشت ہوتی ہی جن سے تیل اور ربڑ نکالے جاتے ہیں۔ ترکمانیہ کی چراگاہیں ۲۰ لاکھ سے زیادہ مویشی، عام بھیڑوں اور قراقل بھیڑوں اور صبا رفتار گھوڑوں کے لیے غذا فراہم کرتی ہیں۔

مختلف قسم کی صنعتیں بھی اعلا پیمانے پر چل رہی ہیں:۔ سوت، ریشم، دریاں قالین، جوتے، گوشت کی چیزیں اور شیشے بنتے ہیں تیل، سوڈیم، سلفیٹ، اوزوسے رائٹ، بردمائن، آیوڈائن، اور گندھک بھی پیدا ہوتے ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں تیل صاف کرنے کے نئے کارخانے قائم ہوئے ہیں۔

ربڑ بورڈ ہندستان میں ربڑ کی پیداوار دوسرے ربڑ پیدا کرنے والے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہی۔ اندازہ لگایا گیا ہی کہ ہندستان میں دُنیا بھر کے ربڑ کا صرف ایک یا ڈیڑھ فی صدی حصہ پیدا ہوتا ہی۔ اس کا بھی ۸۰ فی صدی حصہ ریاست میسوڑ اور خاص طور پر ریاست ٹراونکور میں پیدا ہوتا ہی۔ جنگ سے پہلے ربڑ کی پیداوار اور خرید و فروخت کی حالت بہت ردی تھی سنہ ۱۹۲۹ء تا سنہ ۱۹۳۳ء کے عالم گیر معاشی بحران کا اثر ہندستان میں سب سے پہلے ربڑ ہی پر پڑا تھا اور اس کی کاشت اور صنعت چاروں خانے چت ہوگئی تھی جنگ کے زمانے میں جنوبی مشرقی ایشیا کے ممالک جاپانیوں کے قبضے میں چلے گئے جس سے اتحادی ممالک میں ربڑ کی سخت قلت محسوس کی جانے لگی۔ امریکہ میں اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مصنوعی ربڑ کی صنعت کو آگے بڑھایا گیا، ہندستان میں بھی ربڑ کی پیداوار بڑھی اس لیے کہ چڑھی ہوئی قیمتوں نے لوگوں کو اس کی طرف توجہ کرنے کا موقع دیا۔ ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء تک ربڑ کی قیمت پر کنٹرول رہا۔ گزشتہ سال ربڑ کے مالکوں کے دباؤ سے مجبور ہوکر حکومت ہند نے قیمت میں اضافہ کردیا۔ ۱۳ ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو ربڑ کی پیدائش اور خرید و فروخت پر سے کنٹرول اُٹھالیا گیا، اور اب گزشتہ فروری میں مرکزی اسمبلی میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا گیا جس کا مقصد یہ ہی کہ ایک ربڑ بورڈ کا قیام عمل میں لایا جائے اس بورڈ کا کام یہ ہوگا کہ ربڑ کی قیمت کے تعین، اس کی درآمد و برآمد اور کاشت وغیرہ سے متعلقہ مسائل پر غور و خوض کرے اور صحیح پالیسی کا تعین کرے۔ ربڑ کی پیدائش پر اب سیس کی ایک رقم بھی بٹھائی جائے گی جس سے ربڑ سے متعلق سائنسی تحقیقات کا خرچ چلایا جائے گا۔

فی ایکڑ پیداوار اور اخراجاتِ پیدائش کی کفایت کے لحاظ سے ہندستان دوسرے ربڑ پیدا کرنے والے ملکوں کا مقابلہ

نہیں کرسکتا۔ اس لیے مجوزہ ربڑ بورڈ کا فرض ہو کہ زیادہ اچھا ربڑ پیدا کرنے اور کفایت کے طریقے بتلائے تاکہ ربڑ کی آزاد تجارت میں ہندستان گھاٹے سے بچ سکے۔ اس وقت ہندستان میں ۱۶۰۰۰ ٹن ربڑ کی سالانہ پیداوار ہو۔ اس میں سے ۱۴۰۰۰ ٹن خود ملکی ضرورتوں میں کھپ جاتا ہو۔ جب ربڑ کی صنعت اور ترقی کرے گی تو یہ بقیہ مقدار بھی ملک کے اندر ہی کام آنے لگے گی۔

نکل کا رُپیہ ۱۰ اپریل ۱۹۴۷ء کو مرکزی اسمبلی میں وزیر مالیات کا پیش کیا ہوا ایک قانون پاس کیا گیا جس کا مقصد یہ ہو کہ قانون سکہ جات ہند میں مزید ترمیم کرکے چاندی کا رُپیہ منسوخ اور نکل کا رُپیہ جاری کیا جائے۔ مباحثے کے دوران میں حکومت ہند کے اس فیصلے کے متعلق جو ضروری باتیں واضح ہوئیں وہ یہ ہیں:۔

چاندی اور سونے کے سکے کے باعث قیمتوں میں بہت گڑبڑی ہوتی رہی ہو۔ ایسا نہ صرف اس ملک میں ہوا ہو بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی۔ اب تک حکومت ہند نے مبادلے میں استحکام پیدا کرنے کی غرض سے سکہ جات کی تبدیلی پر غور و خوض کرنے کے لیے جتنی کمیٹیاں بٹھائی ہیں اُن سب کی رپوٹ سے مندرجہ بالا حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہو۔ موجودہ قانون کی رُو سے یہ دقت جو مدتوں سے محسوس کی جارہی ہو دور ہو جائے گی۔ یہ بات بالکل غیر اہم ہو کہ ذریعہ مبادلہ کاغذ کا ہو، یا چاندی کا، سونے کا یا نکل کا۔ سکہ جات کے سلسلے میں اہل چیز اعتماد ہو۔ اگر حکومت کو لوگوں کا اعتماد حاصل ہو تو وہ جس چیز کا بھی سکہ جاری کرے کوئی فرق نہ ہوگا۔ نکل کا سکہ جاری ہونے سے بعد قیمتوں کے نظام میں استحکام پیدا ہوگا، اور دیگر ضروری امور کے لیے چاندی کی فراہمی ممکن ہوسکے گی۔ مثلاً ۲۲ کروڑ ۱۰ لاکھ اونس چاندی امریکہ سے ہندستان نے قرض لیا ہو جس کی واپسی ضروری ہو۔ رُپے کی اصل کسوٹی یہ نہیں ہو کہ اس میں چاندی ہو یا نکل، بلکہ یہ کہ اس سے کتنی اشیا خریدی جاسکتی ہیں۔ نکل کا رُپیہ جاری ہونے سے رُپے کی یہ حیثیت پورے طور پر برقرار رہے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ حکومت مزید دھات کے سکہ جات جاری کرسکے گی اور غیر ملکوں سے اونچی قیمت پر چاندی کی خریداری بند ہو جائے گی۔ موجودہ رُپوں سے چاندی نکالنے اور نئے نکل کے رُپے ڈھالنے میں اتنا خرچ نہیں ہوگا جتنا کہ محسوس کیا جارہا ہو بلکہ اس سے بہت کم۔

نکل کا رُپیہ ابھی فوراً ہی جاری نہیں کیا جائے گا بلکہ کچھ عرصہ بعد۔ ایسا اس لیے ہوگا کہ ہندستان کا آیندہ سیاسی اور دستوری نقشہ ہمارے سامنے ابھی واضح نہیں ہوا ہو۔

قانون ریزرو بینک میں ترمیم قانون ریزرو بینک میں حال ہی میں جو ترمیم کی گئی ہو اس کی رُو سے قانون کے دفعات ۴۰ اور ۴۱ منسوخ ہو جاتے ہیں۔ ان دفعات کی رُو سے رُپے کی بیرونی قیمت کا تعین اسٹرلنگ اور محض اسٹرلنگ کے ذریعے ہوتا تھا۔ نئے دفعے کی رُو سے ریزرو بینک حکومت ہند کی طے کی ہوئی شرطوں پر غیر ملکی سکہ خرید یا بیچ سکتا ہو۔ شرطوں کے تعین میں حکومت ہند کے لیے بین اقوامی مالی فنڈ کی عائد کی ہوئی ذمے داریوں کا خیال

رکھنا ضروری ہے اس لیے کہ وہ اس کی ایک رکن ہے۔ موجودہ حالات کے تحت رُپے کی بیرونی قیمت برقرار رکھنے کا یہ سب سے موزوں طریقہ ہے۔ رُپے کی بیرونی قیمت سونے کی شکل میں موجودہ حالات کے اندر کیا ہے اس کی اطلاع بین اقوامی مالی فنڈ کو حال ہی میں کردی گئی ہے۔

نئی ترمیمات کی رُو سے ریزرو بینک کو اسٹرلنگ کے علاوہ دیگر غیر ملکی سکّے خریدنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ہندستان سیاسی اور معاشی ارتقا کی جس نئی منزل میں داخل ہوا ہے وہاں تجارتی گرم بازاری کے باعث مختلف النوع غیر ملکی ادائگیوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ جن دفعات کو منسوخ کیا گیا ہے اُن کی رُو سے ریزرو بینک اسٹرلنگ کے علاوہ دوسرے سکّے نہیں خرید سکتا تھا، لیکن اب خرید سکتا ہے اور اس طرح غیر ملکی ادائیگیوں کی ضرورت آسانی سے رفع ہوگی۔ ہندستان کی بیرونی تجارت کو اس طرح فروغ حاصل ہوگا۔

——————·×·(·×·)·×·——————

برِاعظم ایشیا کے معاشی مسائل

(بقیہ صفحہ ۵)

غیر ملکی سرمایہ نہ لیا جائے کہ جن سے ملک کی اندرونی معیشت پر غیر ملکی سرمایے داروں کا قبضہ ہو جائے۔ بہتر یہ ہے کہ غیر ملکی سرمایہ افراد نہ لیں بلکہ حکومت۔ اگر ان اصولوں پر عمل نہ کیا گیا تو نو آبادیاتی معیشت ایک نئے بھیس میں نمودار ہوگی۔ رپوٹ میں اس بات کی مذمت کی گئی ہے کہ ایشیائی ملکوں کے تمام ذرائع نقل وحمل اور ذرائع رسل و رسائل پر غیر ایشیائی قبضہ ہے۔ ان کا اپنے ہاتھوں میں آنا نہایت ضروری ہے۔

ریاستی ملکیت کے مسئلے کو ہر ملک کے حالات اور روایات پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن بنیادی صنعتوں، ملکی تحفظ، اور مفادِ عامہ کی صنعتوں کو ریاستی ملکیت بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ ہر ملک میں صنعتی منصوبہ بندی کا ہونا ضروری ہے۔ ایک مندوب نے اس بات کی اہمیت واضح کی کہ تمام ایشیائی ملکوں کی صنعتی ترقی اور منصوبہ بندی میں تعاون اور ہم آہنگی ہونی چاہیے۔

دنیا کے امن وامان کو قائم اور ایشیائی ملکوں کی موجودہ یا آیندہ آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے ایشیا کا صنعتی اور زراعتی لحاظ سے جلد از جلد ترقی کرنا بنیادی طور پر ضروری ہے، ورنہ ایشیا نہ تو نو آبادیاتی معیشت کے چنگل سے نکل سکے گا اور نہ یہاں کے عوام کا معیار زندگی بلند ہو سکے گا۔

اگرچہ ان تجویزوں میں کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن یک جائی گفتگو اور بحث سے بہت کچھ بصیرت اور رہنمائی ہو سکتی ہے، بشرطیکہ اس کانفرنس کے بانی اور منتظم اپنے اس اصول پر قائم رہیں جس کا اظہار انھوں نے کانفرنس قائم کرتے وقت کیا تھا اور اس کام کو سیاسی مباحثوں اور سازشوں میں نہ الجھا دیں۔

تبصرے

۱- اسٹرلنگ قرضہ
۲- اشتراکی روس
۳- مشرقی یورپ کا زرعی انقلاب

اُردو کا تازہ ترین معاشیاتی اور معاشرتی ادب

از :———— ادارہ

انگلستان پر ہندستان کا قرضہ | مصنف ابوسالم ایم۔ اے (علیگ) حجم ۹۶ صفحات، قیمت ۱۲ر، ملنے کا پتا:- مکتبۂ جامعہ، دہلی۔

یہ پمفلٹ تین ابواب پر مشتمل ہی:- (۱) فاضلات اسٹرلنگ (۲) اسٹرلنگ قرضے کی ادائیگی افراط زر، (۳) اسٹرلنگ سرمایہ اور ہندستان کی معاشی ترقی۔

اسٹرلنگ قرضے کا مسئلہ ہندستانی معیشت کا ایک اہم مسئلہ ہی جس کا تعلق راست طور پر ہماری موجودہ اور آیندہ کی صنعتی اور معاشی ترقی سے ہی۔ لیکن معاشیاتی ادب کی قلت کے باعث اردوداں طبقے میں اتنے اہم مسئلے سے عام ناواقفیت پائی جاتی ہی ابوسالم صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اور مکتبۂ جامعہ نے اسے چھاپ کر یقیناً ایک اہم خدمت انجام دی ہی اور ایک زبردست کمی پوری کی ہی۔ ابوسالم صاحب اُردو کے علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہیں آن کا موضوع خاص معاشیات ہی، قومی اور بین اقوامی معاشی مسائل پر ان کا مطالعہ بہت وسیع اور عمیق ہی۔ زیر نظر کتابچے میں انھوں نے نہایت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہی کہ کس طرح دوران جنگ میں ہندستان ایک مقروض ملک سے مہاجن ملک بن گیا، کس طرح برطانیہ پر یہ قرضہ جمع ہوا اور ہندستان کو اس کی بہ دولت کتنی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا، اس قرضے کی ادائیگی ہماری صنعتی ترقی

کے لیے بنیادی طور پر ضروری ہے۔ کتابچے کا سب سے مفید باب آخری باب ہے جس میں انھوں نے ہندستان کی معاشی ترقی کی روشنی میں اسٹرلنگ قرضے کی ادائیگی کی اہمیت واضح کی ہے۔ زبان اور طرز ادا بہت سادہ، سلیس اور دل چسپ ہے۔ ہر اس شخص کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے جس کو ملک کے معاشی مسائل سے دل چسپی ہے، اور آج کون ہے جسے دل چسپی نہیں۔

اشتراکی روس | ہیولٹ جانسن ڈین آف کنٹربری کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ۔ مترجم کلیم اللہ۔ حجم ۲۲۵ صفحات کاغذ اور لکھائی چھپائی بہت اعلا اور نفیس، حسین اور مصور گرد پوش۔ قیمت دو روپے ۱۲ آنے۔ ملنے کا پتا:۔ قومی دارالاشاعت، ۵ اے، ایم، سی، اے، بلڈنگ۔ دی مال۔ لاہور۔

ہیولٹ جانسن کی انگریزی تصنیف جو دوران جنگ میں لکھی گئی تھی پوری دُنیا میں مشہور ہو چکی ہے اور سوویت یونین پر دُنیا کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ سوویت یونین اور بقیہ دُنیا کے درمیان لاعلمی اور اجنبیت کی جو مضبوط دیواریں حائل کردی گئی تھیں انھیں گزشتہ جنگ نے پاش پاش کردیا ہے اور دُنیا کی اکثریت سوویت یونین کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے لگی ہے۔ یہ تصنیف اسی عہد کی پیداوار ہے اور لاعلمی کے پردوں کو چاک کرنے میں اس کا زبردست حصہ رہا ہے۔ جو خصوصیت اس کتاب کو اس موضوع پر دُوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا بنیادی نقطۂ نظر ہے ورنہ اگر اعداد و شمار اور معلومات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سڈنی اور بیٹرس وب کی تصنیف زیادہ اہم ہے۔ یہ بنیادی نقطۂ نظر مخصوص طور پر مذہبی اور اخلاقی ہے۔ ہیولٹ جانسن ایک پادری ہے اس لیے اس کا نقطۂ نظر بھی پادریانہ ہے۔ یہ حقیقت کئی پہلوؤں سے اہم اور قابلِ غور ہے۔ سرمایہ دار ممالک نے ساری دُنیا میں اور مخصوص طور پر مذہب پسند ایشیا میں سوویت یونین کے خلاف جو پروپگنڈا کیا تھا وہ یہی تھا کہ وہاں مذہب و اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن اس کتاب کا مذہبی مصنف ہمیں یہ بتاتا ہے کہ سوویت یونین ہی پہلا معاشرتی نظام ہے جہاں تمام مذاہب کے اعلاترین انسانی اور اخلاقی اصولوں پر پہلی بار عمل درآمد شروع ہوا ہے اور ہر فرد کو مذہبی لحاظ سے مکمل آزادی ہے۔ وہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ سوویت یونین کا اخلاقی معیار دُنیا کے تمام ملکوں سے بلند ہے اس لیے کہ وہاں معاشی مساوات اور خوش حالی کے باعث نہ تو چوروں اور ڈاکوؤں کا وجود رہا ہے اور نہ طوائفوں کا، نہ دھوکے بازوں کا اور نہ خود غرض لوگوں کا۔ وہاں حاکم اور محکوم، نوکر اور مالک کے رشتے ماضی کی داستانِ پارینہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ سوویت یونین کے متعلق ایک پادری کے اس اعتراف نے ساری دُنیا کو چونکا دیا ہے۔ یہاں تک کہ فاضل مصنف نے سوویت یونین کے معاشی نظام کو ——— صنعت اور زراعت کو بھی ——— مذہب اور اخلاق کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ مغربی معاشیین کو یہ نقطۂ نظر کچھ عجیب سا معلوم ہوگا لیکن دراصل اس کے عجیب لگنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ یہ مغربی یورپ کا ذاتی نفع اندوزی اور خود غرضی کا معاشی نظام ہے جس نے سماج کے معاشی تعلقات کو اخلاق کی کسوٹی سے اتنا دُور پھینک دیا ہے اور ہم یہ سوچنے لگے ہیں کہ اخلاق ایک بالکل

الگ چیز ہو اور معاشی سرگرمیوں میں اُس کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے، بہ قول مصنّف سرمایے دار ملکوں میں یہ ہوتا ہو کہ "اتوار کو ہم گرجا جاتے ہیں اور وہاں بھائی چارا، سچائی اور انصاف کی قسم کھاتے ہیں اور وہاں سے نکل کر ہم دوسرے ہی دن اپنے ساتھیوں کی گردن کاٹنے کی فکر کرتے ہیں۔" سوویت یونین میں اخلاق اور سیاسی و معاشی تعلقات کے اس تضاد کو مٹا دیا گیا ہو۔ یہ ہو مصنّف کا تجربہ۔ اگر آج ارسطو اور میکاولی زندہ ہوتے تو سوویت یونین کے تجربے کے پیشِ نظر انھیں اپنے اُس سیاسی نظریے کو بدلنا پڑتا جس کے تحت انھوں نے سیاست کو اخلاق سے بالکل علاحدہ کر دیا تھا۔

کتاب ۷ ابواب پر مشتمل ہو۔ اور ہر باب میں علاحدہ علاحدہ طور پر سوویت یونین کے معاشی، معاشرتی، تعلیمی و تہذیبی اور سیاسی حالات سے بحث کی گئی ہو۔ مصنّف نے بڑے گہرے غور و خوض اور مطالعے و ملاحظے کے بعد بہت محسوس کر کے یہ کتاب لکھی ہو جس سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہو۔ ترجمہ بہت سادہ اور آسان ہو اور انگریزیت کا ذرّہ برابر بھی نام و نشان نہیں ہو، جس سے اُردو میں اس کی دلچسپی پورے طور سے برقرار رہتی ہو۔

مشرقی یورپ کا زرعی انقلاب

مصنّف موہن کمار منگلم۔ حجم ۲۸ صفحات۔ قیمت ۴ ر۔ ملنے کا پتا:۔ قومی دارالاشاعت مال روڈ۔ لاہور۔

اس چھوٹے سے پمفلٹ میں مصنّف نے پہلے تو جنگ سے پہلے کی اُن بدحالیوں کا نقشہ کھینچا ہو جو مشرقی یورپ میں جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے عام تھیں۔ اُس کے بعد اُن زرعی تبدیلیوں کا تذکرہ ہو جو جنگ کے بعد ہٹلر اور اُس کے حامی جاگیرداروں کے فوجی اور سیاسی زوال کے باعث ظہور پزیر ہوئیں۔ ہنگری، رومانیہ، پولینڈ، یوگوسلافیہ، چیکوسلاوکیہ اور مشرقی جرمنی کی تمام زمین داریاں اور جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور غریب کسانوں اور کھیت مزدوروں میں تقسیم کر دی گئیں۔ اب وہاں انجمن امداد باہمی کے ذریعے کاشت کاری کی جا رہی ہو اور مشینی زراعت شروع کرنے کے لیے مشین سازی کی صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہو کہ مشرقی یورپ میں زمین داروں اور جاگیرداروں کو کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا جس سے کسانوں کی حالت میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہو اور وہ خوش حالی کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔

رجسٹرڈ نمبر ——— ایل ۵۱۳۸

اعلان

ہندستان بھر کے مصنّفین اور اشاعت خانوں کے نام

اُردو رسائل و اخبارات میں عام طور پر یہ افسوس ناک طریقہ رائج ہے کہ وہ کتابوں کا مطالعہ کیے بغیر ان پر ریویو کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسرت کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اپنے رسائل و جرائد میں اُردو نیز انگریزی کتابوں پر ریویو کا از سرِ نو باقاعدہ اور باضابطہ انتظام کیا ہے۔ اس سلسلے میں مُلک کے بہترین مبصروں اور عالموں کی مستقل خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ مصنّفین، مدیران اور اشاعت خانوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تصانیف، منتخبات، ترجمے اور دیگر مطبوعات چاہے وہ کسی بھی موضوع پر ہوں، مسلسل طور پر انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) میں ریویو کے لیے بھیجتے رہیں۔

دفتر انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) نمبر (۱)، دریا گنج دہلی

———

عبداللطیف نے لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی دروازہ، دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ معاشی رسالہ

معاشیات

اڈیٹر

طفیل احمد خاں، ایم اے

ہماری زبان

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی کا پندرہ روزہ اخبار

ہر ماہ کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہی

سالانہ چندہ دو رُپے۔ قیمت فی پرچہ دو آنے

ہندستان بھر میں اردو سے متعلق تمام واقعات اور خبریں، اُردو کے دوستوں کی کارروائیاں اور اُردو کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں سب بہ یک وقت اس اخبار میں مل جاتی ہیں۔ ہر اس شخص کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جسے اُردو کی ترقی اور ترویج سے دل چسپی ہی۔

ملنے کا پتا

لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی دروازہ، دہلی

معاشیات

جلد۲ — مئی ۱۹۴۷ء — نمبر۵

فہرست مضامین

نمبر شمار			صفحہ
۱	برطانیہ کا نیا بجٹ ۔ جینیوا کانفرنس	اڈیٹر	۲
۲	اسٹرلنگ سے روپے کا قطع تعلق	ابو سالم ام۔ اے (علیگ)	۷
۳	صوبائی حکومتوں کی آمدنی اور خرچ		۱۳
۴	سرمایہ دار ملکوں میں دوران جنگ کی معاشی منصوبہ بندی	ی۔ ورگا	۲۰
۶	امداد باہمی	حمیدہ سراج	۳۶
۷	معاشی صورت حال		۴۱
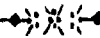
اداریہ

برطانیہ کا نیا بجٹ

از: ــــــــــــ اڈیٹر

ڈاکٹر ڈالٹن 'برطانوی وزیر مالیات' نے ۱۵ اپریل کو ۱۹۴۷-۴۸ء کی آمدنی اور خرچ کے جو تخمینے پیش کیے ہیں اُن میں اہم ترین باتیں یہ ہیں :-

نئے سال کی آمدنی خرچ سے زیادہ ہوگی۔ سماجی امور پر زیادہ رقم خرچ کی جائے گی۔ کمائی آمدنی کے سلسلے میں مزید سرکاری امداد مہیا کی جائے گی۔ سستے زر والی پالیسی کو برقرار رکھا جائے گا۔ فوجی اخراجات میں ۴۶ فی صدی کی کمی ہوگی اور تمباکو کی درآمد پر محصول بڑھایا جائے گا۔

قبل اس کے کہ نئے سال کے تخمینے کا تجزیہ کیا جائے، ۱۹۴۶-۴۷ء یعنی گزشتہ مالیاتی سال کی آمدنی اور خرچ پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ گزشتہ سال ۲۷ کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ کے خسارے کا اندازہ لگایا گیا تھا لیکن اس سے بقدر ۱۵ کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ کم خسارہ ہوا۔ یعنی صرف ۵۶ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ کا۔ آمدنی تخمینے سے ۱۸ کروڑ پونڈ زیادہ ہوئی یعنی ۳ ارب ۴۳ کروڑ ۱۰ لاکھ پونڈ۔ اخراجات کا میزان ہے ۳ ارب ۹۱ کروڑ پونڈ۔ جو تخمینے سے صرف ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ پونڈ زیادہ ہے۔ فوجی اخراجات میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ کی کمی واقع ہوئی۔ جو نہ ملنے کے باعث بیئر زیادہ نہیں بیدا کی جاسکی۔ اس کا سرکاری محصولات پر اثر پڑا اور ۵ کروڑ پونڈ کا خسارہ ہوا۔ لیکن تمباکو ٹیکس، محصولات آراضی، زائد منافع ٹیکس، فوتی محصول اور تفریح ٹیکس وغیرہ سے کافی

آمدنی ہوگئی جس سے بیرونے نقصان کا ازالہ ہوگیا ۔

سماجی امور پر ۴۴ کروڑ ۱۰ لاکھ پونڈ خرچ کیے گئے جو سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء کے مقابلے میں بقدر ۱۱ کروڑ ۷۰ لاکھ زیادہ ہے ۔ سماجی امور میں تعلیم ، بوڑھوں اور بیواؤں کی پنشن اور مکانات کے سلسلے میں امدادی رقم وغیرہ شامل ہے ۔ ناواجب خرچ البتہ یونان میں ہوا ہے جہاں برطانیہ نے ایک عظیم رقم یونان کی غلط خارجی پالیسی کی نذر کردی ، جرمنی کے سلسلے میں بھی برطانیہ کو گزشتہ سال اپنے ذرائع آمدنی پر بہت بوجھ ڈالنا پڑا ۔

گزشتہ سال کے بجٹ پر نظر ڈالنے سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ آمدنی کے بڑھنے اور اخراجات کے گھٹنے کا رجحان اپنا کام کرتا رہا ہے ۔ سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں ۲ ارب پونڈ کا خسارہ ہوا تھا ۔ اس کو ایک ہی سال میں گھٹا کر ۵۹ کروڑ ۷۰ لاکھ تک لے آنا یقیناً ایک بڑی کامیابی کی دلیل ہے ۔ یہ رجحان نئے سال کے بجٹ میں اس طرح ظاہر ہوا ہے کہ خسارے کے بجائے بچت کا تخمینہ پیش کیا گیا ہے ۔ جنگی معیشت کو بدل کر زمانۂ امن کے حالات سے مطابق بنانے میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی ہے ۔ سماجی امور پر اخراجات کا میزانیہ لائق ستایش ہے اور سرکاری اخراجات کے جدید اصول کے عین مطابق ۔

نئے سال کے جو تخمینے پیش کیے گئے ہیں ان میں موجودہ بنیاد پر ۲۷ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ کی بچت دکھلائی گئی ہے ۔ خاص خاص مدوں میں اخراجات بہت گھٹ جائیں گے ۔ مثلاً جہازرانی کے سلسلے میں پہلے کی بہ نسبت ۴ کروڑ پونڈ کم خرچ ہوں گے ۔ اس سال "انرا" کو ۹ کروڑ کی بجائے صرف دس لاکھ کی رقم دینے کی ضرورت پیش آئے گی ۔ فوجی اخراجات میں بھی ۴۶ فی صدی کی کمی واقع ہوگی ۔ جنگ کے فوراً ہی بعد اخراجات کا اتنی سرعت رفتار کے ساتھ گھٹ جانا تعجب خیز نہیں ہے ۔

مصنوعی ریشم پر سے اکسائز ڈیوٹی ہٹادی گئی ہے اور کمائی آمدنی والی امداد میں اضافہ کردیا گیا ہے ۔ بچوں کا بھتہ بھی بڑھادیا گیا ہے جس سے آمدنی میں کوئی ۸ کروڑ پونڈ کی کمی واقع ہوگی ۔ پورے مالیاتی سال میں اس سے بھی زیادہ کمی واقع ہوگی یعنی ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ ۔ ٹیکسوں کے اس ردوبدل سے کوئی ۷ لاکھ ۵۰ ہزار مزدوروں کو انکم ٹیکس سے کلیۃً چھٹکارا مل جائے گا ۔ بجٹ کی یہ خصوصیت قابل تعریف ہے ۔

منافع ٹیکس میں اضافہ ہوا ہے ۔ بونس ایشو پر دس فی صدی اسٹامپ ڈیوٹی بڑھ جائے گی ۔ سب سے زیادہ اضافہ تمباکو کے درآمدی محصول میں ہوا ہے یعنی ۵۰ فی صدی کا ۔ اس محصول کے بڑھانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جنگ سے پہلے کے مقابلے میں سگریٹ کی قیمت کوئی ۳½ گنی بڑھ جائے گی ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس محصول کے عائد کرنے سے سگریٹ اور تمباکو کا خرچ کم ہوجائے گا ؟ ہمارے خیال میں یہ مشکوک ہے ۔ اگر خرچ کم نہیں ہوا تو ڈالر کے خرچ میں کوئی کمی نہیں آئے گی ۔ دوسرے اس محصول کا امیروں کی بہ نسبت غریبوں پر زیادہ بوجھ پڑے گا ۔ یہ کارروائی ڈالر کی فضول بربادی کو روکنے کے لیے

کی گئی ہے۔ تمباکو زیادہ تر امریکہ ہی سے آتا ہے۔ ٹیکسوں کے اضافوں سے ۱۰ کروڑ ۶۰ لاکھ کی آمدنی کی توقع اس سال کی جاتی ہے اور پورے سال میں ۱۴ کروڑ ۹۰ لاکھ کی مجموعی بچت ۴۴ کروڑ ۸۰ لاکھ سے بڑھ کر ۴۷ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ اخراجات کے سلسلے میں مزید ۲ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ اس سال تعلیم پر خرچ کیے جائیں گے۔ اخراجات زندگی کی امداد میں مزید ۵ کروڑ پونڈ کا صرفہ ہوگا۔ اس مد میں مجموعی طور پر ۲۴ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ خرچ ہوں گے۔ اس سلسلے میں غذا کپڑے اور جوتے وغیرہ کی قیمت کو کم کرنے کے لیے سرکاری امدادی رقم مہیا کی جائے گی۔ صحت عامہ کے لیے بھی اخراجات کی مد رکھی گئی ہے جس میں مقامی اسپتالوں کو قومی نگرانی کے تحت لانے کا خرچ بھی شامل ہے۔

بجٹ کا سب سے امید افزا پہلو ۲۴ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ کے عظیم اخراجات ہیں جو سماجی امور کے لیے نکالے گئے ہیں۔ ضروری اشیا کی قیمتوں کو گھٹانے کے لیے سرکاری امدادی رقم مہیا کی جائے گی اور کم آمدنیوں پر سے ٹیکس کا بوجھ ہٹا دیا جائے گا۔ ان کارروائیوں سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ دوسری طرف فوقی محصول کے ذریعے اور بڑی آمدنیوں پر زیادہ ٹیکس عائد کر کے خسارے کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سرکاری مالیات اور صنعتوں کے فائدے کے لیے سستے زر والی پالیسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ ضروری اشیا کی قیمتوں کے سلسلے میں سرکاری امدادی رقم مہیا کرنے سے افراط زر کے رجحانات کم ہوں گے، تمباکو پر محصول عائد کر کے ڈالر کے بے جا اخراجات روک دیے گئے ہیں اس سے خارجی ادائگی میں بھی توازن قائم ہوگا اور جنگ کے زمانے والی صورت حال دور ہوگی۔ منقسم منافعوں پر صرف ۲۱½ فی صدی تک ٹیکس بڑھایا گیا ہے جو کم ہے۔ بونس حصوں پر بھی توقع سے کم ہی ٹیکس لگایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جو جذبہ کام کرتا رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ یعنی نفع اندوزی کے مواقع کو زیادہ نقصان نہ پہنچایا جائے۔ جب تک صنعت کی بنیاد ذاتی کاروبار پر قائم ہے اس وقت تک اس قسم کے رویئے سے نجات پانا بھی غیر ممکن ہے۔ یہ بجٹ ذاتی کاروبار کے اصول کو مسلمہ اصول مان کر اس کے دائرے کے اندر ہی عام لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ چناں چہ اس میں ذرائع پیدائش کو قومی ملکیت کے تحت لانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹاک ایکسچینج پر اس کا کوئی خراب اثر نہیں پڑا۔ اسے اشتراکی بجٹ تو بالکل نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی مفروضوں سے باہر جانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اور الٹا انھیں پر مبنی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس محدود دائرے کے اندر اس میں حتی الامکان سماجی امور پر اخراجات کی مد نکال کر اور کم آمدنی والوں کو فائدہ پہنچا کر عوام دوستی کا ثبوت دینے کی کوشش کی گئی ہے جو بہر حال قابل ستائش ہے۔

ٹوری رجعت پرستوں کی طرف سے اخراجات کی مد پر جو اعتراضات ہوئے ہیں وہ بالکل بے تکے ہیں۔ ان لوگوں نے فوجی اخراجات کی کمی پر واویلا مچایا ہے۔ اور سماجی امور پر اخراجات کی جو مد نکالی گئی ہے اس کی مذمت کی ہے۔ ہماری رائے میں

اُن کے اعتراضات کا تفصیلی جواب دینا تضیع اوقات کے مرادف ہے۔

جینوا کانفرنس:-

اس وقت جینوا میں "تجارت اور روزگار پر اقوام متحدہ کی کانفرنس" کی تمہیدی کمیٹی کے اجلاس ہو رہے ہیں جن میں ۱۸ قوموں کے کئی سو مندوبین شریک ہیں۔ سوویت یونین کو چھوڑ کر دنیا کے تقریباً تمام بڑے بڑے تجارتی ممالک کے نمایندے وہاں موجود ہیں۔ ان ممالک کے نام یہ ہیں:۔ آسٹریلیا، بلجیم، برازیل، کنیڈا، چیلی، چین، کیوبا، چیکوسلاوکیہ، فرانس، ہندستان، لبنان، لگزمبرگ، نیدرلینڈ، نیوزی لینڈ، ناروے، جنوبی افریقہ، انگلستان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔

اس کانفرنس کی تیاریاں بہت دنوں سے جاری تھیں اور امریکہ اس میں سب سے زیادہ حصہ لے رہا ہے۔ اس کی ابتداء دراصل "معاہدہ امداد باہمی" سے ہوتی ہے جو ۱۹۴۲ء میں برطانیہ اور امریکہ کے درمیان ہوا تھا۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں امریکہ اور برطانیہ کے درمیان جو قرضہ معاہدہ ہوا تھا اس میں بھی عالمگیر تجارتی کانفرنس کا ذکر ہے۔ پھر اس کے بعد گزشتہ کرسمس میں اس کانفرنس کے متعلق لندن میں کچھ ابتدائی بات چیت ہوئی اور اب اس کی تمہیدی کمیٹی کی نشستیں ہو رہی ہیں۔ لندن کانفرنس میں بین اقوامی تجارتی منشور کے متعلق کئی باتوں پر رضامندی ہو گئی تھی۔ اس منشور کے پانچ خاص مقاصد مقرر کیے گئے ہیں۔

تمام ملکوں میں روزگار کی سطح کو بلند رکھنا، اُن کی معاشی ترقی میں مدد پہنچانا۔ بین اقوامی تجارت کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان کو دور کرنا۔ تمام ملکوں اور قوموں کے مفاد کے پیش نظر حکومتوں کی تجارتی پالیسی کو قاعدوں اور ضابطوں کا پابند بنانا۔ خام اشیا کی خرید فروخت کے لیے معاہدوں اور راضی ناموں کے قاعدے مرتب کرنا۔ ایک بین اقوامی انجمن تجارت کا قیام عمل میں لانا تاکہ اس سے تجارتی معاملات میں تعاون اور اشتراک عمل پیدا کیا جا سکے۔

موجودہ کانفرنس کے دو مقاصد ہیں۔ ایک تجارتی منشور مرتب کرنا جو اقوام متحدہ کی کانفرنس میں پیش کیا جائے گا اور جو قومیں موجودہ کانفرنس میں شریک ہیں ان کے درمیان ایک تجارتی عہدنامہ وجود میں لانا۔ ہر قوم کے وفد نے ایسے مال و اسباب کی ایک فہرست تیار کی ہے جن پر وہ قوم دوسری قوموں سے محصولات کی تخفیف کرانا چاہتی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ محصولات کی اس تمام تخفیف کو ایک عام تجارتی عہد نامے میں شامل کر لیا جائے اور ایک کمیٹی بنا دی جائے جو بین اقوامی انجمن تجارت کے قیام تک تجارتی قاعدوں کی پابندی کرائے۔

گزشتہ مباحثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کانفرنس کی کامیابی کی سو فی صدی امید نہیں کی جا سکتی اور درمیان

میں کئی رکاوٹیں حائل ہیں۔ کانفرنس کے جلد ختم ہونے کی بھی توقع نہیں ہے اس لیے کہ کئی اہم معاملات پر زبردست اختلافات پائے جاتے ہیں۔

امریکی مبر ولیبرس نے جو آج کل برطانیہ میں ہیں، اس کانفرنس کی ناکام یابی کی پہلے ہی پیشین گوئی کر دی ہے کہ ڈگیری کے محصولات کے بارے میں جو مختلف ملکوں کے مندوبین کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے اس کی رفتار عام طور پر بہت سست ہے بہت سے مندوبین نے اب تک ان اشیا کی فہرست بھی نہیں مرتب کی ہے جن پر وہ محصولات کی تخفیف چاہتے ہیں، دوسری قوموں کو تخفیف دینے میں بھی وہ تذبذب اور تساہلی سے کام لے رہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کام یابی آسان نہیں۔ برطانوی اور دوسرے مندوبین نے یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ ہر ملک سے علاحدہ علاحدہ گفت وشنید کر لینے کے بعد فہرست پیش کی جائے۔ امریکہ اور ہندستان اپنی اپنی فہرست پیش کرنے کے لیے رضامند اور تیار ہیں۔ امریکہ کی آمادگی کے اسباب ظاہر ہیں۔ تخفیف محصولات اور آزاد تجارت کی صورت میں امریکہ سے زیادہ کسی ملک کو تجارتی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے کہ اس کی قوت پیدائش اس وقت دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ ہے۔

ایک اور مسئلے پر کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ محصولات کی تخفیف سے پہلے ہی تجارتی منشور کی تفصیلات طے ہو جائیں لیکن برطانوی اور دوسرے مندوبین کا خیال ہے کہ محصولات کی تخفیف کے بعد ہی منشور کی تفصیلات کا تعین ممکن ہے۔ اختلاف کی ایک بات یہ بھی ہے کہ امریکہ تجارتی منشور میں کسی قسم کی لچک کو پسند نہیں کر سکتا۔ لیکن آسٹریلیا کے مندوبین اس میں لچک رکھنا چاہتے ہیں تاکہ مستقبل میں دقت نہ ہو۔

اختلاف کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ اور فرانس اپنی اپنی شاہی ترجیحات کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ فرانسیسی مندوب نے تو اس کی بجائے "دوملکی معاہدے" پر زور دیا ہے۔ برخلاف اس کے امریکہ شاہی ترجیحات کو بالکل ختم کر دینے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ تاکہ اس کی مصنوعات برطانوی اور فرانسیسی مقبوضات و نوآبادیات میں بہ آسانی داخل ہو کر برطانیہ اور فرانس کا مقابلہ کر سکیں۔

سر اسٹیفورڈ کرپس نے ۱۱ر اپریل کو ایک پریس کانفرنس میں صاف طور پر کہہ دیا کہ اگر امریکہ اپنے محصولات میں ۵۰ فی صدی کمی کر دے تو بھی وہ شاہی ترجیحات کا بدل نہیں ثابت ہو سکتا۔ لندن میں نوآبادیاتی ممالک سے بات چیت کے دوران میں یہ طے ہوا تھا کہ ہر حال میں کم سے کم تھوڑی سی شاہی ترجیحات ضرور برقرار رکھی جائیں تاکہ آیندہ اگر ضرورت پڑے تو از سر نو قائم کرنے کی بجائے انھیں کو وسیع کر دیا جائے گا۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ کانفرنس کی کام یابی کی زیادہ امید نہیں ہے۔ سرمایہ دار ممالک کے تجارتی مفاد میں اس قدر اختلاف اور تصادم موجود ہے کہ ہر قدم پر اس کا اظہار ہوتا ہے۔ آزاد بین اقوامی تجارت کا امریکی خواب کہیں بے تعبیر نہ رہ جائے۔

مسائل حاضرۂ ہندستان

اسٹرلنگ سے رُپی کا قطع تعلق

از: ——— ابوسالم ایم۔ اے (علیگ)

پچھلے مہینے ہندستان کی مرکزی اسمبلی نے رزرو بنک قانون میں ایک ترمیم پاس کی ہو جسے بجا طور پر ملک کے اخبارات نے معاشی آزادی کے اعلان سے تعبیر کیا ہو۔ مباحثے کے دوران میں ایک ممبر نے کہا یہ فیصلہ "ہندستان کی معاشی آزادی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہو"۔ خود ممبر مالیات نے اس اقدام کو بہت زیادہ اہم قرار دیا ہو کیوں کہ اس سے سکے کی حیثیت سے رُپی کی آزادی کا اعلان ہوتا ہو۔ اس ترمیم کی رُو سے بنک کے قانون کی دفعہ ۴۰۔۴۱ میں یہ ردّو بدل کیا گیا ہو کہ اب بجاے اس کے کہ رزرو بنک متعینہ قیمتوں پر صرف اسٹرلنگ خریدنے اور بیچنے کی ذمے داری لے اُسے ہر بیرونی سکّہ خریدنا اور بیچنا ہوگا (اسٹرلنگ خریدنے اور بیچنے کی ذمے داری اس لیے اب تک اس پر عاید تھی کہ معیار مبادلہ اسٹرلنگ قائم رکھا جاسکے) یہ فیصلہ کہ یہ خرید و فروخت کن شرائط کے ماتحت ہوگی حکومت ہند کے ہاتھوں میں ہوگا۔ قانون میں دو ایک اور چھوٹی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ خارجی زر کی خرید و فروخت میں اب تک بنک براہ راست پبلک سے تعلقات رکھ سکتا تھا۔ اب خرید و فروخت کے یہ معاملات صرف ان لوگوں کے ساتھ کیے جاسکیں گے جنھیں اس بات کا حق دیا گیا ہو کہ وہ مقدار جو کوئی فرد رزرو بنک سے خرید سکتا ہو کم سے کم دو لاکھ ہونی چاہیے۔ اس سے پہلے یہ رقم محض ایک لاکھ ۲۳ ہزار تھی۔ اس ترمیم سے ایک بہت پرانے تعلق کا خاتمہ ہوتا ہو۔ اور اس لیے اس پر مختصراً ایک نظر ڈال لینا دلچسپی سے

خالی نہ ہوگا۔ عملاً اسٹرلنگ سے رُپے کا تعلق ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء میں ہی قائم ہوگیا تھا۔ حکومت ہند نے اُس سال بعض ایسے انتظامات کیے تھے جن کے تحت رُپے کی قیمت ایک شلنگ چار پنس قرار پائی تھی ویسے نام کے واسطے یہ کہا جاتا تھا کہ ہندستان میں سونے کا معیار مبادلہ رائج ہے۔ اس وقت خود اسٹرلنگ کا تبادلہ سونے سے ہوسکتا تھا۔ اس لیے یہ فریب کچھ دنوں تک کام دیتا رہا حال آں کہ عملاً رُپیہ اسٹرلنگ کے ہی تابع تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں چاندی کی قیمت بڑھنے لگی تو کچھ عرصے کے لیے ہندستان عملاً چاندی کے معیار کے تحت آگیا کیوں کہ اس زمانے میں رُپے کی بیرونی قیمت کا تعین چاندی کی قیمت سے ہونے لگا تھا۔ ۲۱-۱۹۲۰ء میں سونے کے معیار مبادلہ کو پھر سے رواج دینے کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے رُپے کی قیمت ۲ شلنگ سونے کے برابر متعین کردی گئی۔ یہ کوشش ناکام رہی اور کچھ عرصے کے لیے رُپے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ ۱۹۲۷ء میں فلز کے معیار مبادلہ (Bullion Exchange Standard) کو رواج دینے کی کوشش ہوئی۔ اسٹرلنگ کا اب پھر سونے سے مبادلہ ہوسکتا تھا رُپے کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس قرار پائی اور ایک بار پھر اسٹرلنگ سے ناتہ قائم ہوگیا۔ یہ تعلق اب بھی اصولاً اور نظری حیثیت سے بالواسطہ تھا۔ کہنے کو ہندستانی رُپے کا تعلق سونے سے تھا، لیکن عملاً اسے اسٹرلنگ کی غلامی کرنی پڑتی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں اس فریب کے پردے کو چاک کردیا گیا اور اصل حقیقت سامنے آگئی۔ ہوا یہ کہ انگریزی حکومت سونے کے معیار کو ترک کردینے پر مجبور ہوگئی تھی اور اس لیے بالواسطہ تعلق کا مذاق اب قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اب رُپے کی قیمت پھر ایک شلنگ چھ پنس قرار پائی۔ ۱۹۳۵ء میں رزرو بنک قائم ہوا تو اسی صورت حال نے دائمی صورت اختیار کرلی۔ بنک پر فرض عاید کیا گیا کہ اسٹرلنگ کے ساتھ رُپے کی شرح مبادلہ کو برقرار اور مستحکم رکھنے کی ذمے داری لے۔ اس مقصد کے لیے اسے متعین قیمتوں پر اسٹرلنگ کی غیر محدود خرید و فروخت کا کام سپرد کیا گیا۔ اس کام کو موثر طریقے پر انجام دینے کے لیے اسٹرلنگ اثاثے کی ایک مقدار انگلستان میں اکٹھا کی گئی۔

ہندستان کے نظام زر کی تاریخ میں اسٹرلنگ کے ساتھ رُپے کی شرح مبادلہ کے سوال پر جتنی تند و تیز بحثیں ہوئی ہیں ایسا شاید ہی کسی اور سوال پر ہوئی ہوں۔ رُپے کا اسٹرلنگ سے زبردستی کا تعلق مدتوں تک ہندستانی قوم پرستوں کے اعتراضات کا نشانہ بنا رہا۔ اعتراض یہ تھا کہ اس طرح رُپے کی تقدیر اسٹرلنگ سے وابستہ ہوجاتی ہے۔ ایک سکے کو دوسرے سے متعلق کردیجیے تو لازمی طور پر دونوں ملکوں کے مصارف اور قیمتوں کے ڈھانچے میں بھی ایک ربط قائم ہوجاتا ہے اور اس طرح اس ملک کی معاشی زندگی میں اس پابندی سے عدم استحکام کا عنصر پیدا ہوجاتا ہے جس سکے سے اس طرح کا تعلق قائم کردیا جاتا ہے اس کی قیمت کی ہر تبدیلی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اسٹرلنگ سے تعلق کے خلاف یہی شکایت تھی کہ اس طرح رُپیہ ہر اس تبدیلی کا شکار بن جاتا ہے جو اسٹرلنگ کو جھیلنی پڑتی ہے۔ اس تعلق کی حمایت میں بھی ہمیشہ ایک بات پر زور دیا گیا ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ہندستان کی

بیرونی تجارت کے سلسلے میں بیش تر لین دین اسٹرلنگ ہی کے ذریعے ہوتی تھی۔ اسٹرلنگ اور رُپے کی شرح مبادلہ کا قانونی استحکام خارجی تجارت میں بہت معاون ہوتا تھا۔ رُپے کی بیرونی قیمت کا استحکام بلاشبہ بیرونی تجارت کے لیے مفید تھا۔ لیکن ہندستانی رائے عامہ اس فائدے کو غیر مناسب اہمیت دینے کو تیار نہ تھی۔ ملک کی معاشی فلاح و بہبود کے لیے بیرونی تجارت سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ اس انتظام سے اندرونی تجارت اور اندرونی معاشی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ زر سے متعلق صحیح پالیسی کے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ سکّے کی بیرونی قیمت مستحکم رکھی جائے اگر اس سے زیادہ نہیں تو اتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ اس نظام میں اتنی لچک ہو کہ وہ ملک کی اندرونی معاشی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ آزاد رُپے کا فائدہ یہ ہوتا کہ غیر ملکی قیمتوں کی تبدیلیوں کے اثرات کو رُپے کی شرح مبادلہ میں ردّ و بدل کر کے روکا جا سکتا تھا۔ اسٹرلنگ کے ساتھ جوڑ دیے جانے سے رُپے کو یہ آزادی نہیں رہی اور ہمارا نظام زر اس لچک کی خصوصیت سے محروم ہو گیا جو ایک اچھے نظام زر کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اسی وجہ سے ۱۹۳۱ء سے ہی ملک کے واقف کار لوگوں اور ماہرین معاشیات کا یہ مطالبہ تھا کہ رُپے کو آزاد کر دیا جائے۔ رزرو بنک کے قیام کے وقت جب اس سے متعلق قانون پر غور و خوض ہو رہا تھا تو اس مطالبے نے پھر زور پکڑا۔ ہندستانی رائے عامہ کو یہ شکایت رہی کہ بنک کو یہ حق دیے بغیر کہ وہ رُپے کی بیرونی شرح کا فیصلہ کرے اس سے بیرونی قیمت کے استحکام کا مطالبہ کرنا ایک بار پھر خارجی تجارت کی ضرورتوں کو غیر مناسب اہمیت دینے کے مرادف ہوگا۔ لیکن ان اعتراضات کی شنوائی نہیں ہوئی۔ ہندستان اس وقت مقروض تھا اور انگریزی حکومت اپنے قرضوں کی واپسی کے بارے میں سود یا اصل پر کسی قسم کا جوا کھیلنے کو تیار نہ تھی۔ بیرونی شرح مبادلہ کا استحکام ملک معظم کی حکومت کے مفاد کی خاطر ضروری تھا۔ اس سے ہندستان کی معاشی زندگی کو اگر نقصان پہنچتا تھا تو مجبوری تھی۔ اشک شوی کے طور پر رزرو بنک ایکٹ کی ترتیب کے وقت یہ بات ایکٹ کی تمہید میں کہہ دی گئی تھی کہ بنک جس وقت اس فیصلے پر پہنچے کہ بین اقوامی سکّے کی صورت حالات اب ایسی ہو گئی ہے کہ حکومت ہند رُپے کے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتی ہے تو اسے گورنر جنرل اور ان کی کونسل کے سامنے اپنی تجویزیں پیش کر دینے کا حق حاصل ہوگا۔

رزرو بنک اپنے قیام اور اعلان جنگ سے قبل کے پانچ چھ سال کے وقفے میں یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ پھر جنگ شروع ہو گئی اور بین اقوامی نظام زر کا مستقبل پھر غیر یقینی ہو گیا۔ ادھر ملک میں اسٹرلنگ اور رُپے کے تعلق کے خلاف شکایت کا ایک اور سبب پیدا ہو گیا ہے۔ اوپر ہم کہہ چکے ہیں کہ زر کی پالیسی کے تعین میں سب سے زیادہ اہمیت رُپے کی بیرونی قیمت کے سوال کو دی جاتی رہی ہے۔ یہ بات کہ رُپے کی اندرونی قیمت کو بھی قابو میں رکھنا چاہیے۔ توجہ کے لائق نہیں سمجھی گئی۔ چناں چہ دنیا کے اور سارے مرکزی بنکوں کے قاعدے کے برخلاف جو اپنے ملکوں کی اندرونی قوت خرید کے

استحکام پر پورا دھیان دیتے ہیں۔ رزرو بنک اس سوال کو نظرانداز کر سکتا ہے۔ رزرو بنک سے جنگ کے دوران میں برطانوی حکومت نے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور ہندستان کو افراط زر کا شکار ہونا پڑا۔ برطانوی حکومت نے جنگ کی ضرورتوں کے لیے جو اشیا اور خدمات خریدیں وہ نقد قیمت پر یا اشیا کے مبادلے میں نہیں بلکہ ہندستانی مال اور خدمات کی قیمت کی ادائگی کا یہ طریقہ نکالا گیا کہ حکومت ہند کو اسٹرلنگ تمسکات دیے گئے۔ ہمارے محفوظ سکوں میں اسٹرلنگ تمسکات کو جو جگہ حاصل تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ ان تمسکات کی بنیاد پر حکومت ہند نوٹ چھاپتی رہی اور اس طرح ملک میں نوٹوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ چناں چہ اس ترمیم پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر منو صو بیدار نے کہا تھا کہ رزرو بنک کی "ان دو دفعات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملک سے قیمتی اشیا کی بہت بڑی مقدار برآمد کر دی گئی اور ہمیں سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا"۔ اسٹرلنگ اور رُپے کے تعلق کے حامیوں کا کہنا ہے کہ افراط زر کا سبب قانون اور رزرو بنک کی یہ دفعات نہیں تھیں۔ اپنی دلیل کی تائید میں وہ ارجنٹائن کی مثال پیش کرتے ہیں جہاں کے سکے کو اسٹرلنگ سے کوئی واسطہ نہیں پھر بھی وہاں اسٹرلنگ فاضلات کی ایک معتدبہ رقم جمع ہو گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس تعلق کے بغیر بھی ہمارا ملک افراط زر کا شکار ہو سکتا تھا۔ حکومت ہند اگر برطانوی حکومت کی ضرورتوں کی فراہمی کی اسی بڑے پیمانے پر ذمے داری لے لیتی تو ملک کے اندر قیمتوں کا اضافہ اور افراطِ زر کی مصیبت ناگزیر ہو جاتی۔ اس لیے کہ ہمارے ذرائع پیداوار اتنی زیادہ مانگ پوری ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ جنگ کے دوران میں افراط زر کی جو مصیبت ملک پر نازل ہوئی وہ محض اسٹرلنگ سے تعلق کا نتیجہ نہ تھی۔ اس کی پشت پر ہندستان کی سیاسی غلامی کارفرما تھی جس نے حکومت ہند کو ہندستانی عوام کے مفاد کی طرف سے مجرمانہ غفلت برتنے کا موقع دیا۔ لیکن تجربہ یہی ہے کہ پچھلی جنگ کے دوران میں افراطِ زر، رزرو بنک کے قانون کے انھیں دفعات کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس لیے اسٹرلنگ سے تعلق کی شکایت اور وسیع ہو گئی اور یہ مطالبہ بہت زور پکڑنے لگا کہ اسٹرلنگ سے تعلق ختم کر کے رُپے کو آزاد کرا لیا جائے تاکہ سکّے کے متعلق ہماری پالیسی آزاد ہو سکے۔

یہ پرانا مطالبہ اب پورا ہو گیا ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ رُپے کو اس طرح "آزاد" کرانے کا سہرا موجودہ حکومت کے سر نہیں بلکہ اس کے پیش روؤں کے سر ہے جنھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہندستان برٹن ووڈز اسکیم میں شریک ہوگا اور اس لیے اس نے بین اقوامی مال فنڈ کی رکنیت بھی قبول کر لی تھی جو دنیا کے مختلف سکوں کی بیرونی شرح مبادلہ میں استحکام قائم کرنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ رکنیت کے قبول کر لینے کا یہ منطقی تقاضا تھا کہ رزرو بنک کے ایکٹ میں مذکورہ بالا تبدیلیاں کر دی جائیں۔ ان تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اب رزرو بنک دوسرے غیر ملکی سکوں سے طے شدہ شرحوں پر رُپے کا مبادلہ کر سکے گا۔ بین اقوامی فنڈ کے تمام ممبروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے سکّے کی بیرونی قیمت کا سونے کی شکل میں تعین کر کے فنڈ کو

اطلاع دیں۔ ایسی صورت میں اسٹرلنگ سے قانونی تعلق قائم رکھنا غیر ضروری بھی تھا اور نامناسب بھی۔

اس طرح ہمیں جو آزادی حاصل ہوئی ہے اس کی نوعیت پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ اب تک رُپے کی بیرونی قیمت کا تعین زیادہ تر برطانوی ارباب اقتدار کے مفاد کے مطابق ہوتا رہا ہے اب پہلی بار حکومت ہند کو اس بات کا حق حاصل ہوگیا ہے کہ ہندستان کے مفاد کی روشنی میں وہ جو فیصلے مناسب سمجھے کرے۔ اسٹرلنگ سے تعلق قائم رکھنے سے بڑا نقصان یہ تھا کہ اسٹرلنگ کی قیمت میں ہر ردّ و بدل رُپے کو بھی متاثر کردیتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہندستان کی معاشی ضرورتوں کا خیال کیے بغیر رُپے کی بیرونی قیمت میں ردّ و بدل ہوسکتا تھا۔ اس بندھن سے چھٹکارا پانا ملک کے لیے بجا طور پر بہت مفید ہوسکتا ہے۔ اس فیصلے کے بعد ہم چاہیں تو دوسرے ملکوں کے ساتھ رُپے کی شرحِ مبادلہ کو بدل سکتے ہیں۔ اسٹرلنگ کے علاوہ دوسرے سکّوں کے ذریعے لین دین شروع کرسکتے ہیں اور چاہیں تو یہ بھی آزما سکتے ہیں کہ رُپیہ بالکل آزاد ہوکر عالمگیر بازار میں اپنے لیے کیا قیمت حاصل کرسکتا ہے۔ عملاً ہم نے سہولت کے خیال سے اسٹرلنگ اور رُپے کے درمیان پرانی شرحِ مبادلہ کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ ہمیں جو حق ملا ہے وہ کچھ ایسی بڑی چیز نہیں ہے اور اس کی کوئی بنیادی اہمیت نہیں لیکن یہ سمجھنا غلطی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں معیارِ طلا کے ترک ہوجانے کے بعد سے اور ۱۹۲۷ء سے قبل کے کئی سال بعد رُپیہ پہلی بار آزاد ہوا ہے۔ آج بھی رُپے کی بیرونی قیمت ایک شلنگ چھ پنس ہی ہے لیکن اب ہمارے لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ ہم اس شرح کو ہر حال میں باقی رکھیں۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ یہ شرح ہمارے ملک کے مفاد کے لیے موزوں نہیں تو ہم اسے آج ترک کرسکتے ہیں۔

لیکن ہم نے رُپے کی اس آزادی کو زیادہ نفع بخش بنانے کی خاطر بعض پابندیوں کو خود سے قبول کرنے کا بھی فیصلہ کرلیا ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی چاہے کہ رُپے کو جس طرح چاہے دنیا کے دوسرے سکّوں کی شکل میں بدل لے تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس طرح کے مبادلے کی راہ میں بہت ساری رکاوٹیں حائل ہیں۔ اسی طرح حکومت ہند کو یہ حق نہیں ہوگا کہ جب وہ چاہے اعلان کردے کہ آج سے رُپے کی بیرونی قیمت یہ ہوگی اور وہی قیمت رواج پاجائے۔ بین اقوامی مالی فنڈ کی ممبری قبول کرکے ہم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ شرحِ مبادلہ میں من مانی تبدیلی لازماً مفید نہیں ہوتی۔ تجربے سے ہم نے بھی ساری دنیا کی طرح یہ سبق سیکھ لیا ہے کہ سکّے کی بیرونی قیمت میں ردّ و بدل کرکے اپنی معاشی زندگی کو عام دنیا کی معاشی زندگی سے بے تعلق کردینے کی کوشش نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ ٹھیک جس طرح پچھلی کساد بازاری کے زمانے میں ہوا تھا۔ اس وقت ہر ملک نے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اپنے سکّے کی بیرونی قیمت کو گھٹانا شروع کردیا تھا اور نتیجۃً بین اقوامی معاشی لین دین میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی ہوگئی تھیں۔ ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کسی بھی ملک کا سکّہ قطعاً آزاد نہیں ہوتا۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں سائنس نے اس کی طنابیں بہت چھوٹی کردی ہیں اور ہماری معاشی زندگی میں غیر معمولی طور پر "انحصار باہمی" پیدا ہوگیا ہے جن کے

تحت ہر سکہ دوسرے سکوں سے غیر مرئی طور پر وابستہ ہوتا ہے۔ اسی احساس نے ہمیں اس بات پر آمادہ کر دیا ہے کہ ہم بین اقوامی فنڈ کی شرکت کو قبول کر لیں۔ ہماری طرح بیش تر ممالک نے اپنے نظامِ زر کو اس فنڈ کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلانا منظور کر لیا ہے۔ یہ فنڈ دراصل دو اصولوں کے درمیان کا راستہ تلاش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ پرانے معیار طلا کے مطابق سکے کی بیرونی قیمت کم و بیش بے لچک ہوتی ہے اور ایسی صورت میں کسی ایک ملک میں اگر معاشی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو وہ لازماً تمام دوسرے ممالک پر اثر ڈالتی ہیں۔ بیرونی قیمت کے متعلق دوسرا طرزِ عمل یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کافی لچک رکھی جائے اور اس مقصد کے لیے بیرونی قیمت کے سوال کو کسی معروضی معیار کا پابند نہ کیا جائے اور مبادلے کی شرحوں کو یک سر آزاد رکھا جائے (اس دوسری صورت کے نقائص کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں) بین اقوامی مالی فنڈ اور معیار طلا کے درمیان فرق یہ ہے۔ موخر الذکر کے تحت سکوں کی بیرونی قیمتیں سونے کی شکل میں متعین ہوتی تھیں اور مختلف اثرات کی بنا پر جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی تھیں وہ اندرونی قیمتوں کو متاثر کرتی تھیں اور ہر ملک کی اندرونی معاشی زندگی ان بیرونی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی تھی۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے بین اقوامی مالی فنڈ نے یہ طے کیا ہے کہ تمام ممالک جو فنڈ کے ممبر ہیں بعض حدود کے اندر ہی رہ کر اپنے سکوں کی بیرونی قیمت میں ردّ و بدل کر سکتے ہیں یا سونے کی شکل میں ان کی قیمت گھٹا بڑھا سکتے ہیں تاکہ اگر بیرونی ادائے گی کے توازن میں کوئی بنیادی نقص پیدا ہو گیا ہو تو وہ دور ہو سکے۔ بیرونی قیمت میں دس فی صدی تک کی تبدیلی کا ہر ملک کو حق ہوگا۔ اگر مزید تبدیلی کی ضرورت ہو تو اس کے لیے فنڈ کی اجازت ضروری ہوگی۔ ان انتظامات کے ذریعے فنڈ کی کوشش یہ ہے کہ ایک طرف تو سکوں کی بیرونی قیمتوں میں استحکام باقی رکھا جائے۔ دوسری طرف تجارتی فوائد کے حصول کے لیے ان شرحوں کے ردّ و بدل کو قابو میں رکھا جائے۔ ان طریقوں سے امید کی جا سکتی ہے کہ خارجی تجارت اس طرح ترقی کرے گی کہ ہر ملک کو فائدہ ہوگا۔ ہندستان نے اس وقت جو پابندیاں قبول کی ہیں وہ اسی بڑے مقصد کے لیے کی ہیں اور اس لیے بھی کہ اس کی یہ معاشی آزادی واقعی اس کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔

مسائلِ حاضرہ (ہندستان)

صوبائی حکومتوں کی آمدنی اور خرچ

از: ————— ابو سالم۔ ام۔ اے (علیگ)

پچھلے ڈیڑھ دو مہینے کے اندر صوبجاتی حکومتوں نے اپنے اپنے بجٹ پیش کر دیے ہیں۔ یہ جنگ کے بعد زمانۂ امن کے پہلے بجٹ ہیں اور کئی سالوں کے وقفے کے بعد پھر عوامی وزارتوں نے بجٹ تیار کیے ہیں لیکن اس میں ایک استثنیٰ بھی ہو۔ پنجاب کا بجٹ جو سب سے بعد میں شائع ہوا، وزارت نے پیش نہیں کیا تھا بلکہ صوبے کے گورنر نے اس کی تصدیق کر دی۔ کیوں کہ افسوس ناک خانہ جنگی نے صوبے کی انتظامی مشینری کو معطل کر رکھا ہو باقی صوبوں میں سے پانچ کے بجٹ میں گھاٹا اور باقی پانچ صوبوں کے بجٹ میں نفع دکھایا گیا ہو۔ اول الذکر گروپ میں سب سے زیادہ خراب ریکارڈ بنگال کا ہو جس کے بجٹ میں تقریباً ۱۲ کروڑ روپے کا گھاٹا دکھایا گیا ہو۔ لیکن صوبوں نے جو منافع دکھایا ہو وہ حقیقتاً کوئی قابلِ لحاظ بات نہیں ہو۔ سندھ کے بجٹ میں نفع دکھلایا گیا ہو لیکن مالیاتی سکریٹری کے بہ قول اس بجٹ نے دراصل ایک بڑے خسارے پر پردہ ڈال رکھا ہو جس کی مقدار ۸۰ لاکھ کے لگ بھگ ہو کیوں کہ آمدنی کی مدوں میں ایک وہ مد بھی شامل ہو جس کی نوعیت مختلف ہو۔ اور یہ زمینوں کی فروخت کی آمدنی سے تعلق رکھتی ہو۔

جنگ کے دوران میں صوبوں کی آمدنی و مصارف میں بہت کافی اضافے ہوئے تھے۔ آمدنی کی بہتات میں اب بھی کمی واقع نہیں ہوئی ہو۔ ذیل کے اعداد دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

	سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء بجٹ	سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء بجٹ
مدراس	۱۹۱۳	۴۸۴۹	۴۸۲۴
بمبئی	۱۲۴۵	۳۰۲۰	۳۸۹۱
بنگال	۱۲۷۷	۴۲۵۰	۴۷۶۸
یو۔پی	۱۲۸۰	۲۹۱۵	۴۰۱۳
سی۔پی	۴۲۷	۹۴۹	۱۳۰۴
بہار	۵۲۴	۱۲۶۲	۱۶۵۸
سندھ	۳۷۰	۸۰۴	۹۲۴
آسام	۲۵۸	۵۱۵	۹۴۳
اڑیسہ	۱۸۲	۴۰۵	۶۰۹
سرحد	۱۸۰	۲۶۳	۴۲۰
پنجاب	۱۱۱۷	۲۵۸۳*	۲۴۹۴

* اس میں کچھ غیر معمولی آمدنی کی مدیں شامل ہیں۔

لیکن آمدنی کی یہ فراوانی دراصل ایک فریب ہے۔ پچھلے سال کے مقابلے میں اس سال کے بجٹ میں جو نمایاں اضافے نظر آرہے ہیں وہ دراصل حساب کے طریقے کی تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔ مرکزی حکومت نے صوبوں کو جو گرانٹ دی ہے اسے صوبوں نے اپنی آمدنی کے اعداد میں شامل کرلیا ہے۔ آمدنی میں یہ اضافے ویسے بھی کچھ دیرپا اسباب کا نتیجہ نہیں۔ مابعد جنگ کی اسکیموں کے لیے مرکزی گرانٹ اور آمدنی سے ٹیکس کی آمدنی میں جو صوبوں کو حصہ ملتا ہے اس کی مقدار میں اضافے ہوئے ہیں اور ان سے صوبوں کی آمدنی میں بہت زیادہ اضافے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مدراس کو انکم ٹیکس سے پچھلے سال محض ۴،۰۶،۸۰،۰۰۰ رُپے حاصل ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف گزشتہ سال کے بجٹ میں حکومت مدراس نے اس مد سے اس سے کافی زیادہ یعنی ۵،۲۲،۵۰،۰۰۰ رُپوں کی توقع باندھ رکھی تھی۔ کم و بیش اسی طرح کے اضافوں کی آس دوسرے صوبے بھی لگائے بیٹھے تھے۔ جنگ کے پہلے سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں انکم ٹیکس کی آمدنی سے سارے صوبوں کو ۲ کروڑ ۷۹ لاکھ رُپے تقسیم کیے گئے تھے لیکن اس سال اس طرح ۳۵ کروڑ ۱۶ لاکھ کی گراں قدر رقم صوبوں کے ہاتھ آئی۔

سوال یہ ہو کہ آمدنی کی یہ مدکہیں عارضی تو نہیں ؟ سی۔ پی کے مالیاتی ممبر نے جس اندیشے کا اظہار کیا ہو وہ کچھ ایسا بے بنیاد نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اپنی بجٹ کی تقریر میں کہا ہو کہ انکم ٹیکس کی اس آمدنی میں اضافہ کرنے سے جو مرکزی حکومت صوبوں کو تقسیم کردیتی ہو مرکزی حکومت کی مالیات پر یہ اثر پڑتا ہو کہ مرکز صوبوں کو معاشی ترقی کے کاموں کے لیے جو امداد دیتا ہو وہ کم ہوجاتی ہو۔ ابھی یہ طے نہیں ہوسکا ہو کہ انکم ٹیکس کی آمدنی سے صوبوں کو جو حصہ اگلے پانچ سال میں ملنے والا ہو وہ ملے گا یا مرکزی حکومت اس مد سے ساری آمدنی کا مطالبہ کرے گی ۔ اس حیثیت سے صوبوں کی مالیات کو ایک بڑا خطرہ درپیش ہو آنے والے دنوں میں مالی ذرائع کے ناکافی ہونے کا اندیشہ تقریباً سبھی صوبوں نے ظاہر کیا ہو اور بعض کو اس وجہ سے ترقی اور رفاہ عام کے پروگرام میں کچھ کتر بیونت بھی کرنی پڑی ہو۔

خود صوبوں کے اپنے ذرائع آمدنی کا رنگ کیا ہو؟ اس بارے میں معاشی قنوطیوں کے سارے اندیشے بلاشبہ صحیح ثابت نہیں ہوے۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہورہا ہو کہ جنگ کے بعد صوبوں کی آمدنی میں بہت کمی ہوجائے گی۔ لیکن یہ کہنا کہ ان کے اندیشے قطعاً بے بنیاد تھے صحیح نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ رجحان بالکل غیر مشتبہ طور پر صوبوں کے بجٹ میں کام کررہا ہو اور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ کچھ دنوں میں صوبوں کی آمدنی میں سے جنگ کی پیدا کردہ بہتات کم ہوجائے گی یا بالکل ختم ہوجائے گی۔ سی۔ پی کے بجٹ میں لگان کی آمدنی میں بڑی معتد بہ کمی نمایاں ہو۔ اس کا بڑا سبب موسم کی خرابی ہو لیکن یہ رجحان دوسرے صوبوں کی لگان کی آمدنی میں بھی نمایاں ہو۔ یوپی کے بجٹ میں بھی اس مد سے ہونے والی آمدنی میں کچھ کمی ہوگئی ہو۔ بمبئی میں جہاں اور دوسری مدوں سے آمدنی میں ابھی کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی ہو۔ جنگلات کی آمدنی میں کافی کمی کا اندیشہ ہو اور ڈر ہو کہ جنگ کے دوران میں درختوں کے کاٹنے میں جس لاپروائی سے کام لیا گیا ہو وہ اب رنگ دکھائے گی۔ سی۔ پی کے بجٹ میں ۴۷-۱۹۴۶ء کے نظر ثانی کیے ہوے بجٹ کے مقابلے میں اس سال ۴ لاکھ ۶۸ ہزار کی کمی ہوگئی ہو۔ یو۔ پی میں لکڑی کی مہنگائی کا بھلا ہو کہ ابھی اس مد سے آمدنی گھٹی نہیں ہو۔ لیکن اس کے علاوہ جنگلات سے آمدنی کی دوسری سبھی مدیں متاثر ہوئی ہیں۔ صوبوں کے اہم ترین ذرائع آمدنی میں اس کمی کی ہی وجہ سے بعض لوگوں نے اس پالیسی کو غلط بتایا ہو کہ شراب نوشی بند کردی جائے۔ ان کا کہنا یہ ہو کہ ایسے حالات میں جب کہ صوبوں کے سامنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے سیکڑوں کام پڑے ہوے ہیں اور ان سبھی کاموں کو بڑے پیمانے پر انجام دینے کے لیے بہت زیادہ روپوں کی ضرورت پڑنے والی ہو۔ یہ قرین دانش مندی نہیں کہ صوبجاتی حکومتیں اپنی آمدنی کے ایک بڑے ذریعے کو یوں ہاتھ سے نکل جانے دیں۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ ان کی آمدنی کے اور دوسرے ذرائع انھیں کم رقمیں مہیا کرسکیں گے۔ جہاں تک یہ دلیل اُس مالی قربانی کی مقدار پر مبنی ہو جو صوبوں نے اس اچھے کام کی انجام دہی کی خاطر برداشت کرنا منظور کیا ہو اس میں بڑا وزن ہو۔ مثال کے طور پر مدراس

کے بجٹ پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ۴۷-۱۹۴۶ء کے میزانیہ میں صوبے کی حکومت نے انسداد شراب نوشی کی خاطر ۵ کروڑ ۱۰ لاکھ کی گراں قدر رقم کا نقصان برداشت کرنا منظور کرلیا ہے۔ یو۔ پی نے اسی طرح محکمہ آب کاری سے ۴۱ لاکھ کی رقم کا نقصان برداشت کرنا قبول کرلیا ہے۔ مدراس کی حکومت نے گھوڑ دوڑ بند کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے اور اس طرح مزید ۱۸ لاکھ ۴۷ ہزار کا نقصان ہوا ہے۔ مجموعی حیثیت سے دیکھیے تو یہ رقمیں خاصی بڑی ہیں۔ ان کا مقابلہ عوام کی فلاح و بہبود کے بعض کاموں پر مجوزہ صرفے سے کیجیے تو یہ بات اور بھی گراں گزرتی ہے کہ یہ رقم اس طرح ضائع کرنے کی بجائے کیوں نہ تعمیری کاموں میں لگائی گئی۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ "افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر۔ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا" تو افراد کی اخلاقی تعمیر کا کام روپے آنے پائی کے سوالات سے کہیں بلند ہے اور اس پر اس لیے اعتراض کرنا بڑی کم عقلی ہے کہ اس طرح پانچ کروڑ یا دس کروڑ کا نقصان ہوتا ہے کیوں کہ قوم کی اخلاقی اصلاح کا کام انجام پا جائے تو اس کی قیمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ قوموں کی زندگی روٹی سے نہیں چلتی۔ یہ بات شاید اخلاقی قدروں کی اہمیت واضح کردینے کے لیے کہی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ خالی پیٹ اور اخلاقیات کا ساتھ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوجاتا ہے۔ اس حیثیت سے ہمارے صوبوں کے مالیاتی ممبروں کے مجوزہ میزانیوں کی کامیابی کا ایک ہی معیار مقرر کیا جا سکتا ہے۔ کیا انھوں نے ہندستان کے بھوکوں، ننگوں، بے گھروں، بیماروں غرض اس طرح کے تمام محروموں کی زندگی میں امید کی کوئی کرن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ لیکن اس سے قبل لگے ہاتھوں ایک اور سوال پر نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ صوبائی وزارتوں نے آمدنی کے بعض ذرائع کو گنوا کر اپنی آمدنی میں کمی کو پورا کرنے کی کیا تدبیریں نکالی ہیں؟ کیوں کہ اس کے بغیر صوبوں کے بجٹ کی آمدنی کے پہلو کا خاکہ نامکمل رہ جائے گا۔ تقریباً سبھی صوبوں کو اس طرح اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی ضرورت سے دوچار ہونا پڑا ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بعض صوبوں نے نئے ٹیکس لگائے ہیں۔ بعض نے پرانے ٹیکسوں میں اضافہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں مدراس کی حکومت قابل ستائش ہے کہ اس نے سماجی انصاف کے ایک پرانے تقاضے کو پورا کردیا ہے۔ مدتوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ زرعی آمدنیوں پر ٹیکس نہ لگانا بڑی ناانصافی کی بات ہے۔ مدراس کی حکومت نے یہ ٹیکس لگانے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس طرح صوبے کو مزید ایک کروڑ ملنے کی توقع ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ صوبے کی حکومت نے "قانون محصولات موٹر اسپرٹ" کے ماتحت ٹیکسوں میں کچھ اضافے بھی تجویز کیے ہیں اور ان سے ۳۵ لاکھ روپوں کے حصول کی توقع کی جاتی ہے۔ تفریحی ٹیکس میں بھی اضافہ کرنا طے پایا ہے لیکن اس مد سے جو آمدنی ہوگی [illegible] کی حکومت نے بھی

موٹر گاڑیوں اور موٹر کے تیل وغیرہ پر ٹیکس بڑھانا طے کیا ہے اور ان مدوں سے اسے علی الترتیب ساڑھے چار لاکھ اور ساڑھے تین لاکھ کی آمدنی کی توقع ہے۔ آسام کی حکومت نے پیشوں وغیرہ پر ٹیکس لگانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس سے دو لاکھ کی مزید آمدنی ہوگی۔ بڑے صوبوں میں یو۔ پی کی حکومت نے سیلز ٹیکس کو آیندہ کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ حال آں کہ یہ ٹیکس اب تقریباً دیگر تمام اہم صوبوں کے ٹیکس میں اپنے لیے جگہ بنا چکا ہے۔ اسی طرح حکومت نے زرعی آمدنیوں پر بھی ٹیکس لگانے سے گریز کیا ہے لیکن لگان کی شرحوں میں کچھ اضافے ہوں گے اور ان کے متعلق صوبے کے مالیاتی ممبر نے یقین دلایا ہے کہ ان سے چھوٹے زمین داروں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس طرح شاید زرعی ٹیکس کے التوا کی تلافی ہو جائے گی۔ ان صوبوں میں جنھوں نے کوئی بھی ٹیکس نہیں لگایا ہے اہم ترین صوبہ بمبئی ہے۔ سندھ نے بھی کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا ہے۔ ان تمام تفصیلات سے دراصل اس سوال پر توجہ مبذول کرانا مقصود ہے کہ کیا صوبوں نے تعمیری کاموں کے لیے اپنے مادی ذرائع سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے یا نہیں۔ صوبوں کی فی کس محصول کے اعداد پر نظر ڈالیے تو اس سوال کا جواب نفی میں ملے گا۔ سندھ کا صوبہ جو جنگ کی لائی ہوئی عارضی خوش حالی کے باوجود غریب صوبہ ہے اس بارے میں سب سے ممتاز ہے۔ وہاں فی کس محصولات کا اوسط ۱۴ رُپے ایک آنہ ہے۔ اس کے برخلاف بمبئی جیسے دولت مند صوبے میں فی کس اوسط اس سے بقدر گیارہ آنے کم ہے۔ بہار اس معاملے میں بہت پیچھے ہے۔ وہاں یہ اوسط محض ۲ رُپے سات آنے ہے۔ اگر صوبوں کے معاشی ذرائع کو محصول عائد کرنے کے لیے صحیح معیار تسلیم کر لیا جائے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ بعض بڑے صوبوں مثلاً بنگال اور یو۔ پی میں جہاں محصولات کا فی کس اوسط بالترتیب چار رُپے تین آنے اور پانچ رُپے ایک آنہ ہے محصولوں میں اضافے کی گنجائش ہے لیکن یہ بات چنداں قابل اعتراض نہیں کہ صوبوں میں باہم اس طرح کا تفاوت باقی ہے۔ صوبوں میں عوامی حکومتوں کو ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے اور اس لیے ممکن ہے کہ انھیں سارے وسائل سے کما حقہ واقف ہونے کا موقع نہ ملا ہو۔ بلا شبہ ان سے یہ جائز توقع رکھی جا سکتی ہے کہ ملک کی اصلاح کے کاموں کی انجام دہی کے لیے وہ اپنے تمام تر ذرائع کو استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔

آمدنی میں اضافے کی ایک اور صورت یہ ہو سکتی تھی کہ صوبجاتی حکومتیں قرض لیتیں۔ بار آور کاموں کے لیے قرض لینے کی حمایت میں قوی دلیلیں موجود ہیں۔ موجودہ حالات میں جب کہ افراط زر اور دوسرے حالات کی بدولت قرض پر شرح سود نسبتاً ہلکی ہوتی۔ یہ دلیلیں قوی تر ہو جاتی ہیں۔ لیکن عام طور پر صوبائی حکومتوں نے ان حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے لیکن اس سلسلے میں دو ایک مستثنیات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ آسام کی حکومت نے اپنے مختصر سے خسارے کو پورا کرنے کے لیے ٹریزری بلوں اور ذرائع و وسائل والے قرضوں کا سہارا ڈھونڈھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن دراصل اس

مشکل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش اگر کسی صوبے نے کی ہے تو وہ صوبہ متحدہ ہے۔ صوبے کی حکومت نے ۲½ کروڑ کا قرض لینا تجویز کیا ہے۔ اس طرح جو رقم حاصل ہوئی اُسے مابعد جنگ کے تعمیری کاموں کی تکمیل کے لیے خرچ کیا جائے گا۔ صوبے کا اعتبار بازار میں بہت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلے سال حکومت نے جو قرض لینا چاہا تھا وہ اعلان کے چند گھنٹوں کے اندر اندر اسے مل گیا تھا۔ دوسرے صوبوں کی حکومتوں کو بھی قرض ملنے میں دشواریاں نہ ہوتیں اس لیے یہ سوال قابل غور ہو جاتا ہے کہ اس ذریعے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا گیا۔ کچھ لوگوں نے اسے صوبوں کے بہت زیادہ محتاط ہونے کا نتیجہ سمجھا ہے۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ اس صورت سے فائدہ نہ اٹھانے کا اصل سبب یہ بات تھی کہ حکومتوں نے عام طور پر مابعد جنگ کی اسکیموں پر رقمیں صرف کرنے کا کوئی اتنا بڑا پروگرام نہیں بنایا ہے کہ وہ اس ذریعے سے کام لیے بغیر انھیں پورا کر نہیں سکتی ہیں۔ اکثر صوبوں نے جنگ کے دوران میں ان اسکیموں کی خاطر مختلف قسم کے ریزرو فنڈ قائم کیے تھے۔ اور ان مختلف فنڈوں اور حکومت ہند کی تعمیری رقم امداد نے حال کی بیشتر ضرورتوں کے پورا کر دینے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

صوبوں کی آمدنی کے مختلف ذرائع پر ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اب ہمیں صوبوں کے مجوزہ مصارف پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ اوپر ہم نے یہ سوال پوچھا تھا کہ حکومت نے غربت و افلاس، بیماری و جہالت وغیرہ مصائب کا قلع قمع کرنے کے لیے مناسب تجویزیں پیش کی ہیں یا نہیں۔ ہمیں اب اسی سوال کا جواب ڈھونڈھنا ہے۔ صوبوں کے مالیاتی ممبروں نے اپنی تقریروں میں ان کے متعلق بڑے بلند بانگ دعوے کیے ہیں لیکن عملاً انھوں نے ان کو پورا کرنے کی اتنے ہی خلوص اور جوش سے کوشش نہیں کی ہے۔ مثال کے طور پر صوبائی حکومتوں کی توسیع تعلیم وغیرہ کی اسکیموں کو لے لیجیے۔ مجموعی طور پر اس کام پر ۲۰ کروڑ کی رقم صرف کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ بہ ظاہر یہ رقم بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اسے دوران جنگ کی حوصلہ مندانہ اسکیموں اور بلند بانگ دعووں کی روشنی میں دیکھیے تو یہ اونٹ کے موئنھ میں زیرہ کے مصداق نظر آتی ہے۔ اسی صحت عامہ کے کاموں کا بڑا چرچا تھا۔ اب تمام صوبے اس مد پر آٹھ کروڑ سے زیادہ صرف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ سب سے زیادہ ناقابل اطمینان پہلو یہ ہے کہ صوبائی حکومتوں کے سامنے معاشی ترقی کا کوئی لائحہ عمل نہیں۔ تعلیم، صحت عامہ اور اس طرح کے اور بہت سے کام اہم ہیں اور ان کی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن معاشی ترقی کا کام کچھ کم اہم نہیں، ان تعمیری کاموں کے لیے روپے آخر میں اس طرح حاصل کیے جا سکتے ہیں کہ ملک کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو۔ اس حیثیت سے صوبوں کے بجٹ بہت امید افزا نہیں۔ بعض اوقات تو مجوزہ خرچ بہت ہی کم معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یو۔پی کی حکومت کی یہ تجویز کہ ٹیوب ول کے ذریعے آب پاشی پر کوئی سات لاکھ کے قریب خرچ کیے جائیں۔ صنعتی توسیع کی طرف تو مشکل سے ہی کسی کا دھیان گیا ہے۔ یو۔پی اور آسام کی اسکیموں پر نظر ڈالیے تو ہنسی آتی ہے۔ یو۔پی کی اسمبلی نے تجویز پاس کی تھی کہ سرمایہ داری ملک کے لیے ایک عذاب ہے

اور خود حکومت کو صنعتوں کی توسیع پر چند لاکھ سے زیادہ خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوی۔ کون سے کام پہلے ہونے چاہییں، اس سوال کا فیصلہ صوبجاتی وزارتوں کے تعصبات پر چھوڑ دیا گیا ہی۔ اس سلسلے میں مدراس کی حکومت کا "کھادی خبط" خاص طور سے قابل ذکر ہی۔

یہی حال مابعد جنگ کی اسکیموں کا ہی۔ اس سلسلے میں تقریباً ہر صوبے نے کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہی۔ صوبہ سرحد نے غذا کی پیداوار کے لیے ایک پنج سالہ پروگرام رائج کرنا طے کیا ہی۔ اس پر ایک کروڑ صرف ہونے والے ہیں۔ بہار کی حکومت نے ابھی اپنی اسکیمیں بھی مکمل نہیں کی ہیں۔ سی پی کی حکومت نے توسیع تعلیم کے متعلق ایک جرأت مندانہ اقدام تجویز کیا ہی کہ نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب کو جبراً اس کام میں لگایا جائے کیوں کہ اساتذہ کی کمی توسیع تعلیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی۔ لیکن صوبجاتی حکومتوں کے ان کاموں سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ہمارے ملک کی معاشی صورت حال اصلاح کی سختی سے متقاضی ہی۔ ہم تباہی کے غار کے مونھ پر کھڑے ہیں اور جلد اور سوچ سمجھ کر ایسی ترکیبیں نہ کی گئیں جو ملک کے افلاس کا خاتمہ کر دیں تو ـــــ انجام کا تصور بھی دردناک ہوگا۔ یہ صحیح ہی کہ اتنے وسیع و عریض ملک کی معاشی تعمیر کا کام جادو کی چھڑی گھما دینے سے چند لمحوں میں انجام نہیں پا سکتا۔ لیکن اس سلسلے میں جو پہلا قدم اٹھایا گیا ہی وہ کچھ بہت زیادہ پر امید نہیں کہا جا سکتا۔

ادھر صوبجاتی بجٹوں میں ایک اور رجحان کام کر رہا ہی۔ انتظامی مصارف میں جنگ کے دوران میں بہت زیادہ اضافے ہو گئے ہیں۔ اب تک رائے عامہ کو یہ شکایت رہی تھی کہ ملک کی انتظامی مشینری مصرفانہ ہی۔ جنگ کے بعد کے پہلے سال میں اس رجحان کے بدل جانے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ تنخواہوں کی نظر ثانی سے تقریباً سبھی صوبوں کو کافی بڑی رقمیں اس مد پر صرف کرنی پڑی ہیں۔ بلاشبہ کم تنخواہوں والے ملازمین کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے کیوں کہ اس کے بغیر ایمان داری اور کار پردازی کی خصوصیتیں صوبجاتی انتظام میں پیدا نہ ہو سکیں گی لیکن اس بات کی احتیاط رکھنی ہوگی کہ اس کام پر اس سے زیادہ ایک پائی بھی صرف نہیں کی جائے گی جو ضروری ہی اور اس حیثیت سے یہ خبر خوش آیند ہی کہ صوبائی حکومتوں کو اس بات کا احساس ہی مثلاً بمبئی، مدراس اور یوپی کی حکومتوں نے اس بات کی تحقیقات کے لیے کمیٹیاں مقرر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہی جو یہ دیکھیں گی کہ مصارف میں کفایت شعاری کا پورا خیال رکھا جا رہا ہی یا نہیں۔ اس سے قطع نظر صوبوں کے بجٹ میں ایک نئی مد کا اضافہ ہو گیا ہی اور وہ ہے بلووں سے متعلق مصارف۔ سب صوبوں کو اس کا سامنا کرنا نہیں پڑا ہی لیکن اس طرح جو رقمیں صرف ہوئی ہیں۔ اگر وہ بہتر کاموں کے لیے بچائی جا سکی ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس فضا میں پولیس کے مصارف پر ناگزیر طور پر اضافہ ہوا ہی۔ یہ وہ خرچ تھا جس پر ہندستان کی رائے عامہ کو ہمیشہ سے اعتراض رہا ہی۔ کیا آزادی کے قریب ہونے کا یہ مطلب ہی کہ ہم ایک دوسرے کی گردن کاٹنے میں لگ جائیں؟ کتنا بلند ہی ہمارا آزادی کا تصور؟

مسائل حاضرہ (غیر ممالک)

سرمایہ دار ملکوں میں دورانِ جنگ کی معاشی منصوبہ بندی

از: ———————— ی۔ ورگا

[نوٹ :۔ جنگ کے بعد دنیا کے ہر ملک میں منصوبہ بندی کا بہت چرچا ہے اور یہ دعوا کیا جارہا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے رہتے ہوئے بھی منصوبہ بند معیشت وجود میں لائی جاسکتی ہے۔ مشہور عالم معاشی ی۔ ورگا نے اپنے اس فاضلانہ مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دعوا محض ڈھونگ ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ زمانۂ جنگ کی سرمایہ دارانہ معیشت کے مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ سرمایہ داری اور منصوبہ بندی دو متضاد چیزیں ہیں جن کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش عوام کو فریب دینے کے مترادف ہے۔ مترجم]

پہلی عالم گیر جنگ میں جرمن اصلاح پسندوں نے اس زمانے کی جنگی معیشت کی طرح طرح سے قصیدہ گوئی کی اور کہا کہ اس کے تحت ضروری سامان کی "مساوی" "تقسیم ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ جنگی معیشت ایک زبردست "سماجی ترقی" کے مرادف ہے بلکہ اسے "جنگی اشتراکیت" تک کا لقب عطا کردیا۔ لینن نے اس دھوکے کا پردہ چاک کردیا اور "جنگی اشتراکیت" کا جو ڈھول پیٹا گیا تھا اس کی قلعی کھول دی چناں چہ اب دوسری عالم گیر جنگ میں کسی کو "جنگی اشتراکیت" کا لقب تحریر کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔

جنگ سے پہلے سوویت یونین کی (منصوبہ بند) معیشت کی زبردست کام یابی نے منصوبہ بند معیشت کے تصور کو بہت مقبول بنا دیا۔ جب سوویت یونین کی معاشی کام یابی سے انکار کرنا بالکل ہی ناممکن معلوم ہوا تو رجعت پسند حلقوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ کام یابی تو صرف منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے اور اس کا سوویت یونین کے اشتراکی نظام سے کوئی تعلق نہیں (یعنی اگر دوسرے ملک بھی ایسی ہی کام یابی حاصل کرنی چاہتے ہیں تو بس انھیں اپنی معیشت کو مرتب اور منظم کر لینا چاہیے۔ اس کے لیے اشتراکیت کے اصولوں پر عمل کرنے یا سرمایہ داری کو مٹانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مترجم) چناں چہ تقریباً تمام ملکوں میں (سوویت یونین کی نقل میں) "چار سالہ منصوبے"، "دو سالہ منصوبے" اور "دس سالہ منصوبے" بننے لگے جن کی یا تو بالکل ہی تکمیل نہیں ہو سکی یا اُن کا بھی حشر وہی ہوا جو جرمنی کے چار سالہ منصوبے کا ہوا تھا۔ ان کی بہ دولت سارے ملک کی معیشت خالصتاً جنگی تیاریوں کے لیے وقف کر دی گئی۔

اب جنگ کے دوران میں سوویت یونین کے معاشی نظام کی فوقیت فیصلہ کن طور پر ثابت ہو گئی ہے۔

انھیں باتوں کا نتیجہ تھا کہ منصوبہ بند معیشت کی مقبولیت اور زیادہ وسیع ہو گئی (اس مقبولیت کو دیکھ کر) باہر کے بعض ماہرین معاشیات نے اس تنظیم و ترتیب کو جو سرمایہ دار ملکوں کی معیشت میں دوران جنگ میں ظہور میں آئی تھی "منصوبہ بندی" کا نام دینا شروع کر دیا جو کہ بالکل غلط نام ہے۔

جنگ کے زمانے میں سرمایہ دار ملکوں کو فوج، بحری اور ہوائی بیڑے کی ضروریات کو پہلے سے سوچ کر مرتب کرنا اور کافی طویل مدت تک انھیں اپنی معیشت میں جگہ دینی پڑی اور چوں کہ جنگ ان ملکوں کی مجموعی پیداوار کا آدھے سے زیادہ حصہ نگل گئی۔ اس لیے یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا کہ آیندہ کی پیداوار میں کچھ تنظیم و ترتیب پیدا کی جائے تاکہ کم از کم مسلح فوجوں اور بیڑوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

اگر پیداوار کے تمام عناصر یعنی مشینیں، کچا مال، مزدور اور مختلف ذرائع نقل و حمل لا محدود مقدار یا تعداد میں موجود ہوتے تو سرمایہ دار ریاست کو اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وقت پر متعلقہ آڈر بھیج دیے جایا کریں۔ لیکن پیداوار کے عناصر لامحدود نہیں تھے۔ اس لیے ریاست کو ان عناصر کی بڑی حد تک جنگی ضروریات کی پیداوار کے لیے وقف کرنا اور ان اشیا کی پیداوار میں اضافہ کرانا پڑا جو کافی مقدار میں دست یاب نہیں ہو رہی تھیں اور ساتھ ہی شہری کھپت کو پابند کرنا پڑا۔ اسی مقصد سے ریاست نے کچا مال، مزدور اور ذرائع نقل و حمل کو ان صنعتوں کے تصرف سے الگ کیا جو غیر فوجی مصرف کا سامان پیدا کر رہی تھیں۔

سرمایہ دار ریاست جنگ میں حصہ لینے کے بعد ملک کی قومی معیشت میں کس حد تک اپنے خاکے کے مطابق

مداخلت کر تی یا کر سکتی ہو۔ اس کا دار و مدار اس بات پر ہو کہ اس ملک کے وسائل کتنے ہیں اور جنگ کی ضروریات اس تناسب سے کتنی ہیں ۔ ظاہر ہو کہ یہ اصول چین جیسے ملکوں پر منطبق نہیں ہوتا کیوں کہ یہ ملک پوری طرح سے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک نہیں ہیں وہاں ریاست کا پورے ملک کے معاشی وسائل پر قابو نہیں ہو۔ اس کے علاوہ اس مداخلت کے حدود کا دار و مدار بعض تاریخی حالات پر بھی ہوتا ہو مثلاً جنگی معیشت میں سب سے زیادہ ضبط و نظم جرمنی میں کیا جا سکا ۔ یہاں جنگ کی انتہائی کثیر ضروریات کے مقابل پیداوار کے بہت سے ضروری عناصر کی کمی تھی اور قومی معیشت میں سرکاری مداخلت کی روایت بھی موجود تھی ۔ چناں چہ وہاں ملک کی ساری معیشت کو ریاست کے ماتحت کر دیا گیا

تو گویا مجموعی طور پر متحارب ملکوں کے محدود وسائل اور جنگ کی کثیر ضروریات کی بہ دولت دوران جنگ میں ان ملکوں کی معیشت میں ترتیب و تنظیم پیدا کرنے اور خاکہ بندی کرنے کی کوشش کی گئی ہو لیکن یہ منصوبہ بند معیشت سویت یونین کی منصوبہ بند معیشت سے مختلف ہو خاص اختلافی نکات حسب ذیل ہیں ۔

(۱) سرمایہ دار ملک کی معیشت منصوبہ بند ہو ہی نہیں سکتی ۔ ان ملکوں میں پیداوار کے موجودہ رشتوں سے جو ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت پر مبنی ہیں قومی منصوبہ بندی کی ٹکر ہو جاتی ہو ۔

سرمایہ دار ملک میں منصوبہ بندی بہ حالت مجبوری اور دباؤ کے تحت ہوتی ہو جس کی جنگی ضروریات کی وجہ سے ضرورت پڑتی ہو ۔

لیکن سویت یونین کی منصوبہ بند معیشت اپنے معاشی نظام کے پیداواری رشتوں سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہو ۔ ان رشتوں کی بنیاد ہی ذرائع پیداوار پر پورے سماج کا قبضہ ہو یہاں محض جنگی ضروریات کے پیش نظر بعض صنعتوں اور پیداوار پر زبردستی کی پابندی نہیں عائد کی جاتی بلکہ ملک کی پوری معاشی زندگی ہی منصوبہ بند پیداوار پر قائم ہو۔

(۲) سرمایہ دار ملکوں میں دوران جنگ کی "ترتیب بندی" عام حالات سے علاحدہ نوعیت رکھتی ہو جو صرف جنگ کی بہ دولت ظہور میں آتی ہو اور صرف جنگ کے دوران تک قائم رہتی ہو ۔ سویت یونین میں منصوبہ بند معیشت سماجی نظام کا ایک مستقل اور لازمی جزو ہو ۔ جنگ کے زمانے میں بھی سویت یونین میں معاشی منصوبہ بندی ہوتی ہو جس طرح امن کے زمانے میں فرق صرف ہوتا ہو کہ جنگ کے زمانے میں سامان کی پوری پیداوار اور تقسیم جنگ کی ضروریات کے مطابق کی جاتی ہو ۔

(۳) سرمایہ دار ملکوں میں جنگ کی "ترتیب بندی" معاشی وسائل کے صرف ان پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہو جو براہ راست یا بالواسطہ فوج کی ضروریات سے متعلق ہوتی ہیں لیکن معاشی پیداوار کی دوسری شاخوں اور باقی ساری معاشی زندگی میں پہلے کی طرح وہی بے ترتیبی قائم رہتی ہو۔

(سوویت) یونین کی منصوبہ بندی نہ صرف ساری قومی معیشت پر بلکہ ساری قومی زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔ ہر قسم کے کام کے لیے تجربے کار آدمیوں کو تیار کرنا، جنگ کے مختلف کاموں کے مطابق آبادی کی تقسیم، تہذیبی ادارے یہ سب منصوبہ بندی میں شامل ہوتے ہیں۔

(۴) سرمایہ دار ملکوں میں (جرمنی کے علاوہ جس نے دوسرے ملکوں پر حملہ کرنے سے بہت پہلے ہی اپنی تمام معاشی زندگی کو جنگی ضروریات کا تابع کر دیا تھا) معاشی زندگی پر نگرانی کرنے کے نظم و نسق کا سارا انتظام جنگ کے زمانے میں پیدا ہوا۔ وہ ایک عارضی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف سوویت یونین میں معاشی منصوبہ بندی کا ایک مرکزی ادارہ موجود ہے جو پورے ملک پر حاوی ہے اور بیس برس سے زائد عرصے سے کام کر رہا ہے۔ یہی ادارہ بغیر کسی رکاوٹ کے جنگ کے زمانے میں بھی اپنا کام کرتا رہا اور جنگ کے پیش نظر ساری قومی معیشت کی منصوبہ بندی کر کے (فوجی اور غیر فوجی) جنگی ضروریات پوری کراتا رہا۔ مترجم)

(۵) سرمایہ دار ملکوں میں ان اداروں میں جن کو جنگی معیشت کی منصوبہ بندی کا کام سپرد ہوا تھا سرکاری حکام کے علاوہ متعلقہ پیشے کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ لوگ ان ملکوں کے مختلف سماجی طبقوں کے اداروں کی نمایندگی کرتے تھے یعنی کارخانوں کے مالک (جن میں سب سے زیادہ اولیت بڑے بڑے اجارے دار اداروں کے نمایندوں کو حاصل تھی۔ مزدوروں اور صارفین کے نمایندے (جرمنی میں مزدوروں اور صارفین کے اصلی نمایندے ان اداروں میں موجود نہیں تھے) یعنی سرمایہ دار سماج میں مختلف طبقوں کے درمیان جو تصادم اور تضاد موجود ہے مثلاً بڑے اجارے دار اداروں اور چھوٹی حیثیت کے سرمایہ دار اداروں کے درمیان، مزدوروں اور مالکوں کے درمیان اور کارخانے داروں اور صرف کرنے والوں کے درمیان) وہی منصوبہ بندی کے ان اداروں میں بھی سرایت کر جاتا ہے جس سے ان اداروں کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے عمل میں تضاد قائم رہتا ہے۔

سوویت یونین میں چوں کہ صرف دو ایسے طبقے ہیں (کسانوں اور مزدوروں کے) جن کا مفاد ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہے اور جو) ایک دوسرے کے دوست ہیں، اس وجہ سے سوویت یونین منصوبہ بندی کے ادارے بغیر کسی قسم کے تصادم یا رکاوٹ کے) آسانی سے اپنا کام جنگ کے زمانے میں بھی کر سکتے ہیں۔

سرمایہ دار ملکوں میں جنگی معیشت کی منصوبہ بندی کی تمام خرابیاں انھیں وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

ذرائع پیداوار (منصوبے بندی کے باوجود) افراد کی ذاتی ملکیت بنے رہتے ہیں اور سرمایہ دار ادارے بدستور ذاتی منافع کی غرض سے سامان پیدا کرتے ہیں بلکہ جنگ کے زمانے میں برطانیہ اور امریکہ میں خود حکومت نے اپنے پاس سے

جو نئے کارخانے بنوائے اور جو بظاہر پورے سماج کی ملکیت میں تھے وہ بھی انھیں افراد کے ذاتی تصرف میں دے دیے گئے کہ وہ انھیں چلائیں۔

ان سرمایہ داروں کے اداروں کا مقصد برابر یہی رہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کریں اور یہ مقصد ریاست کی ان کوششوں سے برابر ٹکراتا رہتا ہے جو وہ جنگ کی ضروریات کے مطابق پیداوار اور تقسیم میں ترتیب پیدا کرنے کے لیے عمل میں لاتی ہے۔ بڑے بڑے کارخانے دار جنگ کے زمانے میں بھی ریاست کی معاشی پالیسی پر عام طور سے اور جنگی معیشت کی تنظیم میں خاص طور سے فیصلہ کن اثر رکھتے ہیں کیوں کہ وہ اس کی تنظیم میں سرگرم اور سب سے بڑا حصہ لیتے ہیں۔ عام مفاد یہ ہوتا ہے کہ ملک جنگ میں فتح یاب ہو۔ لیکن ان بڑے کارخانے داروں کا خصوصی مفاد ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے کارخانے یا ادارے کے لیے جنگ سے زیادہ سے زیادہ منافع کمائیں۔ ان حالات میں معیشت کو منصوبہ بندی کے مطابق چلانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ریاست جن مفادات کی نمایندگی کرتی ہے اُن میں اور افراد کے بڑے بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں کی کوششوں میں جو تصادم پیدا ہوتا ہے یعنی تمام قومی وسائل کو جنگ کے لیے استعمال کرنے کی کوشش اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی کوشش میں جو تضاد ہوتا ہے اس کی سب سے بڑی مثال ممالک متحدہ امریکہ ہے۔ فاشستی ملکوں کے طریقۂ کار کے برخلاف اس تصادم پر کھلے بندوں اخباروں میں عین جنگ کے دوران میں بحث ہوتی رہی۔

جنگی سامان کی پیداوار سے زبردست منافع کمانے کے امکان کے باوجود امریکی سرمایہ داروں نے ضروری کارخانے مثلاً ہوائی جہاز، ٹینک، انڈیا ربر اور المونیم بنانے کے کارخانوں میں سرمایہ لگانے سے بالکل انکار کر دیا۔ ان کو خطرہ یہ تھا کہ جنگ کے بعد یہ کارخانے امن کی ضروریات پیدا کرنے کے لیے بے کار ہوں گے اور ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

یہ بات اب ہر شخص کو معلوم ہو چکی ہے کہ جنگ سے پہلے بھی امریکی سرمایہ (یعنی کارخانے وغیرہ۔ مترجم) پوری طرح مصرف میں نہیں لایا جاتا تھا۔ پھر بھی سرمایہ داروں نے ریاست کو تقریباً ۲ ارب ۸۰ کروڑ روپیہ نئے کارخانوں میں لگانے پر مجبور کر دیا۔ زیادہ تر معاملات میں یہ ہوا کہ (سرمایہ ریاست کا لگا لیکن) کارخانے سرمایہ داروں نے بنوائے اور پھر ریاست نے انھیں سرمایہ داروں ہی کو دے دیا کہ وہ انھیں چلائیں۔

اس جنگ کے زمانے میں امریکہ کی پیداواری قوتیں کس بے ترتیبی سے استعمال ہوئیں اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ عین اس وقت جب کہ بہت سے موجودہ موٹر ساز کارخانے بے کار پڑے تھے حکومت کے پیسے سے موٹری اداروں کے لیے بڑے بڑے موٹر ساز کارخانے بنوائے گئے۔

سرمایہ داروں کے ذاتی مفاد اور ریاست کے مفاد کا تصادم فورڈ موٹر کمپنی کے اداروں کی کارکردگی سے بھی

اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

اس "ڈیلورو" نامی کارخانے کے بنوانے میں حکومت نے تقریباً ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ روپیہ صرف کیا اور اسے انتہائی اعلا پیمانے کے سامان سے لیس کر دیا لیکن اس کارخانے کو فورڈ موٹر کمپنی کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اسے جس طرح چاہے چلائے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کارخانے کی عمارت مزدوروں کے خاص مرکز "ڈیٹرائٹ" سے ۳۰ میل کے فاصلے پر بنائی گئی۔ جو مزدور اس کے لیے بھرتی کیے گئے وہ زیادہ تر مرد تھے۔ سفید چہرے کے لوگ اور جنگ کے لیے بھرتی کیے جانے والے تھے۔ مزدوروں کے رہن سہن کے متعلق مکمل بے توجہی برتی گئی اور جب حکومت نے اس مسئلے کو حل کرنا چاہا تو کمپنی نے اس کی سخت مخالفت کی اور پھر آخری نتیجہ یہ نکلا کہ پیداوار کے پرانے اور فرسودہ طریقے استعمال کئے گئے جن سے پیداوار کی رفتار گھٹ گئی اور وہ چھوٹی چھوٹی ضروری تبدیلیاں بھی مشکل ہو گئیں جو جدید جنگ کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ لیکن خود فورڈ کارخانے نے اپنے لیے غیر فوجی سفری جہاز بنانے کا ایک نہایت اعلا اور مثالی کارخانہ بنوایا جو اس کے بعد جنگ کے "استواری منصوبے" کا جزو تھا۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں ہنری فورڈ نے اخباری نمائندوں کے ایک گروہ سے کہا تھا "میرا ارادہ ہے کہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد اس عمارت کو جس میں ہم (سرکاری) کارخانہ بنوا رہے ہیں اپنے ہی پاس رکھوں تاکہ اس میں بڑے پیمانے پر ہوائی جہاز بنائے جا سکیں۔" (نیو ماسیز صفحہ ۱۵ و ۱۶)

کرائیزلر کمپنی کے طریقۂ کار سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے (یہ کمپنی اب ہندستان پر بھی للچائی ہوئی نظریں ڈال رہی ہے اخبار نیا زمانہ کے اڈیٹر کی اطلاع کے مطابق اس نے ہندستان میں بحری جہازوں کے سب سے بڑے سرمایہ دار والچند ہیرا چند سے ہندستانی بازار کی لوٹ کھسوٹ کا ایک معاہدہ کیا ہے۔ مترجم)

موٹر کی دوسری کمپنیوں سے کہیں زیادہ کرائیزلر کمپنی نے اپنی جنگی سرگرمیوں کو محدود کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اس لیے حکومت کے بنوائے ہوئے موٹر ساز کارخانوں کو چلایا کہ وہ زمانۂ امن کے کارخانوں سے حتی الوسع زیادہ سے زیادہ مشابہ رکھے گئے تھے۔

اگرچہ کرائیزلر کے کارخانوں کے لیے وقف کی ہوئی بہت سی زمین ابھی خالی پڑی ہے پھر بھی حکومت ڈاج کمپنی کے لیے جو کرائیزلر ادارے کی شاخ ہے بہت بڑا طیارہ ساز کارخانہ بنوا رہی ہے۔ میں نے کرائیزلر کمپنی کے ایک نمائندے سے پوچھا "جنگ کے بعد ان کارخانوں کا کیا حشر ہوگا" تو اس نے شانہ ہلا کر جواب دیا: "موٹر ساز کارخانوں کے لیے تو یہ کسی کام کے نہیں ہوں گے۔"

خود اپنے کارخانوں میں جنگی سامان بنانے کی کرائیزلر کمپنی نے جو سخت مخالفت کی اس کی وجوہ معاشی تھیں۔ دوسری کمپنیوں سے مقابلہ کرنے کی اس میں کہاں تک صلاحیت ہے۔ اس کی پریشانی اُسے فورڈ یا جنرل موٹر کمپنی سے زیادہ لاحق تھی۔ چوں کہ اس کے پاس اپنے دو خاص رقیبوں کی طرح اتنی کثیر پس ماندہ نقد رقم نہیں تھی اور ساتھ ہی موٹروں کی پیداوار

میں اس کا دوسرا درجہ تھا (جہاں تک موٹریں بنانے کا تعلق ہے وہ فورڈ سے ہی پیچھے ہیں) اس لیے کرائسلر نے اپنی جنگی پیداوار کی اس طرح تنظیم کرنی چاہی کہ وہ جنگ کے بعد اپنے حریفوں کے مقابل زیادہ جلدی سے موٹر بنانے لگے اور زیادہ سستی بھی (نیوایج صفحہ ۱۲)

پیداوار کے دوسرے شعبوں سے بھی ایسی ہی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ (اس لیے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ،

وہ سماجی نظام جس کی بنیاد ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت پر قائم ہو اس میں منصوبہ بند معیشت ممکن ہی نہیں ہے

زرعی پیداوار کی منصوبہ بندی یا ترتیب بندی اور زیادہ مشکل کام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر سرمایہ دار ملک میں زمین لاکھوں انفرادی کھیتوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے اور کسانوں کے لیے یہ چھوٹے چھوٹے کھیت ایک ہی جگہ نہیں بلکہ بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے مشکل اور زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔

ایک جرمن فاشستی رسالے نے لکھا تھا۔

"اگر چار مارگن زمین کے قطعے کو ۲۰ چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جائے یا کسی شخص کی ۷۵ ایکڑ زمین کی ملکیت کو اس طرح بانٹ دیا جائے کہ اس کے ۱۲۲ مختلف ٹکڑوں کا چکر لگانے میں اور سال بھر میں ہر کھیت پر صرف ایک بار جانے میں اس کو ۲۰۰ کلومیٹر چلنا پڑے تو ظاہر ہے کہ زمین کی اس قسم کی ملکیت کی بنیاد پر زرعی پیداوار کو بڑھانے کی جد و جہد کو کامیاب بنانا مشکل ہے۔ جب کہ امن کے زمانے میں بھی ایسے حالات (کہ کسان کے کھیت بڑے سے علاقے میں بکھرے ہوئے ہوں) زراعت کی ترقی اور اس کو جدید اصولوں پر لانے میں زبردست رکاوٹ پیدا کرتے ہیں تو جنگ کے زمانے میں تو یہ صورت حال بالکل ہی ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ بکھری ہوئی کھیتیاں مزدوروں، مویشیوں، کھاد اور آلات کے نتیجہ خیز استعمال کے ساتھ نہیں چل سکتیں۔"

دست کاری کے چھوٹے چھوٹے اداروں کی پیداوار کی منصوبہ بندی میں بھی یہی دقتیں پیش آتی ہیں۔ اس کا طریقہ یہ نکالا گیا (خاص طور سے جرمنی میں) کہ انھیں بڑے بڑے اجارہ داروں سے کچا سامان لے کر اجرت پر سامان پیدا کرنا پڑا (جو ان کا نہیں بلکہ اجارہ دار کا ہوا)، یعنی دست کاروں کی آزاد حیثیت ختم کر دی گئی۔

چوں کہ سرمایہ دار ملکوں میں معیشت کی ترتیب بندی ایک غیر معمولی چیز تھی اور صرف دوران جنگ کے لیے تھی۔ اس لیے جنگ کے شروع میں ان ملکوں کے پاس جنگی معیشت کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے کوئی بنا بنایا ادارہ تیار نہیں تھا (سوا جرمنی کے کیوں کہ وہاں جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی جنگی معیشت کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی)۔

اس لیے نگرانی اور پابندی کے ادارے جنگ کے دوران ہی میں وقتاً فوقتاً قائم کرنے پڑے تاکہ مسلح فوجوں اور

بیڑوں کو سامانِ جنگ کی کمی کا جو خطرہ ہے وہ دور ہو جائے ۔ ان مختلف اداروں کے کام ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتے تھے اس کے لیے نئے ادارے بنانے پڑتے تھے جو ان مختلف اداروں میں ربط قائم کریں اور ان کے حدودِ عمل کے بارے میں جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں انھیں دبائیں لیکن ان اونچے اداروں کے کام بھی اکثر خلط ملط ہوتے تھے اور ایک باقاعدہ نظام کی جگہ بالکل افراتفری پیدا ہوتی تھی ۔

جرمنی کے بارے میں مشہور کیا گیا تھا کہ وہ ترتیب و تنظیم کا نمونہ ہے لیکن خود اس کی مثال سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ جرمن معیشت کی منصوبہ بندی اس غرض سے کہ اُسے جنگی پیداوار کے لیے وقف کر دیا جائے ۔ ہٹلر کے برسرِاقتدار آنے کے فوراً ہی بعد شروع ہو گئی ۔ ۱۹۳۳ء میں منصوبہ بندی کا کام وزارتِ معاشیات کے (جس کا سرکردہ فنک تھا) سپرد ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں گوئرنگ کو ایک ایسے محکمے کا سردار مقرر کیا گیا جس کا کام جنگی تیاریوں کے چار سالہ منصوبے کی تکمیل کرانا تھا ۔ یہ محکمہ وزارتِ معاشیات سے برتر سمجھا جاتا تھا لیکن اگر ہم دونوں محکموں کے جاری کیے ہوئے احکام آمنے سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ دراصل دونوں محکموں کے کام ایک ہی تھے پھر ۱۹۴۰ء کی ابتدا سے ایک نیا محکمہ قائم ہو گیا اسلحوں اور جنگی فراہمی کا محکمہ ۔ جس کا کام بھی یہی تھا کہ ملک کی ساری معاشی زندگی میں "ترتیب" پیدا کرے ۔ جنگ کے شدت اختیار کرنے اور معاشی حالت کے خراب ہونے کے ساتھ ساتھ اس محکمے کی اہمیت بڑھتی گئی ۔ ۱۹۴۳ء کے زمانہ بہار سے جنگی معیشت کے تمام اداروں میں ربط پیدا کرنے کا کام اسی وزارت کے سپرد ہو گیا ۔

اب اس پرانے محکمے یعنی وزارتِ معاشیات کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ غیر فوجی آبادی کو صنعتی سامان فراہم کرے لیکن چوں کہ اس محکمے کو صرف وہی چیزیں تقسیم کرنے کے لیے ملتی تھیں جن کی فوج میں ضرورت نہیں تھی ۔ اس لیے اس کے کام کی اہمیت بالکل ہی گھٹ گئی اور پھر ایک چوتھا محکمہ بھی تھا جو مقبوضہ ملکوں کو لوٹنے (اور ان کی معاشی زندگی میں "نازی ترتیب" پیدا کرنے) میں مصروف تھا ۔

ان کے علاوہ ایسے بھی ادارے تھے جن کی سرگرمیاں ایک ایک صنعت پر حاوی تھیں اور جو دراصل کارٹل کی مثال تھے کیوں کہ انھیں ریاست کی طرف سے اپنے فیصلوں کو نافذ کرانے کا اختیار تھا ۔ "کوئلے کا شاہی ادارہ" اور "لوہے اور فولاد کا شاہی ادارہ" ایسے ہی کارٹل نما ادارے تھے ۔ اُن کو اپنے ماتحت کسی صنعتی مرکز کو بند کرنے اور مختلف صنعتی مرکزوں میں کچا مال تقسیم کرنے تک کے اختیارات تھے ۔ اس طرح قومی صنعتوں کے متعلق سارے اختیارات بہت جلد بڑی صنعتوں کے بڑے بڑے اجارہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ گئے ۔

صنعت کی مختلف شاخوں کے ان اداروں کے علاوہ بہت سے ایسے ادارے بھی تھے جو سلطنت بھر میں

پیداوار کی تمام شاخوں کے عام مسائل کے بارے میں فیصلے کرتے تھے۔ مثلاً قیمتیں مقرر کرنے اور ان پر قابو رکھنے کے لیے ایک بورڈ تھا۔ کچے مال کی فراہمی کا ایک پورا محکمہ تھا، ایک بجلی کا محکمہ تھا۔ ایک "سلطنت کے ضروری وسائل محنت کا بورڈ" تھا۔ ان مختلف اداروں کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ اس کی کوئی صاف حد نہیں تھی اور ان کے کام خلط ملط ہوتے تھے۔

اسی جزوی تکمیل کے ساتھ جس کے لیے جرمن مشہور ہیں" ہر چیز کا بڑی احتیاط سے حساب نکالا جاتا، اس کی تنظیم کی جاتی، ہر چیز میں ربط پیدا کیا جاتا لیکن پھر جو ہر کارخانہ اور صنعتی مرکز میں ہزاروں احکام کا ایک سیلاب آنا شروع ہوتا تو سب ایک دوسرے کے برخلاف۔ اور یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ نازی اخباروں کو بھی (جنھیں لب ہلانے کی بھی اجازت نہیں تھی) اس ضرورت سے زیادہ تنظیم" کے خلاف لکھنا پڑا۔ اور ان احکامات کا کوئی نتیجہ بھی نہیں نکلتا تھا۔

ہفتہ وار ڈاس رائش نے ۱۰ راگست ۱۹۴۲ء کو ایک مضمون شائع کیا جس میں کہا گیا تھا۔

"یہاں جرمنی میں ہم کو تنظیم کا جنون ہے اور یہ واقعی ایک قومی بدبختی ہے۔ ہمارے پاس دو ایسے فقرے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے ایک ہے "پورا امکان" اور دوسرا ہے یکساں تکمیل۔ ان فقروں کے پس پشت اختیارات کا وہ دعوا چھپا ہوا ہے جو اشاریہ کے کارڈ کی فوج کی کمان کرنے والے جنرلوں اور تقسیم کی نگرانی پر حکومت کرنے والے شہزادوں کا مطالبہ ہے کہ انھیں دیے جائیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ذہنی صلاحیت حیرت انگیز طور پر محدود ہے اور جو سمجھتے ہیں کہ قومی زندگی کا نظم و نسق اسی حالت میں ہو سکتا ہے وہ اپنی فہرست میں ہر مچھلی مار کو بھی شامل کر لیں اور اس کے لیے مقرر کر دیں کہ تم اس سے زیادہ لمبے کپڑے استعمال نہیں کر سکتے لیکن اس کے پیچھے اور بھی بہت سی باتیں چھپی ہوئی ہیں اور وہ یہ کہ بڑے بڑے معاشی معاملات میز کے پیچھے یا ٹیلیفون پر طے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ آسان بھی ہے اور بے خطر بھی۔ لیکن اس سے آڈر پورے ہونے کے عمل میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں اور دیر لگتی ہے اور جنگ کے زمانے میں یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ فولاد کا ٹکڑا جب کارخانے سے نکلتا ہے تو اس کو نارمنڈی میں جا کر گولے کے طور پر استعمال ہونے سے پہلے کھڑکتے ہوئے کاغذوں کے ایک پورے پہاڑ کو پار کر کے گزرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح سرکاری ادارے اور میونسپلٹیاں اکثر بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں اور وہ دو دو بلکہ تین تین آقاؤں کے اختیار میں کام کر رہی ہیں۔"

آخری نتیجہ یہ ہوا کہ متحارب سرمایہ دار ملکوں میں منظم ترتیب بندی نے فوج وغیرہ کے لیے تو تمام ضروری سامان کی فراہمی میں کم و بیش ایک باقاعدگی سی پیدا کر دی لیکن ان ملکوں کی مجموعی حیثیت جو پہلے ہی سے غیر متوازن تھی اب اس کی وجہ سے اور زیادہ غیر متوازن ہو گئی۔ چناں چہ امریکہ میں ریاست نے الومنیم بنانے والے کارخانے بنوائے جن میں ۵۰ لاکھ من

سالانہ المونیم پیدا کرنے کی صلاحیت تھی لیکن ۱۹۴۴ء تک یہ پتا چل گیا کہ ملک میں المونیم ضرورت سے زیادہ پیدا ہو رہی ہے چناں المونیم کے سترہ کارخانے بند کر دیے گئے۔

ممالک متحدہ امریکہ میں دوران جنگ میں مشینی اوزاروں کی پیداوار انتہائی حد تک پہنچا دی گئی۔ اس زمانے میں تقریباً دس لاکھ مشینی اوزار پیدا کیے گئے جو ضرورت سے زیادہ تھے۔ چناں چہ ۱۹۴۳ء ہی سے مشینی اوزار پیدا کرنے والے کارخانوں کی پیداوار میں تقریباً ایک تہائی کمی کرنی پڑی۔ امریکی فوجی لیبر بیورو کے لیڈر ربیک نٹ نے اسی امر کے متعلق بجا طور پر کہا تھا کہ مشینی اوزاروں کے اس کثیر ذخیرے کے معنی ہیں بغیر کسی منصوبے کے اندھا دھند پیدا وار اور بربادی کیوں کہ اس کے ساتھ ساتھ جنگی سامان پیدا کرنے والے بیشتر کارخانوں میں (پورے وقت نہیں بلکہ) صرف ایک ہی پالی چلائی جا رہی ہے۔ اگر کام کی تنظیم اس طرح کی جاتی کہ دو یا تین پالیاں چلتیں یعنی جو مشینی اوزار پیدا ہو گئے تھے ان کو زیادہ تیزی سے استعمال کیا جاتا تو یہ جو نئے مشینی اوزار بنائے گئے ہیں ان کے بہت بڑے حصے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک کے زمانے میں جمہوری متحارب ملکوں میں جس چیز کی سب سے زیادہ کمی تسلیم کی جاتی تھی وہ تھے بحری جہاز۔ اس لیے توقع تھی کہ جو کچھ جہاز موجود ہیں ان کا پوری طرح خیال رکھ کر جنگی ضروریات کے لیے انھیں مرتب و منظم طور پر استعمال کیا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ لوگوں کو بیش تر مثالوں سے معلوم ہو چکا ہے صورت حال بالکل مختلف تھی۔

۱۹۴۲ء میں جب جہازوں کی کمی سب سے زیادہ تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن نے دارالعوام کو مطلع کیا کہ ایک برطانوی جہاز نے جو بندرگاہ سوئیز کو بھیجا گیا تھا (سیدھا بحر روم کے راستے سے جانے کی بجائے) اس امید کے راستے سے پورے افریقی ساحل کا چکر لگایا اور پھر اتنا وقت، جہازی گنجائش اور جہازی ایندھن برباد کرنے کے باوجود اس جہاز کو پوری طرح سے نہیں بھرا گیا بلکہ) اس میں گنجائش کا صرف نصف سامان لادا گیا اور مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جب یہ انگلستان واپس آیا تو بالکل خالی۔ (اور یہ جہاز نے کیا گیا تھا؟) صرف ایک ہزار ٹن بالو جس کے لیے اس نے اتنا لمبا سفر کیا جتنا زمین کے چاروں طرف چکر لگانے میں کرنا پڑتا۔

۱۰ ستمبر ۱۹۴۳ء کے اخبار نیویارک ٹائمز میں ان چھ جہازوں کی جو مور مانسک (روسی بندرگاہ میں) بھلا دیے گئے تھے حسب ذیل داستان بیان کی۔

واشنگٹن۔ ۹ ستمبر۔

"آج فوجی جہاز رانی کے محکمے نے اس فراموش کردہ کارواں کی کہانی شائع کی ہے جس نے روس کے شمالی ساحل پر بحر منجمد میں آٹھ ماہ بسر کیے ہیں۔ جنوری ۱۹۴۳ء میں غذائی اور جنگی سامان سے لد کر یہ جہاز نیویارک سے

روانہ ہوئے اور پروگرام کے مطابق ان کو ہتھیارہ اور دوسرے اتحادی سامان لے جانے والے جہازوں سے جا ملنا تھا جو مورمانسک جا رہے تھے ۔ دو ماہ کے سفر کے بعد جن میں اس کارواں کو زبردست طوفانوں سے گزرنا پڑا اور جس میں اس پر ساحل ناروے کے جرمن ہوائی حملے بھی ہوئے ۔ یہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ۔ جہازی عملہ جو ساحل پر چلا گیا انتظار کرتا رہا کہ اب کسی اور کارواں کی تشکیل ہو تو وہ واپسی کا سفر شروع کرے لیکن پورے آٹھ ماہ گزر گئے اور تب کہیں جا کر ان فراموش کردہ جہازوں کو امریکہ واپس آنے والے ایک کارواں میں شامل کیا گیا ۔"

سرمایہ دار ملکوں میں جنگی منصوبے بندی کا کمزور ترین پہلو مزدوروں کی تقسیم ہے ۔ اس معاملے میں نہ صرف نہایت ہی سخت قسم کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں بلکہ پہلی عالم گیر جنگ کی غلطیاں بھی دہرائی گئیں ۔ حال آں کہ یہ بات تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے ۔

جرمنی میں بھی اور انگلستان میں بھی کوئلے کی صنعت میں کافی مزدوروں کی ضرورت تھی لیکن اس بات پر کافی توجہ نہیں کی گئی فوراً ہی یہ پتا چلا کہ کان کن مزدوروں خاص طور سے ماہر مزدوروں کی کمی کی وجہ سے کوئلے کی پیداوار گر گئی ہے ۔ جرمنی اور انگلستان دونوں ملکوں میں حکومت کو ان کان کن مزدوروں کے ایک حصے کو (جو فوج میں چلے گئے تھے) فوج سے سبک دوش کرنا پڑا ۔ اس کے علاوہ تلافی کرنے والے مزدوروں (یعنی موت اور بیماروں کی بہ دولت خالی ہونے والی جگہوں کو بھرنے کی بڑھتی ہوئی مانگ) کی طرف کافی توجہ نہیں کی گئی ۔ چناں چہ جب نئے مزدوروں یا تلافی کرنے والے مزدوروں کی سخت ضرورت محسوس ہوئی تو اسکول سے نکلنے والے نوجوانوں میں کافی تعداد ایسی تھی جو کان کنی کے پرخطر پیشے میں داخل ہونے کو بالکل تیار نہیں تھی ۔ یہاں تک کہ انگلستان تک میں حکام کو کانوں کے لیے زبردستی بھرتی کرنے کا طریقہ اختیار کرنا پڑا ۔ جرمنی میں ہٹلریوں نے یوکرین اور دوسرے عارضی طور سے مقبوضہ ملکوں سے زبردستی لائے جانے والے کان کے مزدوروں کو ڈرا دھمکا کر ان سے مغربی جرمنی ، بلجیم اور لکسمبرگ کی کوئلہ کی کانوں میں کام لینا چاہا ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے مزدوروں سے جن سے ظلم اور زبردستی سے کام لیا جائے پیداوار میں بہت کم اضافہ ہو سکتا تھا ۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں امریکہ کے اندر اس وقت جتنے مزدور دست یاب ہو سکتے تھے ان سے مناسب طور پر کام لینے کے سلسلے میں جو رکاوٹیں پیش آ رہی تھیں ان کے بارے میں مزدوروں کے استعمال کی جنگی کمیٹی کے صدر مسٹر میک نٹ نے کہا ۔

"۲۰ لاکھ حبشی مزدور اپنی صلاحیتوں کے مطابق استعمال نہیں کیے جا رہے ہیں (نسلی) امتیاز لاکھوں حبشی مزدوروں کے استعمال کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے ۔ ان حبشی مزدوروں سے کام لینے کی بجائے جو کارخانوں میں کام کرنے کے لیے مقامی طور سے دست یاب ہوتے ہیں سفید فام مزدور دور دور کے علاقوں سے بلائے گئے ہیں ۔ ملک کے مشرقی

حصے کے ایک شہر میں جنوری ۱۹۴۲ء سے لے کر ستمبر ۱۹۴۲ء تک شہر کے نو کارخانوں میں درج شدہ مزدوروں کی تعداد ۵۰۹۴ سے بڑھ کر ۱۹۹۱۷ تک پہنچ گئی۔ اس دوران میں ۱۰ ہزار مقامی حبشی مزدور بے کار رہے۔ پھر مکانوں کے کرائے بہت زیادہ بڑھ گئے۔ ذرائع نقل و حمل پر بہت زیادہ بار پڑ گیا۔ باہر سے آنے والے سفید فام مزدور بالآخر اپنا کام چھوڑ کر دوسری جگہوں پر چلے گئے کیوں کہ ان کے رہنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور اُن کا بہت سختی سے استحصال کیا جاتا تھا"۔ نیویارک ٹائمز مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۲ء (۵ ستمبر کے برطانوی رسالہ اکانومسٹ میں بھی ایسی ہی ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ رسالے کے نامہ نگار نے ڈیٹ روائٹ (امریکہ میں دو موٹر ساز کارخانوں کا مشہور مرکز) سے لکھا تھا کہ وہاں لاکھوں حبشی اور پولستانی آ پہنچے ہیں اور جو سفید فام لوگ آئے ہیں اُن میں سے بہت سے جنوبی ریاستوں کے رہنے والے حبشیوں کے کٹر دشمن ہیں۔ مکانوں کے متعلق صورت حال بہت ہی نازک ہو گئی ہے۔ کیوں کہ سفید فام لوگ حبشیوں کے ساتھ ایک ہی عمارت میں نہیں رہنا چاہتے)

اس کے علاوہ سیک نٹ نے ایسی ہی بہت سی دوسری دقتیں بھی بتائیں جن کی وجہ سے تمام دست یاب مزدوروں کو پوری طرح استعمال کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ من جملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ کارخانے میں کام پر لگانے والوں کی عورتوں یا جسمانی قراجی رکھنے والے مردوں یا ایک خاص حد سے زیادہ عمر کے مردوں کو کام دینے پر غیر آمادگی ظاہر کی گئی۔

مزدوروں کی مانگ میں اس افراتفری کی بدولت بہت سا سامان تباہ ہو گیا۔ مثلاً کے لی فورنیا میں روزمرہ کے استعمال کی چقندری شکر کے ذخیرے جس میں ۴۰ لاکھ پونڈ شکر موجود تھی ضائع ہو گئے۔ آری زونا میں تربوزوں کی آدھی فصل جمع ہی نہیں کی گئی اور اس طرح اور بہت سی چیزیں ضائع ہوئیں۔

پیداوار کے مختلف شعبوں میں اجرتوں کی شرح میں جو زبردست تفاوت تھا۔ وہ اس افراتفری کی بدولت اور بڑھ گیا۔ طیارہ ساز صنعت میں مزدوروں کی ہفتہ وار اوسط اجرت ۱۹۴۲ء میں ۴۶ ڈالر تھی۔ اور جہاز سازی کی صنعت میں ۵۳ ڈالر لیکن کانوں کی صنعت میں صرف ۳۷ ڈالر۔ اس لیے مزدور کانوں کی صنعت سے بھاگ کر ان صنعتوں کی طرف دوڑتے تھے جہاں اجرتیں زیادہ تھیں۔ اس کی وجہ سے کچی دھات نکالنے پر، جو جنگی صنعتوں کے لیے حد درجہ ضروری چیز تھی، بہت برا اثر پڑا۔ چناں چہ "آناکونڈا" نامی کمپنی کی دھات کی کانوں میں سے جنگ کے ابتدائی پانچ ماہ میں ایک ہزار مزدور نکل گئے۔ اور اس دوران میں نئے آنے والے مزدوروں کی تعداد صرف چار سو تھی۔ جون ۱۹۴۲ء میں تانبے کی پیداوار آدھی گر گئی۔ (اکانومسٹ۔ ۵ ستمبر ۱۹۴۲ء) نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کو جنوبی امریکہ سے زیادہ قیمتیں دے کر تانبا خریدنا پڑا۔

ملک کے عام مفاد اور کارخانے داروں کے مخصوص ذاتی مفاد کا تضاد قیمتوں کی ترتیب کے معاملے میں خاص طور سے نمایاں ہوا۔

بڑے بڑے متحارب ملکوں میں اُن چیزوں کی قیمتیں، جن پر ریاست کی پابندیاں تھیں اتنی نہیں بڑھنے پائیں جتنی پچھلی جنگ میں بڑھ گئی تھیں۔

ایک رسالے میں جو مزدور طبقے کے نقطۂ نظر کو بہت کچھ صحیح طریقے سے پیش کرتا ہے امریکہ میں ریاست کی طرف سے قیمتوں پر جو پابندی لگائی گئی تھی اس کی اہمیت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

قیمتوں کے کنٹرول سے حسب ذیل مفید نتائج نکلے۔ قیمتوں کے ریاستی انتظام سے تقریباً ۸ کروڑ ۹۰ لاکھ ڈالر کی بچت ہوئی ہے ایک ایسی رقم جو تقریباً ان تمام سامان کی قیمت اور اُن تمام سروسوں کی قیمت کے برابر ہے جو پچھلے سال غیر فوجی مصارفین کو حاصل ہوئیں۔ مندرجہ بالا رقم میں سے قریب ۶ کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر ریاست نے اسلحہ بندی کے پروگرام کی تکمیل میں بچائے، مصارفین نے اس دوران میں ۱۹۴۳ء کے آخر تک جو سامان خریدا اس پر صرف ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کی بچت کی۔" (اکنامک آؤٹ لُک ناشر سی۔آئی۔او۔ امریکہ)

لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ سرکاری طور پر جو قیمتیں مقرر کی گئی تھیں۔ ان کی اکثر خلاف ورزی بھی کی گئی۔ چیزوں کی جتنی شدید کمی ہوئی اتنی ہی ان کی کنٹرول کی قیمتوں اور چور بازار کی قیمتوں کا فرق بڑھا۔ (اس کے علاوہ) ریاست بہت سی ایسی چیزوں کی قیمتیں مقرر نہیں کرسکتی جن کی عمدگی کی معیار بندی نہیں کی جاسکتی۔ زمین، مکانات اور حسن کارانہ تخلیقات وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ وہ زائد سرمایہ جس کی تنگیٔ معیشت میں ضرورت نہ تھی۔ اس قسم کی چیزوں میں تیزی سے کھپنا شروع ہوگیا۔ اور ایسے معاملات میں خاص طور سے بکنوں کی قیمت گرنے کا خطرہ برابر لگا رہا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ قیمتیں سبھی چیزوں کی بہت زیادہ بڑھ گئیں۔

پھر قیمتیں جو مقرر ہوتی ہیں تو صرف اُن چیزوں کی نہیں مقرر ہوسکتیں جو استعمال ہو رہی ہیں اس لیے اکثر بڑی متضاد صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ چناں چہ استعمال شدہ چیزوں کی قیمت اس وقت کی قیمتوں سے بھی بڑھ گئی جب وہ نئی تھیں۔ پرانی موٹریں جو نئی ایک ہزار ڈالر کی خریدی گئی تھیں دو سال بعد ۱۹۴۲ء میں تجارتی کمپنیوں کے ہاتھ بارہ بارہ اور چودہ چودہ سو ڈالر کو بیچی گئیں۔ اور پھر ان کمپنیوں نے ایک ایک موٹر پر بہ آسانی دو دو سو ڈالر اور بنائے۔ اسی طرح پرانے تبرید خانوں کی قیمت امریکہ میں جنگ کے زمانے میں ان قیمتوں سے بھی زیادہ تھی جن پر وہ نئے خریدے گئے تھے

امریکہ میں قیمتیں مقرر کرنے کی پالیسی میں جو افراتفری ہوئی اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال ۱۹۴۳ء کے جاڑوں میں نیویارک کی "انڈوں کی جنگ" میں پیش آئی۔ حکومت نے انڈوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت مقرر کردی اس سال انڈوں کی معمول سے زیادہ کثرت تھی اور نیویارک میں ان کے بڑے ذخیرے جمع ہوگئے تھے۔ لیکن تاجر قیمتیں بڑھائے رکھنے

پر اڑے رہے۔ نیویارک کے میئر لاگارڈیا کو شہر کے لوگوں سے اپیل کرنی پڑی کہ جب تک تاجر قیمتیں نہ گھٹائیں وہ انڈے نہ خریدیں۔

یہ اور دوسرے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ قیمتیں مقرر کرنے کے سلسلے میں ریاست کی مداخلت کے باوجود جنگ کے زمانے میں بھی وہی افراتفری قائم رہی۔ قیمتوں کی ترتیب میں ناکامی کا سب سے کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ (جہاں تبادلۂ زر کا سارے ملک میں مرکزی نظام رائج ہے) دنیا میں ہر جگہ جنگ کے دوران میں یا اس کے فوراً ہی بعد زر کی قیمت گھٹنی شروع ہو گئی۔

ریاست کی طرف سے قیمتوں کی ترتیب بندی اور انکم ٹیکس کی اونچی شرح کا مقصد یہ بھی تھا کہ دوران جنگ میں منافع بازی نہ کی جائے۔ لیکن جیسا کہ امریکی سینٹ کے کمیشن کی رپوٹ سے پتا چلتا ہے جس کا صدر خود ٹرومین تھا منافع بازی کو روکنے کا یہ مقصد پورا نہیں ہوا۔ اس لیے بڑے بڑے جنگی ٹھیکے داروں سے ازسرِنو بات چیت کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا اور سمجھوتے کے طور پر جنگی منافعوں میں سے ان لوگوں سے کروڑ ہا ڈالر ریاست نے لیا ۴۸ کروڑ ۸۰ لاکھ ڈالر (تقریباً ایک ارب ۴۴ کروڑ روپیہ) صرف ایک ادارے نے حکومت کو اپنے زائد منافع سے "خود بہ خود" واپس کیا۔ اس لیے مختلف اداروں کے ڈائرکٹروں کی یہ کوشش ہی ہے کہ زائد منافع کے ٹیکس سے بچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم ذاتی تصرف میں لے آئیں۔ ایک امریکی (ہارپرمیگزین) جریدے سے جو ایک طرح سے انتہا پسند جرائد میں شمار کیا جا سکتا ہے یہ اطلاع فراہم کرتا ہے۔

"ہم بڑی بڑی شاہانہ دعوتوں کے تذکرے سنتے رہتے ہیں۔ اعلا ترین ہوٹلوں میں ہی جاتے ہیں اور ان میں کھانے اور پینے پر اور آرائش اور سازندوں وغیرہ پر بہت بڑی بڑی رقمیں صرف کی جاتی ہیں۔ ایک دعوت میں ہر مدعو خاتون کو چالیس چالیس روپے کی ایک سرخ بوتل یا سو سو روپے کی سفید بوتل تحفے میں دی گئی، ایک اور دعوت میں دعوت کے بعد تفریحی پروگرام پیش کرنے والے صرف ایک فن کار کو ۲۸ سو روپیہ دیا گیا۔ ایک ممتاز شخصیت نے جن کا ہمارے ایک بڑے شہر میں ہوٹل کا کاروبار ہے بتایا ہے کہ ان کے ہوٹلوں میں شرابوں پر جو رقمیں صرف کی جاتی ہیں اتنی کثیر ہیں کہ اب سے چند سال قبل انتہائی بے لگام و بے دماغ بھی نہیں سوچ سکتے تھے اور اس ساری رقم کا وسیلہ ظاہر ہے۔ یہ صرفہ کمپنی کے سر ہے یا حکومت کے ...."

اب تو یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ بہت سی کمپنیوں نے ایسے ایسے ہوٹل والی ریلیں خریدی ہیں جو صرف ان کے ڈائرکٹروں وغیرہ کی ضرورت کے وقت استعمال ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ہوٹل گاڑیاں بے کار رہتی ہیں اور ٹیکس کے موجودہ نظام کے ماتحت یہ سب صرفہ حکومت کے ذمے ہوتا ہے (کیوں کہ یہ سب رقم صرف نہ کی جاتی تو زائد منافع کی مد میں حکومت کے خزانے میں داخل ہوتی۔ مترجم)

ہم ایسی بہت سی مثالیں سنتے ہیں مثلاً: ایک کمپنی جس کو شراب کی صنعت سے کوئی بھی تعلق نہیں شراب کی بوتلوں کے سیکڑوں بکس کے بکس جمع رکھتی ہو جو خاص دعوتوں اور محفلوں کے وقت استعمال ہوتی ہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک بتانا بالکل ناممکن ہو کہ صنعتی کمپنیوں نے تفریح کے لیے جو بڑے بڑے فنڈ وقف کر دیے ہیں ان میں ٹھیک ٹھیک کتنی رقم اس وقت ہوٹلوں اور شبانہ کلبوں، فلوریڈا کی آرام گاہوں اور طرح طرح کے قمار خانوں میں اس وقت پہنچ رہی ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان اداروں کے لیے) آمدنی کا یہ ذریعہ کافی بڑا ہوگا۔"

ایسے نظام میں جہاں ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت ہوں اشیا اور ان کی قیمتوں پر ریاست کے کنٹرول کا خلاف قانون طور پر توڑا جانا بالکل ناگزیر ہو۔

جرمنی میں جہاں ریاست نے ہر قسم کی معاشی سرگرمی پر کنٹرول کرنا چاہا جنگ کے پورے دور میں اس کی ترتیب بندی کی کڑیاں برابر ٹوٹتی رہیں۔ جرمنی کے اخبار میں روزانہ ان لوگوں کی سزائیں شائع ہوتی تھیں جن کو جرمن عدالتیں کنٹرول کے حکام سے سامان چھپانے کے جرم میں ماخوذ کرتی تھیں۔ اگرچہ مویشیوں کو خلاف قانون ذبح کرنے، چور بازار میں گوشت بیچنے یا مکھن کی چور بازاری وغیرہ کرنے کے لیے سنہ ۱۹۴۱ء ہی سے موت کی سزا مقرر کر دی گئی تھی لیکن جنگ کے عین خاتمے تک کنٹرول کے قاعدوں کو توڑنے کے واقعات برابر ہوتے رہے۔

اور جمہوری ملکوں میں بھی ریاست کے بنائے ہوئے کنٹرول کے قاعدے بلا مبالغہ ہر قدم پر توڑے جا رہے تھے۔ امریکہ میں محکمہ زراعت کے وزیر کا اندازہ ہو کہ بازار میں گوشت کی جو مقدار خلاف قانون لے جائی جا رہی ہو وہ حکومت کی مقرر کی ہوئی مقدار سے ۲۰ فی صدی زیادہ ہو۔ "محض شکاگو کے ایک شہر میں چور بازار سے گوشت خریدنے پر ہر ہفتہ چالیس لاکھ روپیہ صرف کیا جاتا ہو۔ گوشت کے راشن کارڈ جاری ہونے کے بعد غیر قانونی طور پر ذبح کیے جانے والے مویشیوں کی تعداد بڑی تیزی سے گر گئی سوروں کی تعداد میں ۲۸ فی صدی کی کمی ہو گئی مویشیوں کی تعداد میں ۱۱ فی صدی کی اور بڑی سینگوں والے مویشیوں میں ۱۲ فی صدی کی (رسالہ اکانومسٹ مورخہ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء) اسی طرح اخبار ٹائمس مورخہ ۲ دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء کی اطلاع ہو کہ "چارلس لیونارڈ کو کل بو اسٹریٹ کی پولیس عدالت نے ۴۰ ہزار پونڈ جرمانہ اور ۵۰ پونڈ عدالت کا خرچہ ادا کرنے کی سزا دی کیوں کہ اس کی غلطی سے ۱۱۲۳۸۷ ڈالر کا تبادلہ سرکاری خزانے کو خریداری کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔ ملزم نے اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ عدالت نے حکم دیا کہ ملزم پر زیادہ سے زیادہ جرمانہ کیا جائے۔"

ریاست کے کنٹرول سے موجودہ حالات میں انفرادی اداروں کے مفاد پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہو اور اسی وجہ سے سرمایہ دار ریاستوں کی "منصوبہ بند" معیشت میں رشوت اور جعل سازی وغیرہ کا زور بڑھتا ہو۔ فاشسٹ جرمنی اس بات کی نہایت

روشن مثال ہو۔ مثلاً سنہ ۱۹۴۴ء کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

"ٹوانہ کرٹ کاپ جس کی عمر ۳۴ سال ہو اُن کمیٹیوں میں سے ایک کا ممبر تھا جو اسلحوں کی پیداوار کی ذمے دار ہیں۔ اپنے سرکاری عہدے کی بنا پر وہ بعض ایسی کانفرنسوں میں شریک ہوتا تھا جو جنگ کے لیے اہمیت نہ رکھنے والے صنعتی اداروں کو بند کرنے کے مسئلے کے متعلق فیصلے کرتی تھیں۔ کاپ کا فرض تھا کہ اس خبر کو وہ پردۂ راز میں رکھے۔ لیکن اس نے اس کو شائع کر دیا اور جو فرمیں بند ہونے والی تھیں اُن میں سے ایک کے پاس پہنچا۔ اُس نے یہ شرط پیش کی کہ وہ اس فرم کو بند نہیں ہونے دے گا بہ شرطیکہ فرم کے اتنے حصّے اسے دے دیے جائیں۔" (پریس ٹینسی تسائی تنگ) مورخہ ۱۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء

اس قسم کے اور بہت سے واقعات نے کافی شہرت اختیار کی اور ان معاملات کا تو کچھ کہنا ہی نہیں جو بڑی تعداد میں ہوے لیکن جن کا پبلک کو پتا نہیں چل سکا۔

ان تمام باتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہو کہ پیداوار میں نراجیت اور بے ترتیبی جنگ کے زمانے میں بھی سرمایہ داری کی بڑی خصوصیات بنی رہتی ہیں۔ حال آں کہ ریاست معیشت میں ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہو سرمایہ داری میں منصوبے بند معیشت کے امکان کے متعلق بہت کچھ بے بنیاد دعوے کیے جاتے ہیں۔

جنگ کے زمانے میں امریکہ اور انگلستان میں سرمایہ دارانہ نظام کے اندر ہی "منصوبہ بندی" کرنے کی انجمنیں قائم کی گئی تھیں اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔ "منصوبہ بندی کے امریکی اسوسی ایشن" میں پروفیسر اے، ایچ ہین سن۔ آر۔ رومیل اور آئی لیوین جیسے مشہور افراد تک شریک تھے۔ اس نے جنگ کے خاتمے تک تقریباً ۵۰ مطبوعات شائع کی تھیں۔ بالکل ٹھیک ٹھیک تفصیلی منصوبے تک بنا لیے گئے تھے مثلاً ایک کتاب بے روزگاری کے مکمل خاتمے کا قومی بجٹ پیش ہوا تھا، دوسری میں جنگ کے بعد امریکی معیشت کی ترقی کا خاکہ تھا لیکن ان تجاویز میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ ان منصوبوں کو عملی جامہ کیسے پہنایا جائے گا۔

اب جنگ کے خاتمے کے بعد ریاست کی ترتیب بندی کی سرگرمیاں تعداد اور وسعت میں تیزی سے گھٹتی جا رہی ہیں اور سرمایہ دار ملکوں میں "منصوبہ بندی" کا سوال ابھی سے پس پشت پڑتا جا رہا ہو لیکن دو تین سال میں پھر یہ مسئلہ اٹھے گا جب حسب معمول فالتو پیداوار کا بحران شروع ہو جائے گا۔

امداد باہمی

از : ——————— حمیدہ سراج ام۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

ہماری معاشی زندگی نے بتدریج ترقی کی ہے اور متعدد و مختلف مدارج طے کرنے کے بعد اس صنعتی منزل تک پہنچی ہے۔ اس سفر میں انسان کی رہبری آسانیوں اور آسائشوں کی توقعات نے کی جو اپنی قوت کے بل بوتے پر راستے کی گوناگوں مشکلات اور رکاوٹوں پر حاوی ہوتی رہیں۔ یہ توقع بار آور ثابت ہوئی اور سفر کی ہر منزل مستقبل کی بلندی میں اضافہ کرتی رہی۔ لیکن یہ حقیقت بھی قابل توجہ ہے کہ ہر دور میں تبدیلیوں اور تغیرات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی دشواریوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا جو نوعیت کے لحاظ انوکھے اور اثرات کے اعتبار سے ضرر رساں تھے۔ لیکن راستے کے نشیب و فراز کا عادی انسان اپنے ذہن اور ادراک پر زور دے کر بچاؤ کی صورتیں نکالتا ہی رہا۔ تحریک امداد باہمی بھی اسی طرح کی ایک شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔

اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں بھاپ کے انکشاف نے دنیا کو ترقی کا ایک نیا راستہ دکھلایا۔ انواع و اقسام کی مشینی ایجادات نے معاشی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ صنعتی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ پیدائش دولت میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہونے لگا۔ ذرائع آمد و رفت کی ترقی نے دنیا کے مختلف گوشوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا اور غیر شعوری طور پر صنعتی اور تجارتی تعلقات میں فاصلے کے تصور نے اپنی سابقہ اہمیت کھو دی لیکن اس جگمگاتی ہوئی تصویر کا ایک تاریک پہلو بھی تھا جو نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ پیدائش دولت میں اضافہ ہو رہا تھا اور عوام کی خوش حالی خطرے میں تھی۔

لین دین اور کاروباری تعلقات کا جال پھیلتا جارہا تھا۔ لیکن دوسری طرف اخلاق اور ذہنی تعلقات کے بندھن کم زور پڑرہے تھے۔ مادیت پرستی انسانیت پرستی کی جگہ لے رہی تھی۔ مشین جیسی قیمتی چیز کی فراہمی ہر شخص کے بس کا روگ نہ تھا۔ سرمائے کی اس بڑھتی ہوئی اہمیت نے قوت پیدائش کو چند مٹھی بھر آدمیوں کے ہاتھ میں لا ڈالا اور یہ خوش قسمت پیدائش دولت کے اجارے دار بن بیٹھے اور مزدور اپنی قسمت کو روتا رہا۔ غرضے کہ سماج کے ان دو طبقوں کے مفاد و مقاصد کا درمیانی تضاد تہذیب و تمدن کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے لگا۔ یہ جان لیوا الجھن اہل نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ نجات کے راستے ڈھونڈے جانے لگے۔ کچھ نے اشتراکیت پر زور دیا۔ کچھ نے مزدور و کسان سبھاؤں کے قیام کا پرچار کیا۔ اور اس آخر الذکر تحریک کے سر انجمن امداد باہمی کے وجود کا سہرا ہے۔

امداد باہمی کی انجمنوں کے سامنے دو مسائل تھے۔ بڑھتی ہوئی نفع خوری کو دبانا اور شدید سود خواری کو روکنا۔ اول الذکر کا تدارک اجتماعی خرید و فروخت میں اور آخر الذکر کا متحدہ طور پر قرض حاصل کرنے میں نظر آیا۔

غرض کہ امداد باہمی کی سب سے پہلی انجمن کی بنیاد سنہ ۱۸۴۴ء میں روکڈل کے رضا کاروں کے ہاتھ انگلستان میں رکھی گئی۔ انھیں ضروریات زندگی بہت ہی گراں قیمت پڑتی تھیں۔ اس دشواری کو دور کرنے کی خاطر اس انجمن نے کوآپریٹیو اسٹور Co-operative Store کی شکل اختیار کی۔

جرمنی اور اٹلی میں امداد باہمی کی انجمنیں گانو اور شہروں کے کسانوں اور کاریگروں کو سود خواروں کے خونی پنجے سے نجات دلانے کے لیے وجود میں آئیں۔ دیہی قرضے کی انجمن کی بنیاد سنہ ۱۸۴۹ء میں جرمنی کے ایک شندے Raiffesen کے ہاتھوں رکھی گئی۔ اس کے ایک سال بعد دوسرے جرمن Schulze of Dehlizch نے یہ تحریک شہروں میں پھیلائی۔

اس وقت دنیا میں مختلف اقسام کی امداد باہمی کی انجمنوں کی مجموعی تعداد ۸۱۰۵۰۰ ہے اور ان کے ممبروں کی تعداد ۱۴۳۲۷۰۰۰ ہے۔ انگلستان میں ان انجمنوں کی اکثریت نے کوآپریٹیو اسٹور کی شکل اختیار کرلی ہے۔ تقریباً ۹۰۰۰ ... اس کے ممبروں کی تعداد ہے۔ جرمنی اور اٹلی میں قرض کی انجمنوں کو مقبولیت حاصل ہے۔ ڈنمارک میں زراعتی پیداوار کی خرید و فروخت کا زیادہ تر کام انھیں انجمنوں کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اس ملک میں ۲۰ لاکھ کی مجموعی آبادی میں ۱۷ لاکھ ان انجمنوں کے ممبر ہیں اور ہر کسان تقریباً چھ یا سات انجمنوں کا بیک وقت ممبر ہے۔ روس کی منصوبے بندیوں میں اس تحریک کو بہت زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔ یہاں ان سوسائٹیوں کے ممبروں کی تعداد ۷ کروڑ ۳۰ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ امریکہ میں بھی مزدوروں اور کسانوں کے طبقے نے انہیں انجمنوں کے سہارے سرمایہ داری کا مقابلہ کیا اور اس وقت ۱۱ ہزار انجمن غلّہ اور

فارم کی پیداوار کی خرید و فروخت کے کام میں مصروف ہیں۔ ان ترقی یافتہ ممالک سے سبق حاصل کر کے چین، ہندستان اور مصر میں بھی اس تحریک سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔

اس تحریک کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے اسباب جانچنے کے لیے اس کی غرض و غایت مقاصد اور اصولوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

امداد باہمی نام ہے کسی مشترک مقصد کے حصول کے لیے اتحاد عمل کا۔ کیلورٹ نے اس کی تعریف یوں کی ہے "امداد باہمی ایک ایسی تنظیم ہے جس میں تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اور بھائی چارے کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ایک دوسرے سے اشتراک عمل کرتا ہے اور اجتماعی مفاد کی جد و جہد میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتا ہے" گو کہ یہ تحریک معاشی ضروریات کی تسکین کے لیے عمل میں آئی۔ لیکن اس کا اخلاقی پہلو بھی کسی طرح کم اہمیت کا حامل نہیں۔ معاشی مقاصد اپنی عمومیت کی وجہ سے مادی ہیں۔ حالانکہ ان انجمنوں کے فرائض میں محض مالی ترقی نہیں بلکہ اخلاقی درستی بھی ہے۔ اس تنظیم میں آکر انسان یک جہتی اور اتحاد کے فوائد محسوس کرتا ہے۔ خود اعتمادی ایمان داری، کفایت شعاری اور باہمی ہم دردی کا سبق سیکھتا ہے۔ احساس فرض و ذمے داری کو تربیت دیتا ہے۔ اس لحاظ سے امداد باہمی کی انجمنیں کسان اور مزدور سبھاؤں سے مختلف ہیں۔ ان کا دائرۂ عمل وسیع تر اور بلند تر ہے۔ ان کا تعلق محض جماعت کی مادی خوش حالی اور مادی راحتوں کی فراہمی ہی سے نہیں بلکہ ممبروں کی اخلاقی تربیت اُن کا نصب العین ہے۔ مزدور تحریک کے سامنے صرف ایک مقصد ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کو سرمایہ داروں کے مقابلے کے لیے منظم کرنا اور ان کے ناپاک ارادوں کے خلاف جنگ پر تیار کرنا۔ امداد باہمی کی تحریک کی یہ اخلاقی برتری یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ ایک ایسے ملک کے لیے جو نظام سرمایہ داری کا شکار رہ چکا ہو جس کی تعمیری اور تخلیقی قوتیں مضمحل اور سرد پڑ چکی ہوں اس تحریک کی اہمیت اور ضرورت اشد ہے۔ کچھ ماہرین معاشیات کو تو اس تحریک سے اس حد تک عقیدت ہے کہ وہ امداد باہمی کی تنظیم کو نظام اشتراکیت پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اشتراکیت میں انفرادی مساعی کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ انفرادی آزادی پر اجتماعی جبر حاوی ہو جاتا ہے اور ذاتی ملکیت کا خاتمہ انسان کی قوت ارادہ اور جذبۂ عمل کے لیے موت کا پیام لاتی ہے۔ بہ مقابلہ اس کے امداد باہمی میں شرکت خود اختیاری ہوتی ہے۔ اس کے ہر رکن کی شخصیت کو اور اس کی اخلاقی اور ذہنی قوتوں کو پھلنے پھولنے کا پورا پورا موقع ملتا ہے اور انھیں ابھار کر اور چمکا کر ایک ایسے ماحول کی تعمیر میں استعمال کیا جاتا ہے جس میں انسان صحیح معنوں میں خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کر سکتا ہے وہ "سب ایک کے لیے اور ایک سب کے لیے" کو اصول زندگی بنا کر اپنی انفرادی اہمیت کو برقرار رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے اشتراکی نظام میں انسان اپنی انفرادیت ختم کر کے ریاست کے ہاتھ آلۂ کار بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس نظریے سے اتفاق ضروری نہیں لیکن موجودہ

روس میں اس تحریک کے اثرات و نتائج بذات خود اس حقیقت کا اعلان ہیں کہ یہ تنظیم سرمایہ داریت سے اشتراکیت کے درمیان عبوری دور کے لیے ازحد ضروری ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم ریاست کے سر پیدائش دولت اور تقسیم دولت کی سب ذمے داریاں ڈال دیں اور کامیابی کی امید کریں۔ اس ریاست کے افراد میں اخلاقی شعور اور ذہنی قوتوں کی نشو و نما لازمی ہے جو عملی سبق باہمی ہم دردی، باہمی معاونت، باہمی اعتماد و اعتبار کا امداد باہمی کی انجمنیں دیتی ہیں۔ وہ اشتراکیت کے نظام کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ جماعتی زندگی کے تمدن آفریں دین کا جو سبق ان انجمنوں میں سکھایا جاتا ہے۔ وہ اشتراکیت کے قیام کا بنیادی اصول ہے۔ اس تربیت کے بعد ہی انسان کا ذہن اس اصلیت کو قبول کر سکتا ہے کہ انفرادی مسرت کا راز اجتماعی خوش حالی میں ہے اور حقیقی آزادی کا انحصار ذاتی افادیت کو سماجی مقاصد کے تابع کرنے پر ہے۔ ایسی فضا میں ایسے سماج میں جس کا ہر فرد ذہنی طور پر آزاد اور مادی طور پر خوش حال ہو۔ انفرادیت کے ختم ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں بلکہ اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات ہیں۔ ایسے ماحول کو پیدا کرنے اور ایسے افراد کی تخلیق میں امداد باہمی کی انجمنوں کا نمایاں اور امتیازی حصہ ہو سکتا ہے بہ شرطیکہ ان کو صحیح طریقے پر چلایا جائے۔ روس کی مثال یہ ثابت کر رہی ہے کہ یہ تحریک اشتراکیت کی معاون و مددگار ہے نہ کہ رقیب یا مخالف امداد باہمی کی چند نمایاں خصوصیات ہیں جن کے بغیر اس کی روح مردہ اور اس کا اصل جوہر ختم ہو جاتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ اشتراک خود ارادی ہوتا ہے۔ اگر کسی قسم کے جبر کا شائبہ بھی پیدا ہو گیا تو شرکت ناکارہ اور بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہ انجمن جمہوریت اور مساوات کے اصولوں پر کام کرتی ہے۔ نسل و رنگ، مال و دولت اور ذات پات کے امتیازات کو اسی کی عدم موجودگی کی وجہ سے اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ہر ایک کو ایک ہی ووٹ کا حق حاصل ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا حصہ دار کیوں نہ ہو۔ ان انجمنوں کا قیام نفع خوری اور سود خواری کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ موجودہ انجمنیں بھی انھیں مقاصد کے متعلق کسی ایک یا کئی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کام کرتی ہیں۔ تحریک کا موجودہ رجحان دکھا رہا ہے کہ مقصد کی وحدت کی جگہ کثرت لے رہی ہے تاکہ انجمنوں کے درمیان مخالفت اور مقابلے کا جذبہ نہ پیدا ہونے پائے۔ اور ایک مقصد کی تسکین دوسرے مقصد کی تشنگی کا باعث نہ ہو جائے۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کثیر المقاصد انجمنوں کو رائج کیا جا رہا ہے۔

امداد باہمی کی جماعتیں لوگوں کی باہمی ضروریات اور باہمی دقتیں دور کرنے کے لیے قائم کی جاتی ہیں۔ انجمنوں کی اقسام انھیں ضرورتوں کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ جو جماعتیں فراہمی سرمایے کا کام انجام دیتی ہیں انھیں قرضے والی جماعت کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پیدائش اشیا و پیدا شدہ اشیا کی تقسیم کے لیے بھی انجمنیں ہوتی ہیں۔ مثلاً گھریلو دست کاری کی انجمن، گھر بنانے والی انجمن، چک بندی کی انجمن، خرید و فروخت کی انجمن۔ یہ سب ایک ہی اصول پر

کام کرتی ہیں لیکن عملی کاروبار میں کچھ اختلافات ہیں۔ مثلاً دیہی قرضے کی انجمنیں Raiffiesen کے بنائے ہوئے اصولوں پر کام کرتی ہیں اور شہری انجمنیں Schulze of Dehlizch کے بتائے ہوئے راستے پر۔ دیہی قرضے کی انجمن کا میدان عمل مقابلتاً محدود ہوتا ہے۔ اس میں ایک گانو یا زیادہ سے زیادہ دو پڑوسی گانو کے باشندے شریک ہو سکتے ہیں۔ لیکن شہری بنک میں کسی ایک پیشے یا تجارت کے لوگ یا کسی خاص مل یا دفتر میں کام کرنے والے شریک ہوتے ہیں۔ ان کے کاروباری رقبے میں پورا ضلع یا پورا صوبہ بھی شامل ہو سکتا ہے کبھی کبھی یہ محض ایک محلے یا شہر کے ایک حصے تک محدود رہتی ہیں۔ یہ تفاوت اس وجہ سے ہے کہ دیہی قرضے کی انجمنوں میں قرض کی ذمے داری لامحدود ہے اس لیے ممبروں کی ایک دوسرے سے قریبی واقفیت ضروری ہے۔ برعکس اس کے شہری انجمنوں میں یہ ذمے داری محدود ہے۔ دونوں قسم کی انجمنیں مناسب شرح اور مناسب مقدار میں عموماً بارآور مقاصد کے لیے قرضے دیتی ہیں۔ دیہی قرضے کی سوسائٹی میں میعاد قرضہ طویل ہے۔ یعنی اس کی ادائے گی کے لیے ایک سال سے تین سال تک کی مدت ہوتی ہے۔ شہری بنک چھ مہینے سے نو مہینے تک کے لیے قرض دیتے ہیں۔ اور ماہ واری قسطوں میں ممبروں کی آمدنی یا تنخواہ سے کاٹ لیے جاتے ہیں۔ یہ فرق اس بنا پر ہے کیوں کہ دیہی انجمنیں زرعی مقاصد کے لیے قرض دیتی ہیں۔ اور ان مقاصد کی بارآوری کے لیے مقابلتاً عرصہ درکار ہوتا ہے۔ دونوں انجمنیں قرض دو ممبران کی ضمانت پر دیتی ہیں۔ نفع خوری کی روک تھام کے لیے تقسیم منافع کے لیے انتہائی شرح مقرر کر دی جاتی ہے تاکہ سوسائٹی کے اخلاقی معیار پر خودغرضی اور نفع خوری کی لالچ کوئی بدنما دھبہ نہ لگا سکے۔

غیر قرضے والی انجمنوں کا کاروباری حلقہ قرضہ دینے والی سوسائٹیوں کے مقابلے میں وسیع ہوتا ہے۔ یہ محدود ذمے داری کے اصول پر کام کرتی ہیں۔ ان پر بھی وہی بنیادی ذمے داریاں اور فرائض عاید ہیں جو قرضہ دینے والی سوسائٹیوں پر یعنی عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے کوشاں رہنا۔ لیکن کاروبار کی نوعیت کے لحاظ سے کچھ عملی اختلافات ہیں۔ کوآپریٹیو اسٹور اس وقت تک روکڈیل کے رضاکاروں کے مقرر کردہ اصولوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے ممبروں کی تعداد لامحدود ہوتی ہے۔ ہر ممبر اپنی حیثیت اور مرضی کے مطابق جتنے حصے چاہے خرید سکتا ہے۔ ان اسٹوروں میں بکری کا طریقہ یہ ہے کہ مال بازار کے بھاؤ پر بکتا ہے تاکہ عام بازاری کاروبار میں اور اس کے لین دین میں کسی قسم کی ضد نہ پیدا ہونے پائے۔ قیمت نقد لی جاتی ہے۔ مال صرف ممبروں کے ہاتھ بیچا جاتا ہے۔

سوسائٹی کی خوش انتظامی اور اس کی کام یابی اس کے ہر ممبر کی ذمے داری ہے لیکن سہولت کی خاطر انتظام کمیٹیوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ انتظامیہ کمیٹیوں کے ممبروں کی تعداد سوسائٹی کے کاروباری رقبے کی مناسبت سے معین کی جاتی ہے۔ ان ممبروں کا انتخاب جمہوریت کے اصولوں پر عام جلسے میں ہوتا ہے۔ پرائمری سوسائٹی میں یہ انتظامیہ کمیٹی پنچایت کہلاتی ہے۔

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۹ پر)

معاشی صورت حال

- مرکزی بجٹ میں ردوبدل
- جہازرانی پر سرکاری نگرانی
- کاغذ کی پیداوار
- اشتراکی آذربائے جان کی کہانی
- ہندستان کے زرعی مسائل

مرکزی بجٹ میں ردوبدل

مرکزی اسمبلی کے کانگریسی ممبروں کے ذریعے سرمایہ داروں کے منظم احتجاج اور کارروائی کا آخر افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ نئے سال کے بجٹ میں ممبر مالیات کو تبدیلی کرنے ہی بنی شروع میں یہ رکھا گیا تھا کہ ایک لاکھ روپے سے زائد کمائے ہوئے کاروباری منافع پر ۲۵ فی صدی کا ٹیکس لگایا جائے گا اور وہ بھی صرف ایک سال کے لیے۔ لیکن اب اس پر ۲۵ فی صدی کی بجائے ۱۶½ فی صدی ٹیکس لگایا جائے گا۔ حال آں کہ ۲۵ فی صدی کے ٹیکس سے نہ تو آیندہ سال کی صنعت پر کوئی خراب اثر پڑنے کا اندیشہ تھا اور نہ رقم ہی کوئی اتنی زیادہ تھی۔ خاص کر زیادہ منافع ٹیکس کے مقابلے میں تو (جسے گزشتہ سال منسوخ کردیا گیا) یہ ۲۵ فی صدی کا ٹیکس کچھ بھی نہیں تھا

بجٹ کی اولین تجویز میں یہ بھی تھا کہ سرمائے کی منتقلی پر اگر پانچ ہزار سے زیادہ کا منافع ہو تو اس پر ٹیکس عائد کیا جائے۔ اس ٹیکس کی شرح کو بھی کم کرکے عام انکم ٹیکس کی شرح کے مطابق کردیا گیا ہے۔ دوسری تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ یہ ٹیکس نجی ملکیت کو منہا کرنے کے بعد لگایا جائے گا۔ نجی ملکیت کی فروخت سے جو منافع حاصل ہوگا وہ ٹیکس سے بری ہوگا۔

جہازرانی پر سرکاری نگرانی کا قانون

یہ قانون مرکزی اسمبلی نے اپنے پچھلے سیشن کے آخر میں پاس کیا ہے اور اس کا نفاذ ۲۵ مارچ سے ہوا ہے یعنی جس تاریخ کو گزشتہ آرڈی ننس کی مدت

ختم ہو گئی۔ اسی تاریخ سے بشرحوں اور کرایوں کے متعلق حکومت کو مشورہ دینے کے لیے ایک بورڈ بنایا جائے گا۔

اس قانون کی رو سے ہر اس جہاز کے لیے جو برطانوی ہند میں رجسٹر کیا گیا ہو بندرگاہ چھوڑ دینے سے پہلے لائسنس حاصل کرنا ضروری ہو۔ حکومت اس لائسنس کے ذریعے اس خاص تجارت پر پابندیاں اور شرائط عائد کر سکتی ہو جس میں جہاز مصروف ہو۔ یہ جہاز چاہے جہاں بھی رہے وہ شرطیں اس پر عائد رہیں گی۔ جب تک کوئی جہاز لائسنس نہیں دکھلائے گا اس وقت تک اسے کسٹم کا افسر بندرگاہ سے نکلنے کی اجازت نہیں دے گا۔ حکومت کو اختیار دیا گیا ہو کہ جس بندرگاہ کو کسی خاص مقصد سے جہاز جا رہا ہو اس کے نام اپنی ہدایات اور احکام بھیج سکتی ہو جس راستے سے جہاز گزرے گا اس کا بھی حکومت ہی تعین کر سکتی ہو۔ مال اور مسافروں کی نوعیت کے متعلق بھی حکومت ہدایات بھیج سکتی ہو۔ حکومت یہ بھی فیصلہ کر سکتی ہو کہ کس قسم کے مال یا مسافر کو پہلے لادا جائے یا اتارا جائے۔

حکومت ہی جہاز رانی کی شرح مقرر کرے گی۔ ہندستان میں رجسٹر ہونے والے جہاز کو کس شرح پر کرائے پر لیا جائے اس پر بھی سرکاری نگرانی ہوگی۔ برطانوی ہند میں آنے والے مال اور مسافروں کے سلسلے میں بھی حکومت شرح کا تعین کر سکتی ہو چاہے وہ جہاز جس پر وہ مسافت طے کر رہے ہیں کسی بھی ملک میں رجسٹر کیا گیا ہو۔

جہازوں کی کمی کو دور کرنے کے لیے حکومت نئے جہازوں کے حصول میں ہندستانی جہاز راں کمپنیوں کی مدد کرے گی۔

یہ قانون مارچ ۱۹۴۸ء تک نافذ رہے گا اگر حکومت چاہے تو اسے مزید ایک سال کے لیے بڑھا سکتی ہو۔

کاغذ کی پیداوار

مرکزی اسمبلی کے گزشتہ اجلاس میں محکمہ صنعت اور سپلائی کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر م۔ پ۔ پائی نے کاغذ کی پیداوار کے متعلق جس صورت حال کا نقشہ پیش کیا ہو وہ یہ ہو۔

۴۷-۱۹۴۶ء میں اس سے پہلے کے مقابلے میں پیداوار کچھ کم ہوئی ہو۔ اس کی متعدد وجہیں ہیں۔ مثلاً مزدوروں کی ہڑتال، بنگال کے فرقہ وارانہ فسادات اور کوئلے کی کمی۔ ۴۷-۱۹۴۶ء سے قبل سال بھر میں ۸۱ ہزار دو سو ٹن کاغذ پیدا ہوا تھا۔ لیکن ۴۷-۱۹۴۶ء میں یہ مقدار گھٹ کر ۹۷ ہزار چھ سو ٹن ہو گئی۔ نیوز پرنٹ کو چھوڑ کر پہلے نو ماہ میں ۴۲ ہزار ۵۰ ٹن کاغذ کی درآمد کی گئی جب کہ ۱۹۴۵ء میں ۲۷ ہزار ۱۶۰ ٹن کاغذ باہر سے منگوایا گیا تھا۔

مسٹر پائی نے کاغذ کی پیداوار کے بڑھانے اور اس کی لاگت کم کرنے سے متعلق تجویزوں کا بھی ذکر کیا۔ مثلاً ہر ماہ کاغذ کی ملوں کو کتنا کاغذ ملتا ہو۔ اس پر نظرثانی کرنا۔ ضروری خام اشیا کے حصول کے لیے نقل و حمل کی آسانیاں مہیا کرنا،

چیتھڑوں اور دیگر کاغذ بنانے کی چیزوں کی برآمد کو روکنا، خام اشیا اور کیمیائی اشیا کی حصولی میں مدد پہنچانا، وغیرہ وغیرہ
کاغذ کی صنعت کو وسیع کرنے کے لیے نئی مشینیں اور پلانٹ باہر سے منگوائے جا رہے ہیں۔
(ماخوذ از انڈین فنانس)

اشتراکی آزربائے جان کی کہانی

اشتراکی آزربائے جان ہمارے سامنے اس چیز کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے کہ نوآبادیاتی معیشت کو کس طرح قومی معیشت میں بدلا جا سکتا ہے۔

زار کی حکومت میں آزربائے جان، جسے قدرت نے لاانتہا دولت سے مالا مال کیا تھا روس کے صنعتی مال کا بازار بن کر رہ گیا تھا یہاں سے سارا کچا مال روسی صنعتوں کے کام آنے کے لیے آزربائے جان سے باہر چلا جاتا تھا۔ انقلاب سے پہلے باکو کو چھوڑ کر آزربائے جان کا پورا علاقہ پست حال اور زرعی تھا۔ جہاں کاشت کاری کے فرسودہ اور دقیانوسی طریقے رائج تھے۔ یہاں کی تیل کی صنعت پر غیر ملکیوں کا قبضہ تھا اور اس سے صرف مٹھی بھر سرمایہ داروں کو منافع حاصل ہوتا تھا۔ مقامی امرا اور زمیندار اور غیر ملکی سرمایہ دار عوام کا خون چوس رہے تھے۔ ملک کی قدرتی دولت اور عوام کے استحصال سے جو عظیم منافعے ہو رہے تھے وہ سب غیر ملکوں کو جا رہے تھے اور مزدوروں سے نہایت حقیر معاوضے پر سخت مشقت کرائی جاتی تھی۔ نوآبادیاتی معیشت میں لوٹ کھسوٹ کے جو خونخوار طریقے رائج ہوتے ہیں۔ اُن کا نتیجہ یہ تھا کہ عوام بالکل مفلس اور قلاش ہو گئے تھے۔

اشتراکیت کے قیام کے بعد جو نیا سماجی اور سیاسی نظام وجود میں آیا اُس میں آزربائے جان کی پیداواری قوتوں کی ترقی کے لامحدود امکانات پیدا ہو گئے۔ ملک کی قدرتی دولت خود وہیں کے محنت کش طبقے کے کام آنے لگی۔ نئی حکومت نے تیل کی صنعت کو اور ذرائع نقل و حمل، کارخانوں، ملوں اور ملک کے قدرتی ذرائع کو قومی ملکیت بنا دیا۔

بے حد مختصر سے عرصے میں آزربائے جان جو پہلے ایک پست حال زراعت پیشہ صوبہ تھا۔ جدید طرز کا صنعتی ملک بن گیا۔ تیل کی صنعت کے علاوہ مشین سازی کی صنعت چل پڑی، اُون، ریشم اور موزے و بنیائن وغیرہ بننے کی ملیں قائم ہو گئیں۔ اور لباس تیار کرنے، ڈبے میں گوشت اور دیگر چیزیں بھرنے اور کئی اور قسم کے کارخانے کھل گئے۔ جو کاروبار پہلے سے چل رہے تھے ان کی بالکل از سر نو تعمیر کی گئی اور بالکل جدید طرز پر انھیں ڈھالا گیا۔ آج کوئی ۹۵ فی صدی پیداوار انھیں نئے کاروباروں اور ان کارخانوں سے برآمد ہو رہی ہے۔ جن کی از سر نو تعمیر کی گئی تھی۔ انقلاب سے پہلے آزربائے جان کا پورا کچا مال دوسرے ملکوں میں بھیج دیا جاتا تھا یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ نیم خام مال بنا لیا جاتا تھا (جیسے اگر روئی ہے تو مقامی کارخانوں میں صرف سوت بن جاتا تھا لیکن کپڑا انہیں بنتا تھا۔ سوت دوسرے ملک میں کپڑا بننے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا) لیکن اب خود آزربائے جان میں سارا کام ہوتا ہے۔ یعنی کچے مال کو مصنوعات میں بدلنے کا پورا عمل خود

آذر بائیجان ہی میں انجام پاتا ہے۔ صنعتی اشیا بنانے کے لیے یہاں کا کچا مال دوسرے ملکوں میں نہیں بھیجا جاتا۔

کارخانوں اور دفتروں میں کام کرنے والوں کی تعداد انقلاب سے پہلے کی بہ نسبت تین گنی بڑھ گئی۔ سرمایہ دارانہ عہد میں بے روزگاری مزدوروں کے مصیبت کا باعث بنی ہوتی تھی۔ لیکن اب وہاں اس منحوس چیز کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ کام کرنے والوں کا معیار زندگی مسلسل بڑھتا جارہا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے چھڑنے سے پہلے آذر بائیجان میں تیل کی پیداوار ۱۹۱۳ء کی بہ نسبت تین گنی سے بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ صنعتوں کو سوفی صدی برقی قوت مہیا کی جاتی ہے۔ پیدائش اشیا کے کام میں بالکل نئی فنی ایجادوں اور نئے ساز و سامان سے کام لیا جاتا ہے۔ پورے کام کی نگرانی ایک مرکز سے ہوتی ہے۔ تیل کے نئے نئے چشمے دریافت کیے گئے ہیں اور ان کی کھدائی شروع کی گئی ہے۔ تیل صاف کرنے کے چند بڑے بڑے کارخانے قائم ہیں اور انھیں میں تیل صاف کرنے کا پورا کام ہوتا ہے۔ پہلے کی بہ نسبت ان کارخانوں کی پیداوار اور ترتیب زیادہ اچھی ہوگئی ہے۔ اب آذر بائیجان میں صرف ایک باکو ہی صنعتی مرکز نہیں ہے بلکہ بے شمار مقامات پر صنعتی مرکز قائم ہوگئے ہیں۔ ان مرکزوں نے ریاست کا معاشی جغرافیہ بدل دیا ہے۔

برقی قوت عام لوگوں کو مہیا کرنے کے سلسلے میں اہم کارروائیاں کی گئی ہیں۔ گزشتہ عالم گیر جنگ سے پہلے تک باکو کے برقابی مرکزوں کی قوت ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں ۵۸۳ فی صدی زیادہ ہوگئی تھی اور برقابی قوت کی پیداوار بارہ گنی زیادہ۔ ۱۹۲۰ء میں آذر بائیجان میں صرف ۸ برقابی کے مرکز تھے۔ جن کی مجموعی قوت ۴۵ ، کلوواٹ تھی۔ اب وہاں کوئی ۳۰۰ برقابی کے مرکز بن گئے ہیں۔ اب وہاں زیادہ تر گانوؤں اور ہر شہر میں بجلی مہیا کی جاتی ہے۔

زراعتی پیداوار کے لحاظ سے انقلاب کے بعد سوویت آذر بائیجان نے عظیم الشان ترقیاں کی ہیں۔ انقلاب سے پہلے زرخیز زمین کے بڑے بڑے علاقے زار کے خزانے کی ملکیت میں تھے۔ بہترین زمینیں اور آب پاشی کی تمام نہریں بڑے بڑے زمین داروں کے قبضے میں تھیں۔ تمام زرعی کام ہاتھ سے کام انجام دیے جاتے تھے۔ صرف ۹ فی صدی کسانوں کے پاس لوہے کے ہل تھے، ۲۷ فی صدی کے پاس قدیم دقیانوسی طرز کے لکڑی کے آلات اور ۶۴ فی صدی کے پاس آلات بالکل نہیں تھے۔ کسانوں کو آب پاشی کے لیے پانی نہیں ملتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ مقامی زمین داروں اور ذخیرۂ آب کے مالکوں کے مکمل طور سے دست نگر تھے۔ جو کچھ تھوڑا بہت پیدا ہوتا تھا اس کا

۵، فی صدی حصہ ٹیکس، مال گزاری اور پانی کی قیمت کے طور پر کسانوں کی ملکیت سے چھن جاتا تھا۔

سویت حکومت کے قیام کے بعد سب سے پہلے یہ کام کیا گیا کہ زرعی اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ ۵ مئی سنہ۱۹۲۰ء کو ایک قانونی اعلان کے ذریعے تمام زمین آبی ذرائع اور آب پاشی کے انتظامات کو عوامی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ سنہ۱۹۲۰ء سے کسان خود اپنی زمینوں میں کاشت کرتے ہیں۔ زرعی اصلاحات کے نتیجے کے طور پر آزر بائے جان کے کسانوں کو ۵۰ لاکھ ہیکٹر زمین ریاست سے دست یاب ہوئی (ایک ہیکٹر = ۲٫۴۰ ایکڑ کے) اس کے علاوہ ضرورت مند کسانوں کو حکومت کی طرف سے زرعی آلات، تعمیراتی سامان اور قرضے بھی مہیا کیے گئے۔

سویت یونین کی اشتراکی صنعت نے آزر بائے جان کے لیے زراعتی مشینیں مہیا کیں۔ ہزاروں ٹریکٹروں اور سیکڑوں فصل کاٹنے والی کلوں کی مدد سے آزر بائے جان کے کسانوں نے خاص خاص زراعتی کاموں کو بالکل سو فی صدی مشینی بنا دیا ہے۔ جب کسانوں نے خود اپنے تجربے سے دیکھ لیا کہ بڑے پیمانے کی مشینی کھیتی میں بڑا فائدہ ہے تو انھوں نے اپنے وسائل و ذرائع یک جا کر کے بڑے بڑے پنچایتی یا اجتماعی کھیت بنائے اس سے زراعت کے مشینی ہونے کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔

آزر بائے جان میں وسیع و عریض آب پاشی کے انتظامات ہو جانے کی وجہ سے بڑے بڑے چٹیل صحرائی میدانوں میں بھی پانی لایا جاتا ہے۔ غلے کے علاوہ آزر بائے جان کی ایک خاص پیداوار روئی ہے۔ انقلاب سے پہلے کے مقابلے میں روئی کی کاشت کا رقبہ دوگنا ہو گیا ہے۔ زراعت کے سلسلے میں وہاں باغبانی، ریشم کے کیڑوں کی پرورش اور انگور کی کاشت کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ آزر بائے جان کے جنوبی اضلاع میں گرم ممالک کے پودوں کی کاشت سویت حکومت کے ہی زمانے میں شروع کی گئی۔

زار کے عہد میں آزر بائے جان میں صرف ۱۱ ماہرین زراعت کو مقرر کیا گیا تھا لیکن ان میں سے ایک بھی آزر بائے جان کا نہیں تھا۔ لیکن سویت آزر بائے جان نے اب خود اپنے اہل علم اور اہل دماغ پیدا کر لیے ہیں۔ زراعت اور سدھار کے کام کے ہزاروں ماہرین اب آزر بائے جان کے کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان ماہرین نے خود آزر بائے جان کے زراعتی انسٹی ٹیوٹ سے گریجویٹ کیا ہے جو انقلاب کے بعد وہاں قائم کیا گیا تھا۔ آزر بائے جان کے زراعتی انسٹی ٹیوٹ سے کوئی ۳ ہزار ماہرین نے کالج تک کی تعلیم پائی ہے۔ یہاں دو سائنسی ادارے بھی ہیں اور ۱۴ علاقائی تجربہ گاہیں جہاں زراعت سے متعلق سائنسی تحقیقات کا کام انجام دیا جا رہا ہے۔

فتح کے بعد اب آزر بائے جان کے لوگ نئے پنج سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں پورے جوش و خروش

کے ساتھ مصروف ہیں - ۵۰ فی صدی سرمایہ صنعت اور نقل وحمل میں لگایا جائے گا - تیل کی پیداوار ۴۰ فی صدی بڑھ جائے گی نئی نئی بھاری صنعتیں قائم کی جارہی ہیں - لوہے اور اسٹیل کی صنعت بھی اب کھل رہی ہو - دریائے کورا پر ایک بڑا برقابی مرکز بن رہا ہی اس سے ملحقہ آب پاشی کی بھی سسٹم بن رہی ہو جس سے مزید دس لاکھ ایکڑ زمین کی آب پاشی کی جاسکے گی ۔

ہندستان کے زرعی مسائل

اس جنگ نے ہندستان کے معاشی نظام کی خرابیاں واضح کردی ہیں اس وقت ملک کی غذائی صورت کچھ اچھی نہیں "زیادہ غلّہ پیدا کرو" والی اسکیم کے نتائج کچھ زیادہ امید افزا نہیں نکلے - غلّے کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں ۔ صحت بخش غذائیں کافی تعداد میں مہیا نہیں ہیں آبادی کا کوئی تیس فی صدی حصہ کم خوراکی یا بد خوراکی کا شکار رہی -

کوئی پچھتّر سال سے مسلسل ہندستانی عوام کی حالت گرتی ہی چلی جارہی ہی ۱۸۸۰ء میں ہندستان میں ہرسال ۵۰ (پچاس) لاکھ ٹن فالتو غلّہ پیدا ہوتا تھا اور اب ہرسال ایک کروڑ ٹن کی کمی پڑجاتی ہو - ۱۸۸۰ء میں ایک اندازے کے مطابق ہر فرد ۱½ پونڈ غلّہ کھاتا تھا اور اب ہر فرد صرف ایک پونڈ کھاتا ہو - آبادی اور زمین کا تناسب بڑھتا جارہا ہو یعنی اتنی ہی زمین سے زیادہ لوگ اپنی روزی حاصل کرنے لگے ہیں - اس رجحان کو صنعت کے ذریعے دور کیا جاسکتا تھا - مگر صنعت کا یہ حال ہو کہ ساری دنیا میں تو صنعت ترقی کرتی رہی ہو لیکن ہندستان میں اس کا رجحان گھٹنے کی طرف رہا ہو - ۱۸۸۰ء میں صنعت وحرفت میں ۱۳ اور ۱۲ فی صدی لوگ لگے ہوئے تھے اور اب ۹ فی صد - ۱۸۷۲ء میں ۵۶ فی صدی آبادی زراعت پر زندگی بسر کرتی تھی -

حکومت نے پیداوار کی مقدار اور عمدگی بڑھانے کی جو تھوڑی بہت کوشش کی ہو - اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا سال بہ سال غلّے کی پیداوار گھٹتی جارہی ہو - ہندستان کا نظام اراضی اور لگان داری بہت ناقص ہو اور اس کی پیچیدگیاں بڑھتی جارہی ہیں - آدمی اور ذرائع کی قلت نہ ہونے کے باوجود غلّے کی پیداوار اور تقسیم کا انتظام ناقص اور ناکارہ ہو ہندستانی غذائی کمیشن کی رپوٹ میں یہ صحیح کہا گیا ہو کہ یہ حکومت کا کام ہو کہ قحط سالی دُور کرنے کی کوشش کرے اور یہ بھی دیکھے کہ ہر مرد وعورت اور بچّے کو کافی غذا ملتی ہو یا نہیں ۔

گزشتہ پچیس سال کا تجربہ بتاتا ہو کہ دیہی عوام کی آمدنی بڑھانے کی کوشش کرنا اور اس کو گھٹنے سے روکنا بہت ضروری ہو - اس لیے کہ اُن کی کمی آمدنی کا پورے معاشی نظام پر خراب اثر پڑتا ہو - زرعی اشیا کی پیداوار جب گھٹنے لگتی ہو تو کسانوں کی مالی حالت درست کرنے کے تمام دیگر طریقے بالکل ناکام رہتے ہیں کسانوں کو

کاشت کاری میں ٹیکنیکل اور مالی مدد دی جائے تاکہ وہ غلے کی مناسب تقسیم عمل میں لائیں اور ان کا استعمال صحیح اور صحت مند طریقوں پر کریں۔ اس طرح سے بھی ان میں زیادہ غلہ پیدا کرنے کی امنگ پیدا ہوگی۔

غلے کی سپلائی کے سلسلے میں ملک کو خود کفیل بنانا ضروری ہے۔ اس کے لیے نئی زمینیں زیر کاشت لائی جائیں۔ آب پاشی کا انتظام کیا جائے اور بہت سی زمینوں میں غیر غذائی اشیا کی کاشت ترک کرکے غذائی اشیا پیدا کی جائے۔ پھر فی ایکڑ زمین کی پیداوار بڑھائی جائے۔

ان تمام باتوں کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ حکومت کا نظریہ اور خیال بنیادی طور پر بدل دیا جائے اور حکومت اور عوام کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون اور اشتراک عمل پیدا کیا جائے۔

ہندستان کی دیہی معیشت کو بہتر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پرانے نظام آراضی پر بنیادی حملہ کیا جائے اور زمین کسانوں کی ملکیت بنادی جائے۔

زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی جارہی ہے جس سے اعلا پیمانے کی کاشت اور اچھی کاشت جس سے زیادہ غلہ پیدا ہوسکے نہیں ہوسکتی۔ دوسرا رجحان یہ ہے کہ زمین ایسے مالکوں کے قبضے میں چلی جارہی ہے جو خود کاشت نہیں کرتے۔

انگریزی حکومت کی یہ پالیسی رہی ہے کہ ملک اگر تھوڑا بہت صنعتی ہے بھی تو اسے غیر صنعتی کرکے پورے طور پر زرعی بنادیا جائے۔ اس پالیسی کے سبب حکومت دیہی اصلاحات عمل میں نہیں لاسکی۔ اس لیے اگر یہ اصلاحات عمل میں آئیں تو حکومت کے لیے یہ سوال پیدا ہوجاتا کہ دیہی علاقوں کی آبادی کا کچھ حصہ جو بے کار ہوجائے گا اُسے کام کہاں سے دیا جائے۔

حکومت کی اس پالیسی سے دو نقصانات ہوئے ہیں: گاؤں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی جس سے زیادہ صلاحیت والے لوگ گاؤں چھوڑ کر شہروں میں چلے گئے اور اس طرح زراعت اور گھریلو صنعت اچھے لوگوں کی رہ نمائی سے محروم ہوگئی۔

زمین داروں کے وجود نے اصلاح و ترقی کے راستے کو اور بھی مسدود کررکھا ہے۔

جب نظام آراضی میں اصلاح کی جائے گی تو کچھ لوگ ضرور بے کار ہوجائیں گے۔ لیکن جب پیداوار میں ترقی ہوگی تو بے کاری دور ہوجائے گی۔ دیہاتوں میں جب خوش حالی پھیلے گی تو وہاں چھوٹی چھوٹی صنعتیں بھی ترقی کرسکتی ہیں۔

لگان داری کے موجودہ طریقوں کو بھی بہت جلد بدلنے کی ضرورت ہے۔

ٹیکنیکل اصلاحات سے پہلے ملک کے لگان داری کے نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ زمین کو مزید ٹکڑوں میں تقسیم ہونے سے روکا جائے۔ ہر علاقے کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے زمینوں کی پھر مناسب ٹکڑوں میں تشکیل کی جائے

زمینوں کو زمین داروں کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے اور جو زمین زمین داروں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہو وہ دوبارہ کاشت کاروں کو واپس کردی جائے۔ حکومت اور کاشت کاروں کے درمیان جو مفت خورے ہیں انھیں طبقاتی حیثیت سے ختم کر دیا جائے۔

اس بات کی بھی ضرورت ہو کہ کسانوں کو نئے رجحانات نئے دریافتیں اور نئے طریقوں کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا جائے تاکہ اچھے نتائج پیدا ہوں۔

سلسلۂ مطبوعات ادارہ معاشیات انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

انجمن ترقی اردو نے ملکی وغیر ملکی مسائل پر آسان اور سہل زبان میں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہو۔ ہر پمفلٹ میں ایک ہی موضوع پر ماہرین کے مرتب کیے ہوے مختلف مقالے ہوں گے جو اُس موضوع کے ہر پہلو سے بحث کریں گے۔ مندرجہ ذیل پمفلٹ زیر اشاعت ہیں:-

۱۔ معاشی بحران
۲۔ ہندستانی زراعت
۳۔ امداد باہمی
۴۔ منصوبہ بندی
۵۔ زر اور اس کے مسائل

اور مرکزی سوسائٹی میں بورڈ آف ڈائرکٹرس یا بورڈ آف مینجمنٹ۔ چوں کہ یہ تحریک عوام کی تحریک ہے اس لیے پبلک کے سرمایے سے چلتی ہے اس وجہ سے خارجی یا سرکاری مداخلت کو کم سے کم اہمیت دیے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اگر ہم اپنے ذہن کو ان تعصبات سے نہ آلودہ کریں جو انسانی ترقی کے متعلق مختلف نظریات کے قائل ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں تو بلا شبہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کی معاشی و تمدنی ترقی کے لیے قوموں کی فلاح و بہبودی کے لیے تحریک امداد باہمی کی ایک جامع اسکیم از حد ضروری ہے کیوں کہ قوموں کی خوش حالی اور ترقی کا انحصار محض مادی راحتوں کی مجموعی مقدار میں کمی یا زیادتی پر نہیں بلکہ اخلاقی معیار اور قدروں کی پاسداری اور صحیح تربیت پر ہے۔ اس تحریک کے عقائد و اصول واضح کرتے ہیں کہ یہ مادی ترقی و اخلاقی بلندی کے لیے بہ یک وقت کوشاں ہے اور دونوں مقاصد کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم سمجھتی ہے اور اس میں اس تحریک کی مقبولیت کا راز پوشیدہ ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ـــــــــــــــ ال ۵۱۳۸
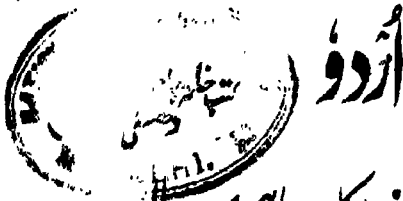
اُردُو

انجمن ترقی اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جس میں اُردُو ادب اور زبان کے متعلق محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں اور اُردُو مطبوعات پر بے لاگ تبصرہ کیا جاتا ہی۔ اس رسالے نے اُردُو ادب اور تنقید کے معیار کو بلند کرنے میں نمایاں کام کیا ہی ـــــــــ سالانہ چندہ علاوہ محصول ڈاک سات رُپے (معہ)

ملنے کا پتا:- **مینیجر رسالہ اُردُو لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی دروازہ۔ دہلی**

معاشیات

میں اشتہار دیجیے اور اپنے کاروبار کو فائدہ پہنچایے۔

معاشیات کل ہند انجمن ترقی اُردُو جیسے وسیع اور عظیم الشان ادارے کا رسالہ ہونے کی حیثیت سے ملک کے گوشے گوشے میں دلچسپی اور توجہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہی۔

چندہ سالانہ ـــــــــ پانچ رُپے

مینیجر رسالہ معاشیات لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی دروازہ - دہلی

عبداللطیف نے لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی دروازہ۔ دہلی میں چھپواکر شائع کیا۔